ماہنامہ

کرن

جون 2018

عید مبارک



PakiBooks.Site

کرن کا دسترخوان

www.PakiBooks.Site

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

بانی ــــــــ محمود بابر فیصل
نگران ــــــــ محمود ریاض
مدیرہ ــــــــ نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ــــــــ عامر محمود
نائب مدیرہ ــــــــ شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ــــــــ امت الصبور
اشتہارات ــــــــ خالدہ جیلانی
قانونی مشیر ــــــــ نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

عید مبارک

PakiBooks.Site

انٹرویو

مکمل ناول

ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



مستقل سلسلے

جون 2018
جلد 41 شمارہ 3
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



مدیرہ

اداریہ

عید کے لغوی معنی خوشی، مسرت و شادمانی اور انعام واکرام کے ہیں۔ اس انعام کے حق دار وہی لوگ ہیں جنہوں نے روزے اور اس کے اغراض و مقاصد کو پورا کیا۔ تمام مسلمان خواہ وہ کسی بھی خطۂ ارض میں ہوں — یہ دن اجتماعی خوشی، عقیدت اور پوری تعظیم سے مناتے ہیں۔ عید ایک طرف قلبی مسرت اور روحانی انبساط پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف تعلقات اور محبت کو بھی گہرا کرتی ہے۔

اجتماعی خوشی کے اس تہوار کے موقع پر ان لوگوں کو بھی یاد رکھیں جو یہ تہوار منانے کی استطاعت سے محروم ہیں۔ انہیں اپنی خوشیوں میں شامل کریں۔ آپ کی خوشیوں کے رنگ نکھر آئیں گے۔

ادارہ کرن کی جانب سے آپ سب کو عید مبارک۔ عید کا دن آپ کے لیے خوشیاں لے کر آئے اور آپ کا ہر دن روزِ عید ہو۔

اس شمارے میں،

- "ہمارے زمانے کی عید" عیدالفطر کے موقع پر مشہور شخصیات سے شاہین رشید کا سروے،
- فنکارہ "آمنہ بنتِ طاہر" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار "سید علی حسن" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"
- اس ماہ کنول شاہین قیصر" کے مقابل ہے آئینہ،
- "شب غم کی سحر" رُخ چوہدری کا نیا سلسلے وار ناول،
- "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول،
- "اسم یاراں" مصباح علی سید کا مکمل ناول،
- "میں ہاری پیا" نفیسہ سعید کا مکمل ناول،
- "غم ہے یا خوشی ہے تو" تنزیلہ ریاض کا ناولٹ،
- "تم سنگ نیناں لاگے" قرۃ العین سکندر کا ناولٹ،
- "میرے محرما" ریحانہ آفتاب کا ناولٹ،
- "ہم بھی وہی، تم بھی وہی" سدرہ حیات کا ناولٹ،
- سدرۃ المنتہیٰ، رابعہ افتخار، نادیہ احمد اور بشریٰ سیال کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

- "کرن کا دسترخوان" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت حاصل کریں۔





حمد باری تعالیٰ

رنگ، خوشبو، صبا اور ہوا روشنی
میرے اللہ کی ہے ہر عطا روشنی

جس نے مجھ کو بلندی کے رستے دیے
وہی میرے لیے رہنما روشنی

میری مٹی کو جس نے کندن کیا
وہ میرا مہربان، وہ سدا روشنی

ہر مشکل کو آساں اس نے کیا
یا حکیم کا ورد تھا کہ تھا روشنی

تیرگی میں بھی اس نے اجالا کیا
وہ میرے لیے بن گیا روشنی

شکر کرنے کی توفیق عطا ہو مجھے
مجھ کو شب میں بھی مالک دکھا روشنی

یہ تیرا فضل ہے کہ میں ہوں نامور
اپنی رحمت سے گل کی بڑھا روشنی

سباس گل



نعت رسول مقبول ﷺ

بندہ کہاں اور کہاں نعت رسول کریم
جس کے محامد عظیم، جس کے محاسن عمیم

نقطۂ اقرا ہے وہ، مرکزِ اسرا ہے وہ
سرِ الف لام را، رمزِ الف لام میم

میرے نبی کا خدا خالقِ کون و مکاں
میرے خدا کا نبی حاملِ خلقِ عظیم

حق ہے سمیع و بصیر، عبد بشیر و نذیر
وہ رؤف و رحیم، یہ بھی رؤف و رحیم

تھے وہ مبارک قدم جن کے اثر کے طفیل
وادیٔ بطحا ہوئی رشکِ خلدِ نعیم

میرا عمل بے ثمر، تیرا عمل بے ثمر
عشقِ محمد اگر ہو نہ دلوں میں مقیم

کیا ہے علیم حزیں وہم و گماں کا مقام
اس کی شفاعت ہو جب کیوں ہو عذابِ جحیم

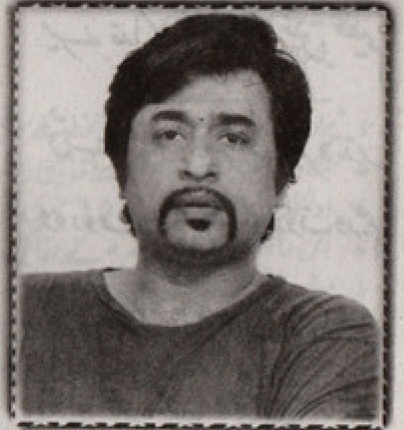
علیم ناصری

ہر آنے والی عید گزرنے والی عید کی یادوں کو تازہ کر دیتی ہے اور جب بات ایک برس کی نہیں بلکہ برسوں کی ہو تو بیتے ہوئے تمام ماہ و سال ویڈیو کی طرح آنکھوں میں سما جاتے ہیں اور وہ وقت یاد آ جاتا ہے جب ہم بچے تھے اور عید مناتے تھے، عید کی تیاریوں میں راتوں کو جاگنا۔ پسند کی چیزیں لینے کے لیے ایکسائیٹڈ ہونا۔ دبے دبے لفظوں میں اپنے والدین سے فرمائش کرنا...... اور بہت کچھ...... بڑا اچھا لگتا ہے وہ دور شاید اس لیے کہ وہ دور اب گزر چکا ہے اور ہر گزرنے والا وقت خواہ وہ کیسا ہی ہو اچھا لگنے لگتا ہے...... زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ ہمارے دور کی عید اور آج کے دور کی عید میں بہت فرق آ گیا ہے عید وہی ہوتی ہے مگر منانے کے انداز میں فرق آ جاتا ہے...... اور یہی ہمارے سروے کا سوال بھی ہے کہ

جب آپ اپنے بچپن کی عید کا موازنہ اپنے بچوں کی عید کے ساتھ کرتے ہیں تو کیا نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں؟

ہمارے زمانے کی عید

شاہین رشید



یاسر نواز:- (ڈائریکٹر، پروڈیوسر، اداکار)

جب ہم چھوٹے تھے اور کلاس 9th، 10th میں آ چکے تھے، تو ہمارے ابو نے ہمیں ایک بجٹ دیا ہوا ہوتا تھا کہ اس بجٹ میں آپ نے اپنی ضرورتیں پوری کرنی ہیں۔ 2500 میرے، 2500 فراز بھائی کے اور اتنے ہی دانش کو ملتے تھے اور کہتے تھے کہ خود شاپنگ کرو...... اس زمانے میں ہم نئے نئے جوان ہو رہے تھے اور گھر بھی ہمارا طارق روڈ کے اطراف میں ہوتا تھا...... وہ 2500 ہمارے لیے دو ڈھائی لاکھ سے کم نہیں ہوتے تھے تو ہم دوستوں کے ساتھ جاتے تھے عید کی شاپنگ کرنے اور انہیں بتاتے تھے کہ ہمارا بجٹ اتنا ہے۔ روز طارق روڈ کے چکر لگ رہے ہوتے تھے اور خوب شاپنگ کر رہے ہوتے تھے، ساری شاپنگ کے بعد اگر دو چار سو کم پڑ رہے ہوتے تھے تو بڑا معصوم سا منہ بنا کر کہتے تھے کہ پیسے کم ہو گئے ہیں، تو ابو کو رحم آ جاتا تھا اور وہ تھوڑی ڈانٹ کے بعد مزید پیسے دے دیا کرتے تھے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ ملک کے حالات اچھے تھے، ماحول اچھا تھا...... مگر اب ایسا نہیں ہے، میرا بیٹا ''فرید'' ماشاءاللہ 9th کلاس کا طالب علم ہے اور اب حالات بھی کوئی بہت اچھے نہیں ہیں، پھر ہم ڈرپوک بھی اتنے ہو گئے ہیں کہ بچوں کو اکیلا چھوڑ نہیں سکتے۔ تو آج تک میرے بچے اکیلے نہیں جاتے یا تو ہم ساتھ ہوتے ہیں یا پھر ڈرائیور ساتھ ہوتا ہے۔ تو بچوں کو ابھی ہم نے ایسی کوئی پریکٹس نہیں کرائی کہ یہ ہے تمہارا بجٹ اور جاؤ خود شاپنگ کرو...... تو وہ ہماری طرح انجوائے نہیں کر سکتے پھر میرے بچے تو ہیں بھی بہت شریف جو خرید دو خوش خوشی لے لیتے ہیں اور ندا جب بچوں کو شاپنگ کرانے لے جاتے ہیں تو جذبات میں آ کر اپنا بجٹ بھی کراس کر جاتے ہیں...... بچے جس چیز پہ ہاتھ رکھتے ہیں ہم دلا دیتے ہیں جبکہ ہمارا دور ایسا نہیں تھا تو کچھ بچے خرچ کروا دیتے ہیں، کچھ ہم جذبات میں آ کر خرچ کر دیتے ہیں کہ بچوں کے لیے کماتے ہیں اگر خرچ کر دیا تو کیا ہوا...... لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے...... تو ان شاءاللہ اگلے سال سے بچوں کو ایک بجٹ دوں گا کہ اس کے اندر رہ کر آپ کو عید کی شاپنگ کرنی ہے...... تو اپنے بجٹ میں رہ کر شاپنگ کرنے کا اپنا مزا ہے بلکہ زیادہ مزا ہے اماں ابا کے ساتھ شاپنگ کرنے کا مزا تو ہے مگر زیادہ نہیں۔





امبر ارشد:- (آرٹسٹ)

ہمارا وقت زیادہ اچھا تھا...... زیادہ کی کوئی خواہش نہیں ہوتی تھی، امی نے جو کپڑے لے کر دے دیے وہی پہن لیے، ہم میں واقعی کوئی نخرا نہیں ہوتا تھا اور اس وقت اور کوئی خواہش بھی نہیں ہوتی تھی اور کوئی چوائس بھی نہیں ہوتی تھی کہ کچھ اور بھی مل سکتا ہے...... اور اب ہمارے بچوں کو کوئی پروا کوئی خیال نہیں ہوتا بس جس چیز پہ ہاتھ رکھ دیا وہ مل جانی چاہیے ورنہ پورا ٹائم روتے اور غصے میں ہی گزرتا ہے بیچ میں...... آج کل کے بچوں کو کوئی قدر نہیں ہے کہ پیسہ کیسے آتا ہے۔ بس مہنگائی ہو یا کچھ اور کپڑے اور کھلونے تو لینے ہی ہیں...... ہم تو بڑے بھی ہو گئے تھے تب بھی عیدی شاپنگ ہمارے لیے ہماری امی ہی کرتی تھیں اب میرا بیٹا بالکل بھی قابو میں نہیں آتا اور اپنی پسند کی شاپنگ کرتا ہے اور سب کچھ اپنی پسند سے خریدتا ہے۔ 5 سال کا ہے مگر ہر چیز کا سینس ہے اسے۔



عاصم محمود:- (آرٹسٹ)

میرے خیال کے مطابق ہماری عید اور اب کے بچوں کی عید میں بہت زیادہ نمایاں فرق نہیں آیا ہے...... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب لوگ کہتے ہیں کہ عید تو بچوں کی ہوتی ہے اور جب ہم بچے تھے اور جو آج کے بچے ہیں وہ سب کچھ وہی کرتے ہیں جو ہم کرتے تھے کہ اچھے سے تیار ہوتے ہیں۔ عیدی لیتے ہیں، اس کو خرچ کرتے ہیں، کھلونے لیتے ہیں...... تفریحی مقامات پہ چلے جاتے ہیں ہاں یہ فرق نمایاں ہے کہ ہمیں 10 روپے عیدی ملتی تھی تو ہمیں لگتا تھا کہ جیسے بہت پیسے مل گئے ہیں...... اور اب 1000 روپے بھی دو تو بچوں کو کم لگ رہے ہوتے ہیں...... پھر ہمارے وقت میں لاء اینڈ آرڈر بہت اچھا تھا تو ہم آرام سے گلیوں میں، میدانوں میں اور پارک میں نکل جاتے تھے دوستوں کے ساتھ...... مگر اب ایسا نہیں ہے اور پھر گزشتہ دنوں بچیوں کے ساتھ جو واقعات ہوئے ہیں ان کی وجہ سے والدین بہت ڈر گئے ہیں اور اپنے بچوں کو اکیلے یا دوستوں کے ساتھ جانے کی

www.PakiBooks.Site

اجازت نہیں دیتے......تو اور آل بہت زیادہ فرق نہیں آیا......سوائے اس کے کہ عیدی کے روپے بڑھ گئے ہیں اور بچوں کی ایکٹیویٹیز گھر تک محدود ہو کے رہ گئی ہیں۔



تحریم زبیری:- (آرٹسٹ)

ہمارے زمانے میں ہمارے ہی گھر والے بچوں کو ذرا کم لفٹ کرایا کرتے تھے۔ جبکہ اب بچوں ہر چیز چاہیے ہوتی ہے اور ہر وقت چاہیے ہوتی ہے اور وہ عید کا انتظار نہیں کرتے......تو وہ جو بچپن میں ایکسائٹمنٹ ہوتی تھی وہ تو اب ختم ہو گئی ہے۔ پہلے تو شعبان رمضان میں ہی عید کی ایکسائٹمنٹ شروع ہو جاتی اور تیاریاں بھی شروع ہو جاتی تھیں......اب تو ہر چیز ریڈی میڈ ہے...... اب تو آپ نے دو دن پہلے جانا ہے اور ساری خریداری کر لینی ہے۔ بچے اور والدین اسی معاملے میں بہت ایزی ہو گئے ہیں اور ان چیزوں نے ایکسائٹمنٹ کو ختم کر دیا ہے۔ میں اپنے بچپن کی عید کو بہت مس کرتی ہوں......اب لوگ بھی بہت مصروف ہو گئے ہیں اور اتنے زیادہ آپس میں ملتے بھی نہیں ہیں......اس لیے بچپن کی عید یاد بھی بہت آتی ہے اور اچھی بھی لگتی ہے۔

عتیقہ امیر علی:- رائٹر (شاعرہ)

ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ ہم نے 80's اور 90's کا دور دیکھا اس دور میں ویلیوز کافی حد تک زندہ تھیں وہ بڑا خوب صورت دور تھا، ہمارے والدین نے عید کے حوالے سے بھی ہمیں ہماری ویلیوز بتائیں، کہ روزہ کیا، رمضان کیا ہے اور عید کیا ہے، اور کہتے تھے کہ عید اسی کی ہوتی ہے جو پورے روزے رکھتا ہے......اور ہم نہ صرف روزے رکھتے تھے بلکہ عید کی صورت میں ملنے والے انعام کی تیاری بھی خوب جوش و خروش کے ساتھ کرتے تھے اور ہمارے والدین بھرپور ساتھ دیا کرتے تھے۔ امی ہماری بہت اچھی ڈیزائنر تھیں اور وہ عید کے لیے خاص طور پر ہمارے کپڑے ڈیزائن کرتی تھیں اور آج میں نے بھی اپنے بچوں کو اسی ویلیوز کے ساتھ بڑا کیا ہے اور جو کچھ والدین سکھایا وہ اپنے بچوں میں منتقل کیا ہے میں نے۔ اور الحمدللہ میرے بچے رمضان المبارک میں پورے روزے رکھتے ہیں اور بچپن سے رکھتے آ رہے ہیں......افطاری اور سحری کا میں خود اہتمام کرتی ہوں اور ہمارے گھر میں کوئی چیز باہر سے نہیں آتی اور ایسا ہمارے بچپن میں ہی ہوتا تھا......اور عید کے دن ہم سب بہت انجوائے کرتے ہیں اور ہمارے گھر میں بالکل ویسا ہی ماحول ہوتا ہے جیسا 80's اور 90's میں ہوتا تھا۔ بچوں کو ماڈرن بھی ہونا چاہیے نئے دور کے حساب سے مگر پرانی ویلیوز کا "تڑکا" ضرور لگاتے رہنا چاہیے اور چونکہ میں نے اچھا خاصا "تڑکا" لگایا ہوا ہے تو مجھے اپنے زمانے کی عید اور اپنے بچوں کے زمانے کی عید میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔



PakiBooks.Site



جنید خان:- (آرٹسٹ)

جب ہم بچے تھے تو ہمارے خاندان کے زیادہ لوگ لاہور میں رہا کرتے تھے اور ہمارے خاندان کے سارے کزنز وغیرہ ایک ہی گھر میں یعنی دادا کے گھر جا کر اکٹھے ہوتے تھے اور سب مل کر عید مناتے تھے ایک فیسٹول والا ماحول ہوتا تھا اور بہت مزا آتا تھا دادا کے گھر میں "تایا" چاچا پھوپھیاں اور ان کے بچے سب آ جاتے تھے اور ہم سب مل کر عید سیلبریٹ کیا کرتے تھے، اب جبکہ ہم بڑے ہو چکے ہیں سب کزنز شادی کے بعد یا جاب اور تعلیم کے سلسلے میں ادھر ادھر ہو گئے ہیں تو اب عید ان سب کے بغیر ہی گزرتی ہے......اب میں کراچی میں ہوتا ہوں والدین لاہور میں تو میں عید کے موقع پر ان کے پاس چلا جاتا ہوں تو سب بہن بھائی ایک ہی گھر میں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو یہ وقت بھی اچھا لگتا ہے فرق یہ پڑا کہ اب پہلے جیسی گیدرنگ نہیں رہی۔ پھر ایک فرق یہ بھی پڑا ہے کہ پہلے جب ہم بچے تھے تو ہمارا سارا فوکس "عیدی" پہ ہوتا تھا اور ہم بچے جہاں بھی جاتے تھے ہمیں عیدی ملتی تھی۔ اب پہلے والا رواج بھی کم ہو گیا ہے عیدی دینے کا......ہم تو بہت ایکسائیٹڈ ہوتے تھے اب کے بچوں کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میرا اپنا بیٹا صرف چار سال کا ہے اور اسے ابھی عید کی ایکسائٹمنٹ کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔

مدیحہ شاہد:- (رائٹر+ڈرامہ نگار)

ہمارے بچپن کی عید سادہ اور ڈسپلینڈ ہوتی تھی۔ عید سے کچھ ہی دن پہلے "نانی" کے گھر سے سب بچوں کے کپڑے سل کر آ جایا کرتے تھے......اس زمانے میں چاند رات کو گھر سے باہر جانے کا رواج نہیں تھا۔ لہٰذا امی بازار جا کر خود ہی چیزیں لے آیا کرتی تھیں......چاند رات کو ٹی وی پر چاند رات کے حوالے سے لگنے والے ڈرامے دیکھ کر ہی خوش ہو جایا کرتے تھے، امی رات کو ہی کپڑے استری کروا کے رکھ دیتیں۔ کچن میں کام کرنے والا ملازم بھی رات کو ہی شیر خورمہ، اور فروٹ چاٹ بنا کر فریج میں رکھ دیتا تھا......مہندی گھر میں کسی کو لگانی نہیں آتی تھی، اس لیے مہندی کے نام پر کسی کے ہاتھ میں "ستارہ" بنا دیا جاتا تھا تو کسی کے ہاتھ پہ پھول......عید کے دن ہم صبح ہی اٹھ کر تیار ہو جاتے، امی کچن میں مصروف ہو جاتیں......کالونی کے لوگ ملنے آ جاتے، کبھی ہم کسی کے گھر چلے جاتے۔ دس دس روپے کے نوٹ عیدی بھی ملتے، ابو کے پاس ایک فلیش لائٹ والا کیمرہ بھی تھا، جس سے تصاویر بنائی جاتی تھیں۔ عید کے دن دادا، دادی، نانی، نانا اور چچا وغیرہ ضرور فون کرتے اور ہم سب باری باری ان سے بات کرتے......اب بچوں کی عید کافی مختلف ہے۔ اب بچے اپنی شاپنگ اپنی مرضی سے کرتے ہیں، اپنی مرضی کی عیدی لیتے ہیں، اب بچے اپنی من مانی کرنے کے عادی ہیں......اب ہم چاند رات کو باہر بھی جاتے ہیں......ایک ہفتہ شاپنگ مکمل ہونے میں لگتا ہے......اب عید کے حوالے سے بہت سارے فیسٹول منعقد کیے جاتے ہیں۔ ہمارے بچپن میں سالوں تک عید کے کھانوں کا ایک ہی "مینو" ہوتا تھا، بریانی، قورمہ، رائتہ اور سلاد، اب تو ہر عید پر مختلف ڈشز بنتی ہیں......اب ہر چیز میں بڑی ورائٹی آ گئی ہے۔ اب تو امریکہ کے لوگوں کو بھی پتا چل جاتا ہے کہ کس نے عید پر کیا پکایا کیا کھایا اور کیا کھلایا......کیا پہننا اور کہاں کہاں چیک ان کیا۔

بچے تھے تو گھومنے پھرنے نکل جایا کرتے تھے صبح صبح اٹھ جاتے تھے......اور جو عیدی ملتی تھی مزے لے لے کر خرچ کرتے تھے......اب بچوں میں بھی بہت فرق آ گیا ہے اب تو عید کے دن سوتے ہی گزرتا ہے۔





صائمہ قریشی:- (آرٹسٹ)

مجھے تو اپنا بچپن بہت یاد آتا ہے۔ بڑی سادگی کا دور تھا، آسائشیں بہت کم تھیں مگر سکون بہت تھا......اس وقت کی عید اور آج کل کے زمانے کی عید میں بہت فرق نظر آتا ہے۔ اب لوگوں میں بھی بہت فرق آ گیا ہے۔ پہلے بہت خلوص و محبت ہوا کرتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے...... پہلے دعوتیں ہوتی تھیں لوگ آتے تھے اور بلا جھجک آتے تھے، اب ایک دوسرے سے ملتے نہیں ہیں۔ بات نہیں کرتے، بہت دوریاں ہو گئی ہیں ......ہم جب بچے تھے تو والدین کپڑے دلاتے تھے تو بہت خوشی ہوتی تھی اور بار بار نکال کر دیکھتے تھے اور عید کا شدت سے انتظار شروع ہو جاتا تھا مہندی، چوڑیاں، نئے کپڑے، جوتے......سب کا الگ ہی چارم تھا جو کہ اب دیکھنے کو نہیں ملتا......اب ہم اپنے بچوں کو اتنی زیادہ شاپنگ کروا دیتے ہیں کہ عید کا چارم ہی ختم ہو گیا ہے اور جو ہم بچوں میں ملنساری پیار اور محبت تھی وہ آج کل کے بچوں میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اب بہت تبدیلیاں آ گئی ہیں، پہلے عید کی بہت اہمیت تھی اب ختم ہو گئی ہے۔ عید کے دن تو لگتا ہے کہ جیسے "کرفیو" لگ گیا ہے۔ اب مجھے تو رمضان کی راتیں اور رونقیں اچھی لگتی ہیں۔ ہم

مدیحہ رضوی:- (آرٹسٹ)

ہمارے اور ہمارے بچوں کے بچپن کی عید کا کوئی موازنہ ہے ہی نہیں، جب ہم چھوٹے تھے تو نفسانفسی کا دور نہیں تھا بڑوں اور چھوٹوں کی بہت عزت کی جاتی تھی، خاندان اکٹھے ہوتے تھے، پھر مہمانوں کا تانتا بندھا ہوا ہوتا تھا......جبکہ اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ اب لوگوں کو جلدی بھی بہت ہے اب پہلے کی طرح فیملیز ایک دوسرے سے نہیں مل پاتیں۔ وہ لوگ وہ کولیگز جن سے آپ روزانہ ملتے ہیں ان سے تو عید کے دن بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ چونکہ میرا تعلق لاہور سے ہے تو لاہور میں فیملیز ہوتی ہیں۔ اب یہاں کراچی میں کوئی ہے نہیں قریبی ...... ویسے بھی اب پہلے والی عید رہی کہاں ہے، بچپن میں عید کی رونق ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ کھانے پک رہے ہوتے تھے، چاند رات کو گھومنا، شاپنگ کرنے کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ اگلے دن مہمانوں کا آنا......اگرچہ ابھی میرے بچے چھوٹے

ہیں مگر مجھے امید ہے کہ ان کے بڑے ہونے تک عید بالکل مصنوعی ہو جائے گی، حقیقت سے دور......اور یہ ایک کڑوا سچ ہے کوئی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے۔ اب فاصلے بھی بہت ہو گئے ہیں پہلے چچا تایا......پھوپھیاں سب قریب ہوتے تھے......اب ایسا نہیں ہے......ہاں عید کی شاپنگ میں اب بھی مزا آتا ہے جب ہم اپنے بچوں کی ساتھ باہر نکلتے ہیں۔



فضیلہ قیصر:- (آرٹسٹ)

ہمارے بچپن کی عید اور آج کے بچوں کی عید میں کافی فرق ہے۔ آج کے بچوں کی ڈیجیٹل عید ہوتی ہے۔ وقت کی ساتھ ساتھ بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ ہماری عید سادگی والی تھی ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خوش ہو جایا کرتے تھے، جبکہ آج کل کے بچے چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خوش نہیں ہوتے ......اور یہاں میں اپنے بچوں کی بات نہیں کر رہی بلکہ ایک جنرل بات کر رہی ہوں۔ میرے بچے تو آج بھی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ سب تربیت پر بھی منحصر ہے۔ عید کے لیے بچوں کو سکھانا پڑتا ہے کہ اس تہوار کی کیا اہمیت ہے۔ ہم نے تو بچپن میں ہر تہوار بہت ایکسائٹمنٹ کے ساتھ منایا۔ نئے کپڑوں کی، جوتوں کی خوشی، مہندی لگانے کی خوشی چوڑیوں کی خوشی اور عیدیاں ملنے کی خوشی، یہ ساری خوشیاں جب ایک جگہ جمع ہوتی تھیں تو اور بھی زیادہ ایکسائٹمنٹ ہوتی تھی۔ اب عیدیاں دینی ہوتی ہیں اور بچوں کو تیار ہوتے ہوئے دیکھ کر بہت خوشی بھی ہوتی ہے......میرا تو اب بھی عید کے موقع پر مہندی لگانے کا بہت دل چاہتا ہے مگر مجبوری ہے کہ شوٹ پہ جانا ہوتا ہے، وہاں کردار کے حساب سے تو مہندی نہیں لگا سکتی۔ تو میرا خیال ہے کہ ہر زمانے کی عید اچھی ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ہر زمانے کی عید میں فرق آجاتا ہے۔

☆☆☆

کچن اور آپ

اس ماہ، عابدہ مغل کو "کچن اور آپ" میں انعام کا حق دار قرار دیا ہے ادارے کی طرف سے عابدہ مغل کو تین ماہ کے لیے "ماہنامہ کرن" مفت دیا جا رہا ہے۔

نوٹ: بہنوں سے التماس ہے کہ جو بہنیں "کچن اور آپ" میں شرکت کرتی ہیں وہ اپنے گھر کا پتا ضرور لکھا کریں تا کہ تین ماہ تک ماہنامہ کرن بھجوایا جا سکے۔

آمنہ طاہر سے ملاقات

شاہین رشید

گلے میں سر ہو اور وہ بھی حمد وثناء کے لیے تو اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے" آمنہ بنت طاہر" کے گلے میں ایسے ہی سروں کی مالا ہے جو حمد و نعت میں پیروئی ہوئی ہے......رمضان المبارک کا مہینہ ہے اس حوالے سے ہم نے معروف نعت خواں آمنہ بنت طاہر سے انٹرویو کیا۔

☆ "کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

◄ "جی الحمدللہ۔"

☆ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

◄ "جی......میرا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے......اور میں ضلع اٹک کی تحصیل پنڈی گھیپ میں 29 جون کو پیدا ہوئی میری مادری زبان پنجابی ہے۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں، پانچ بہنیں اور تین بھائی......میرا نمبر چھٹا ہے اور میں گریجویٹ ہوں......والدین مجھے ٹیچر بنانا چاہتے تھے......اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میرے والد خود بھی ٹیچر تھے اور وہ پنڈی گھیپ کے سرکاری اسکول سے بطور ہیڈ ماسٹر ریٹائرڈ ہوئے۔ میرے والد محمد یوسف طاہر نے بطور ایجوکیشن آفیسر کے بھی اپنے فرائض انجام دیے ہیں اور میرے والد صاحب 2010ء میں ریٹائر ہوئے، میری والدہ گھریلو خاتون ہیں اور ہمارے والدین نے رزق حلال سے ہماری پرورش کی ہے اور ہماری تعلیم و تربیت پہ خصوصی توجہ دی ہے۔"

☆ "کب سے نعت خوانی کر رہی ہیں اور کب احساس ہوا کہ گلے میں سر ہے اور اسے نعت خوانی کے لیے وقف کرنا ہے؟"

◄ "جی......میں تو بچپن سے ہی نعت خوانی کر رہی ہوں اور تقریباً ہر سال اسکول، کالج اور تحصیل اور ضلع میں نعت خوانی میں ہی پہلی پوزیشن حاصل کی



ہے، اور نعت خوانی میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی گھرانے سے ہوں، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور عشق کی تڑپ نے مجھے حمد و نعت کی طرح راغب کیا......اور مجھے لگا کہ میرا دنیا میں آنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ میں آقا دو جہاں کی ثناء خوانی کر سکوں۔"

☆ "آج کل کی نسل کا رجحان نعت خوانی کی طرف کم اور میوزک کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ آپ کے حضور اکرم کی محبت اس جانب لائی، مگر کبھی دوسری سائیڈ جانے کا خیال آیا؟"

◄ "پہلے آپ کو بتاؤں کہ سب سے پہلے میں

www.PakiBooks.site



نے نعت خوانی اپنے ہی گھر میں منعقد ہونے والی محفل
میلاد میں کی اور میری دادی ماں جو خود بھی اچھی نعت
خواں تھیں اور عاشق رسول ﷺ تھیں ان کی فرمائش پہ
میں نے نعت پڑھی تھی اور پہلی بار ''کلمہ'' کا ورد کیا یعنی
پڑھا اور نعت......

جسے مل گیا کملی والے کا دامن
اسے دو جہاں کا خزانہ ملا ہے

اور آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ آج کل کی نسل کا
رجحان میوزک کی طرف زیادہ ہے......لیکن چونکہ
میری تعلیم و تربیت مذہبی گھرانے میں ہوئی اس لیے
کمرشل میوزک کی طرف میرا رجحان نہیں ہوا اور نہ ہی
کبھی ہوگا۔''

☆ ''اب تو نعت خوانی بھی میوزک کے ساتھ
ہوتی ہے......اس بارے میں کیا کہیں گی؟''

''میوزک کے ساتھ نعت خوانی کو زیادہ پسند
کیا جاتا ہے، اسلامی حدود میں رہتے ہوئے کبھی کبھار
''دف'' کا استعمال ہو جائے تو میرا خیال ہے کہ اس
میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

☆ ''تنویر آفریدی صاحب کی شاگردی میں
آنے کا خیال کیسے آیا؟''

''تنویر آفریدی میرے استاد محترم ہیں اور
ان کے پاس میں ایک ریفرنس سے گئی تھی۔ ہمارے
پی ٹی وی اسلام آباد کے پروڈیوسر اعجاز بلوچ ہیں ان
کے ریفرنس سے گئی......اور جب میری تنویر آفریدی
صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے نہ صرف
بہت اچھے طریقے سے بات سنی بلکہ مجھ سے نعت بھی
سنی اور پھر میری رہنمائی کی کہ کس طریقے سے پڑھنا
چاہیے، ادائیگی کیسے ہو، تلفظ کا سمجھایا اور ان تمام
باتوں سے بڑھ کر جو بات مجھے سب سے زیادہ اچھی
لگی وہ یہ کہ وہ ایک سچے عاشق رسولؐ ہیں اور بہت
شفیق انسان ہیں۔ تو ان کی شاگردی میں آکر مجھے
بہت اچھا لگا۔ انہیں جہاں ڈانٹنا ہوتا ہے ڈانٹتے ہیں
اور جہاں سمجھانا ہوتا ہے سمجھاتے ہیں۔''

PakiBooks.Site

☆ ''ریڈیو، ٹی وی اور دیگر محفلوں میں جانے کا
اتفاق تو ہوتا رہتا ہوگا؟''

''جی الحمدللہ محفلوں میں، ریڈیو اور ٹی وی میں
جانے کی سعادت اور حضور اکرم کی شان میں نعت
پڑھنے کی سعادت حاصل ہوتی رہتی ہے اور محفلوں
میں تو آنے کا اتنا بلاوا آتا ہے کہ ٹائم دینا مشکل ہو
جاتا ہے......بعض اوقات تو میرے لیے فیصلہ کرنا
مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں جاؤں اور کہاں نہ جاؤں۔''

☆ ''آپ کی شہرت کو دیکھ کر کبھی ایوان صدر
میں یا گورنر ہاؤس میں بلایا آپ کو......اور کن چینلز پہ
شرف نعت خوانی حاصل ہوا؟''

''ابھی تو شہرت کی ارتقائی منزل پہ ہوں۔ مگر
پھر بھی اللہ نے ہماری طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہوا ہے
اور اگر اس طرح اللہ کا کرم رہا تو ان شاء اللہ گورنر
ہاؤس اور ایوان صدر میں بھی جانے کا موقع ملے



گا......لیکن ضلع اور تحصیل میں جتنے بھی بڑے ادارے
ہیں وہ سب ہمیں بلا چکے ہیں اور اب تو آہستہ آہستہ
ٹی وی پہ بھی بلایا جا رہا ہے اور ابھی حال ہی میں میری
البم کی جو لانچنگ تقریب ہوئی اس کو بھی میڈیا والوں
نے کور کیا۔ خاص طور پر ''نیو، جیو ٹی وی، ٹی وی ون''
اور اے آر وائی والوں نے خاص طور پر کور کیا......پی
ٹی وی والوں نے مجھے نعت خوانی کا موقع بھی دیا۔ پی
ٹی وی نیوز سے بھی مجھے نعت خوانی کا موقع ملا اور ایک
دو چینلز نے تو میرا انٹرویو بھی دیا......''سماء'' ٹی وی پہ
بھی نعت خوانی کی، تو ان شاء اللہ آہستہ آہستہ سب
واقف ہو جائیں گے مجھ سے اور میری آواز سے۔''

☆ ''ابھی تو ارتقائی منزل پہ ہیں۔ مگر جہاں
جہاں نعت خوانی کا شرف حاصل ہوا......وہاں
پذیرائی کے لیے کوئی ایوارڈ ملا؟''

''جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں، ابھی
ارتقاء ہے لیکن اسکول، کالج اور جو مقامی تنظیمیں ہیں
ان کی طرف سے الحمدللہ مجھے بہت سارے ایوارڈز
ملے ہیں اور اتنے ہیں کہ اب تو رکھنے کی جگہ بھی نہیں
ہے......اور اگر آپ سب کی دعائیں اور اللہ تعالیٰ کا
کرم رہا تو اور بھی ایوارڈز ملیں گے، اور یہ ایوارڈز بلکہ
سرکاری ایوارڈ کیا چیز ہے۔ اگر سرکار دو عالم حضرت محمد
صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں قبولیت ہو جائے اس سے
بڑھ کر اور کیا چاہیے۔''

☆ ''مصروفیت کے مہینے کون سے ہوتے
ہیں۔ رمضان یا ربیع الاول یا ہر وقت؟''

''جی رمضان المبارک اور ربیع الاول میں تو
ایک جیسی مصروفیت ہوتی ہے......مگر اگر صحیح بتاؤں تو
ربیع الاول میں رمضان کی بہ نسبت زیادہ مصروفیت
ہوتی ہے۔ کیونکہ محفل میلاد کا انعقاد کثرت سے کیا
جاتا ہے ٹی وی چینلز پہ بھی اور دیگر جگہوں پہ بھی اور
ویسے مصروفیات تو سارا سال ہی رہتی ہیں۔''

☆ ''پہلی آڈیو ویڈیو البم کا کیا رسپانس ملا؟''

''19 اپریل 2018ء کو میری پہلی آڈیو،
ویڈیو البم ''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پریس
کلب سے ریلیز ہوئی اور مجھے اس کا بہت اچھا
رسپانس ملا، الحمدللہ......میرے گمان سے بڑھ کر مجھے

اچھا رسپانس ملا۔“

☆ ”فیلڈ کے بارے میں تو بہت باتیں ہو گئیں اب ذرا کچھ نجی سوال بھی ہو جائیں؟ تو یہ بتائیں کہ فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں آپ؟“

◆ ”فارغ اوقات میں گھر کا کچن سنبھالتی ہوں اور ہمارا اپنا پرائیویٹ اسکول بھی ہے ”طاہر ایجوکیشن انسٹویٹ“ تو کبھی کبھار وہاں کے ”پلے گروپ“ میں چلی جاتی ہوں اور ننھے منے بچوں کے ساتھ ٹائم گزارتی ہوں، چھوٹے بچوں کے ساتھ رہنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“

☆ ”سگھڑ ہو؟ فضول خرچ ہو...... اور گھریلو امور سے کتنی دلچسپی ہے؟“

◆ ”جی الحمدللہ آپ مجھے سگھڑ کہہ سکتی ہیں کیونکہ میں نہ صرف سب کام کرلیتی ہوں بلکہ مجھے سب کام کرنے کا شوق بھی ہے۔ گھر کا کوئی کام ہو، کھانا پکانا ہو، سب کرلیتی ہوں۔ اس طرح مجھے بیوٹیشن کا بھی شوق ہے تو میں مہندی بھی لگالیتی ہوں، مگر اس کے لیے ٹائم نہیں ملتا سلائی کڑھائی ہر ہنر سے آراستہ کیا ہے مجھے میری ماں نے اور فضول خرچ بالکل بھی نہیں ہوں، شعر و شاعری کا بہت شوق ہے۔ مطالعہ کرنے کا بھی بہت شوق ہے اور مختلف کتابوں اور خاص طور پر خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ تو ضرور کرتی ہوں اور چونکہ مجھے شاعری کا شوق ہے تو نعتیں بھی کچھ لکھی ہیں اور کچھ غزلیں وغیرہ بھی لکھی ہیں۔“

☆ ”اور ماشاء اللہ آپ جو کماتی ہیں اس کا حساب کتاب کون رکھتا ہے؟“

◆ ”میرا کوئی بنک اکاؤنٹ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے پیسے کمانے کا کوئی لالچ ہے۔ کیونکہ میرے آقا کی نظر کرم ہے عنایت ہے مجھ پر اس لیے مجھے پیسے کا لالچ نہیں ہے۔“

☆ ”بہ حیثیت نعت خواں کے ملک سے باہر جانے کا اتفاق ہوا؟“

◆ ”بہ حیثیت نعت خواں ملک سے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا ہے، لیکن جن لوگوں نے مجھے ملک سے باہر سنا ہے ان کی حسرت ہے کہ میں ان کے ملک میں، شہر میں آؤں اور اب جبکہ البم بھی ریلیز ہو چکی ہے تو ان شاء اللہ ملک سے باہر اور شہر سے باہر بھی جاؤں گی...... ویسے ”عمرہ“ کی سعادت حاصل کر چکی ہوں۔ رمضان المبارک کا پورا مہینہ فیملی کے ساتھ گزارہ تھا۔“

☆ ”شادی، منگنی؟...... پسند کو ترجیح دیں گی؟“

◆ ”جی نہ شادی نہ منگنی ...... مگر میری خواہش تو یہی ہے کہ گھر والوں کی مرضی و خواہش سے کروں اور مجھے یقین ہے کہ میرے رب نے جہاں میرے لیے اتنی آسانیاں کی ہیں وہاں یہ کام بھی بہت اچھے طریقے سے ہو جائے گا۔“

☆ ”زیادہ تر کس کے نعتیہ کلام پڑھتی ہیں آپ؟“

◆ ”میں ہمیشہ نعت خوانی کا آغاز ”اعلیٰ حضرت احمد رضا خان“ کے کلام سے کرتی ہوں اور ان کا کلام ہے بھی عشق و محبت سے بھرپور اگرچہ کلام مشکل ہے مگر پڑھنے میں مزا آتا ہے اور اگر کوئی تشریح مانگتا ہے تو میں تشریح بھی کر دیتی ہوں۔ ان کے علاوہ مولانا رومی اور حضرت امیر خسرو کا کلام بھی بہت پڑھتی ہوں۔ غلام فرید کوٹ مٹھن کے کلام مجھے بہت پسند ہیں۔ اپنی پہلی البم میں میں نے دو فارسی کلام بھی شامل کیے ہیں اور آئندہ بھی کروں گی، عارفانہ کلام مجھے بہت پسند ہیں اور ان شاء اللہ میری دوسری البم میں پنجابی کا عارفانہ کلام بھی شامل ہوگا۔“

☆ ”فیشن وغیرہ سے لگاؤ ہے اور اپنی کمائی کا زیادہ حصہ کہاں خرچ کرتی ہیں؟“

◆ ”میں جو کچھ بھی کمائی ہوں یا جو مجھے لوگ خود سے ہدیہ دیتے ہیں تو ایک فری فاؤنڈیشن ہے جو میرے پیر و مرشد کی ہے تو اس کے تحت ہم ماہانہ فری میڈیکل کیمپ لگاتے ہیں اور بچیوں کے لیے جہیز کا انتظام کرنا وغیرہ شامل ہے...... اللہ نے ہمیں ہر نعمت

PakiBooks.Site



سے نوازہ ہے تو اس میں مستحق لوگوں کا حصہ ضرور ہونا چاہیے...... آپ کا سوال کہ فیشن سے لگاؤ ہے...... تو جی بالکل لگاؤ ہے اور میں فیشن کرتی بھی ہوں مگر اپنی اسلامی حدود میں رہ کر۔ کیونکہ ہمارا گھرانہ جیسا کہ میں نے بتایا کہ مذہبی گھرانہ ہے۔ تو میک اپ بھی کرتی ہوں اور اسکارف تو بچپن سے ہی لے رہی ہوں۔ سر سے دوپٹا کبھی نہیں اتارتی ”عبایا“ مجھے بہت پسند ہے اور عبایا ہی پہنتی ہوں...... اور میں نے اپنے ویڈیو البم میں مختلف عبایا پہنے ہیں۔ چہرے کا نقاب نہیں کرتی، مگر اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھنا مجھے پسند ہے۔“

☆ ”گیمز سے لگاؤ ہے؟“

◆ ”جی...... مجھے کرکٹ سے لگاؤ ہے...... لیکن دیکھتی زیادہ نہیں ہوں کہ ٹائم نہیں ہوتا، ٹی وی دیکھنے کا بھی شوق ہے مگر ٹائم کی کمی ہے البتہ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ”کارٹون نیٹ ورک“ پہ کارٹون بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ ڈرامے کم دیکھتی ہوں۔ اشفاق احمد کا ڈرامہ ”تیرے من چلے کا سودا“ مجھے بہت پسند ہے، جو میں کئی بار دیکھ چکی ہوں۔“

☆ ”گانے وغیرہ گانے کی طرف رجحان ہے؟“

◆ ”نہیں...... بالکل نہیں بلکہ میری تو دعا ہے کہ ثناء خوانی کرتے کرتے یہ سانس نکلے تو میرے لیے بہت خوش قسمتی کی بات ہوگی۔ ہیر وارث شاہ مجھے بہت پسند ہے اور ان شاء اللہ اپنی دوسری البم میں اسے ضرور شامل کروں گی۔“

☆ ”اور آخر میں آپ نئے آنے والوں کے لیے کچھ کہیں گی؟“

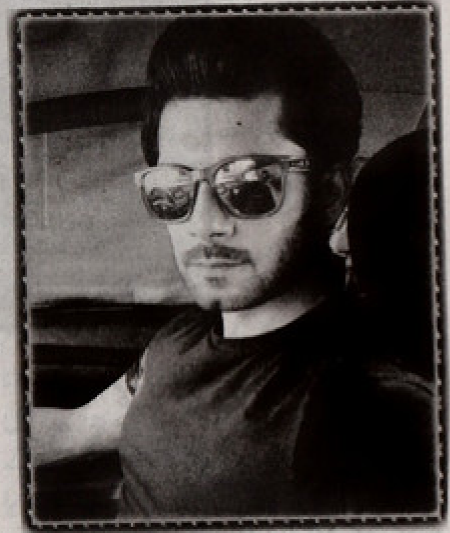
◆ ”نئے آنے والوں کے لیے میں اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر انہیں شوق ہے لگن ہیں تو ضرور آئیں اور اس میں مہارت حاصل کریں اور حضور اکرم کے حضور گلہائے عقیدت پیش کریں اور اپنا وظیفہ ورد پاک رکھیں کیونکہ پھر کوئی مشکل، مشکل نہیں ہوتی اللہ پاک ہم سب کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔ (آمین) اور آسانیاں بانٹنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)۔“

☆☆

میری بھی سنیئے

سید علی حسن

شاہین رشید



1- "میرا نام؟"

"سید علی حسن۔"

2- "پکارا جاتا ہوں؟"

"علی" کے نام سے...... میرا نام ایسا ہے کہ کوئی اسے بگاڑ نہیں سکتا۔"

3- "جنم لیا؟"

"11 اپریل کو کراچی میں۔"

4- "ڈگری لی؟"

"ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز ڈگری لی۔"

5- "فیملی؟"

"والدین اور ایک بہن ایک بھائی۔"

6- "قد؟"

"5 فٹ 11 انچ۔"

7- "شادی؟"

"ارے ابھی نہیں...... کچھ کمالوں کچھ کھالوں۔ کچھ جمع کرلوں...... شادی تو ہونی ہی ہے ہو جائے گی۔"

8- "میری کمائی کا ذریعہ؟"

"ایکٹنگ اور میرا اپنا پروڈکشن ہاؤس۔"

9- "ماس کمیونیکیشن میں ڈگری اس لیے لی کہ؟"

"کہ مجھے یہ فیلڈ اچھی لگتی تھی اور میں اس میں آنا چاہتا تھا، ڈگری نے راستے ہموار کیے...... ابتدا میں نیوز پڑھی، پھر اداکاری میں آگیا۔"

10- "کیوں......؟"

"مجھے معلوم تھا کہ یہ سوال ضرور ہوگا...... کیونکہ نیوز میں ایک جیسی روٹین کے ساتھ کام ہوتا تھا اور میں کام میں ورائٹی چاہتا تھا اور اداکاری کی فیلڈ میں بہت ورائٹی ہے۔"



11- "پیسہ کہاں ہے...... نیوز میں یا اداکاری میں؟"

"دونوں میں...... جب پہلی بار نیوز پڑھی تب بھی اچھا خاصا معاوضہ ملتا تھا اور اداکاری میں تو پیسہ ملتا ہی ہے۔"

12- "افسوس ہوتا ہے؟"

"جب میں دوسرے ملکوں کو ترقی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ آخر ہم کیوں نہیں ترقی کرتے۔ پتا نہیں ہم کس دنیا میں رہ رہے ہیں۔"

13- "زندگی بری لگتی ہے؟"

"جب وقت پر چیک نہیں ملتے۔"

14- "پیسہ کمانے کا آسان طریقہ؟"

"آپ کو معلوم ہے تو بتا دیں" ...... ہنستے ہوئے...... "پیسا کمانا بہت مشکل ہے۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے، پھر قسمت بھی اچھی ہونی چاہیے۔"

15- "گہری نیند سے کوئی اٹھا دے تو؟"

"سمجھ لیں کہ اس کی خیر نہیں ہے، بہت تپ چڑھتی ہے۔"

16- "جھوٹ میں کیا کیا بولتا ہوں؟"

"جھوٹ بولتا ہوں کہ ٹریفک میں پھنس گیا تھا۔ ڈیٹ کا پتا نہیں تھا۔ طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ یہ ہوگیا وہ ہوگیا...... کیا کریں اپنی سیفٹی کے لیے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔"

17- "ڈھیر سارا پیسہ ہاتھ لگ جائے تو؟"

"مجھے ٹریولنگ کا بہت شوق ہے تو بہت گھوموں گا سیاحت کروں گا۔"

18- "بدلہ لیتا ہوں؟"

"نہیں...... کوئی کام بہت زیادہ خراب ہو جائے، میری عزت، میری ذات پہ کوئی حرف آرہا ہو تو ضرور بدلہ لیتا ہوں...... ورنہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔"

19- "نیند نہیں آتی؟"

"جب تک اپنے سرہانے یا سائڈ ٹیبل پہ پانی کی بوتل، چارجر اور ضروری چیزیں نہ رکھ لوں۔"

20- "آئینہ دیکھتا ہوں تو؟"

"بے اختیار اللہ کی تعریف کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

21- "ریموٹ کس چینل پہ رک جاتا ہے؟"

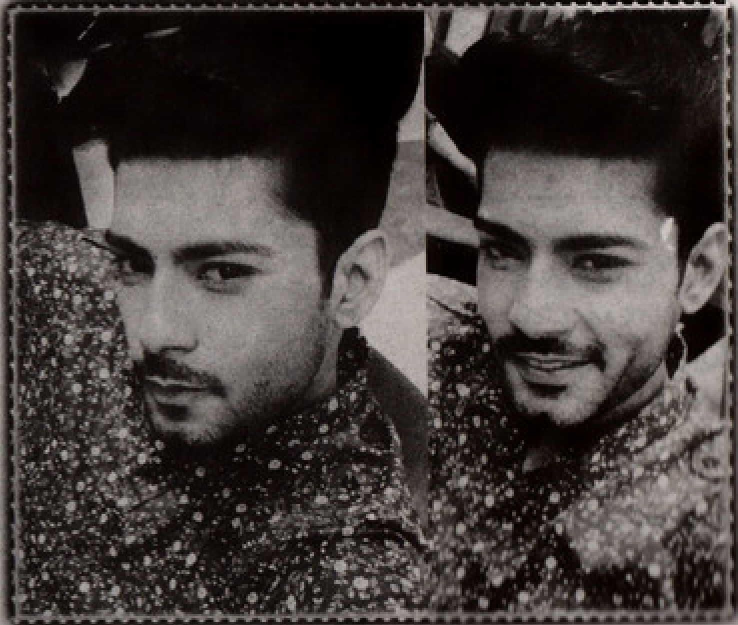
"میوزک چینل پہ۔ میوزک سن کر اور دیکھ کر ریلیکس ہو جاتا ہوں۔"

22- "کھانے کے میز پہ کیا ضروری ہے؟"

"ہر چیز...... میں بہت اہتمام کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں۔"

23- "کیا چیز روزانہ کھا سکتا ہوں؟"

"چکن تکا...... بہت پسند ہے مجھے۔"



24- ''میں دنیا کے سارے کام کر سکتا ہوں مگر؟''

''مگر ایک کام کرنے کو مجھے کوئی کبھی نہ کہے اور وہ کام ہے کچن میں کھانا پکانے کا..... یہ کام کبھی نہیں کر سکتا۔''

25- ''پکوان کس کے ہاتھ کے پسند ہیں؟''

''کک کے ہاتھ کے، ہمارے گھر میں بچپن سے کک آتا ہے وہ ہی بہترین پکاتا ہے۔''

26- ''مجھے وہم ہے؟''

''کہ پتا نہیں میں بھرپور طریقے سے کامیابی حاصل کر سکوں گا کہ نہیں......اور جو میں حاصل کرنا چاہتا ہوں پتا نہیں کر بھی سکوں گا کہ نہیں۔''

27- ''میری ایکسٹرا اصلاحیت؟''

''میری چھٹی حس بہت تیز ہے اور مجھے پہلے سے پتا چل جاتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔''

28- ''گھر آ کر پہلی بات کیا کرتا ہوں؟''



''کھانے میں کیا پکا ہے......کھانا مل جائے گا۔''

29- ''موبائل سروس آف ہو تو؟''

''لگتا ہے دنیا ختم ہو گئی ہے۔''

30- ''فضول خرچ ہوں؟''

''کسی حد تک ......کیونکہ اگر مجھے کوئی چیز پسند آ جائے تو پھر پیسوں کی پروا نہیں کرتا اسے لے کر ہی رہتا ہوں۔''

31- ''کون سا کھانا ہضم نہیں ہوتا؟''

''کھانے تو سب ہی ہضم ہو جاتے ہیں۔ بس تنقید ہضم نہیں ہوتی۔''

32- ''خواب سچے ہوتے ہیں؟''

''جی بالکل ......میرے خواب تو عموماً سچے ثابت ہوتے ہیں۔''

33- ''مجھے نشہ ہے؟''

''شاپنگ کرنے کا ......اپنے لیے کپڑے بنانے کا۔ دوسروں کے لیے شاپنگ کرنا بھی مجھے بہت پسند ہے اور جہاں سے اچھی چیزیں مل جائیں شاپنگ ہو جاتی ہے۔''

34- ''سینما میں پہلی فلم کون سی دیکھی؟''

''جراسک پارک۔''

35- ''میں سیکھتا ہوں؟''

''اپنے تجربے سے ......دوسروں کے تجربے مجھے سبق نہیں دیتے۔ حالانکہ ہمیں دوسروں کے تجربات سے بھی سیکھنا چاہیے۔''

36- ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں؟''

''قسم سے ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں۔ ہر کام میں۔''

37- ''لوگ وقت ضائع کرتے ہیں؟''

''دوسروں کی برائیاں کر کے اور دیر تک نیٹ کو استعمال کر کے۔''

38- ''تہوار جیسا دن؟''

''پہلے جب چھوٹا تھا تو ہر تہوار کا انتظار رہتا تھا مگر اب جس وقت چھٹی ہوتی ہے وہ ہی دن تہوار لگنے لگتا ہے۔''

39- ''سائنس کی بہترین ایجاد؟''



''موبائل فون ......ساری دنیا سے رابطہ رہتا ہے۔''

40- ''لڑکیوں کی اچھی عادت؟''

''کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ سب کی عادتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔''

41- ''کس کے غصے سے ڈرتا ہوں؟''

''ڈرتا تھا......مگر اب نہیں پہلے والد کے غصے سے بہت ڈر لگتا تھا......اور شکر ہے کہ مجھ میں غصہ تیز نہیں ہے۔ کبھی کبھار ہی آتا ہے۔''

42- ''اپنی کمائی سے قیمتی چیز جو خریدی؟''

''اپنی کار۔''

43- ''میری زندگی رف ٹف ہے؟''

''جب اس فیلڈ میں نہیں تھا تو زندگی رف ٹف ہی تھی۔ بہت لاپروا تھا اپنی ذات میں ......مگر اب جب اس فیلڈ میں آیا ہوں۔ ٹپ ٹاپ سے رہتا ہوں کہ کب کوئی پہچان لے۔''

44- ''بچپن کا کھلونا جو بہت پیار سے رکھا ہوا ہے؟''

''اپنا دل......بہت نرم بہت نازک ہے اور بالکل میرے لیے بچہ ہے اس کی بہت حفاظت کرتا ہوں۔''

45- ''ایک بری عادت جو اب نہیں ہے؟''

''بچپن میں دوسروں کی باتوں کی بہت ٹوہ لیتا تھا چھپ چھپ کر سن بھی لیتا تھا۔ مگر اب اللہ کا شکر ہے کہ یہ بری عادت بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ہے۔''

46- ''گھر میں کس جگہ پہ کھانا کھانے کا مزا آتا ہے؟''

''اپنے بیڈ پہ ...... واہ ......بہترین جگہ ہوتی ہے۔''

47- ''کب فخر ہوتا ہے؟''

''جب لوگ مجھے پہچان کر سیلفی کی فرمائش کرتے ہیں۔ تو بہت اچھا لگتا ہے کہ اتنی آبادی میں میں پہچانا جاتا ہوں۔''

48- ''سوشل ہیں؟''

''نہیں اتنا نہیں جتنا مجھے ہونا چاہیے۔ بہت سی تقریبات میں مدعو ہوتا ہوں مگر نہیں جاتا......کام کے بعد مجھے گھر پہ رہنا پسند ہے۔''

49- ''عورت کے بارے میں آپ کی سوچ؟''

''کہ عورت حسین تو ہو سکتی ہے مگر ذہین نہیں۔''

50- ''گھر میں کس جگہ سکون ملتا ہے؟''

''صرف اور صرف اپنے کمرے میں۔''

☆☆

PakiBooks.Site

مقابل ہے آئینہ

کنول شاہین قیصر

ادارہ

س ''اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟''

ج ''اصلی نام شادی سے پہلے ''کنول شاہین'' شادی کے بعد ''کنول شاہین قیصر'' جبکہ گھر والے شادی سے پہلے اور بعد اور اب تک امی جان کا رکھا گیا پیارا کا نام ''ثوماں'' ہی کہتے چلے آ رہے ہیں، کچھ ''ثومی'' بھی کہتے ہیں۔''

س ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج ''آئینہ تو بہت کچھ کہتا ہے، اتنی تعریفیں کرتا ہے کہ بس...... اپنے شوہر نامدار قیصر شہزاد صاحب سے اکثر و بیشتر کہتی نظر آتی ہوں کہ جناب آپ کچھ سبق آئینے سے ہی سیکھ لیجیے۔''

س ''حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟''

ج ''یہی کہ جس مصور نے یہ حسین صورتیں بنائی ہیں وہ خود کس قدر اور کتنا حسین ہوگا۔''

س ''اگر آپ پرس کی تلاشی لی جائے تو؟''

ج ''اگر تو مہینے کا اسٹارٹ ہے، قیصر (میرے مجازی خدا) کو تنخواہ مل چکنے کے بعد تو میرا پرس ماشاء اللہ سے پیسوں سے بھرا ہوا ملے گا، اور اگر مہینے کا مڈ (درمیان) ہے تو بس مختصر سی رقم اور اگر مہینے کا اینڈ ہے تو جناب بس پھر کنول صاحبہ کا خالی پرس ہی آپ کے ہاتھ لگے گا۔''

س ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج ''بالکل بھی نہیں، جس گھر میں تلاوت قرآن ہو وہاں پر بھوت پریت نہیں آیا کرتے۔''

س ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج ''مہمان تو مہمان ہی ہوتے ہیں اللہ پاک کی رحمت ہوتے ہیں۔

س ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج ''مجھے ہر سبزی گوشت کے ساتھ، یا پھر یوں کہہ لیں کے گوشت بغیر سبزی کے کھایا نہیں جاتا۔''

س ''اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟''

ج ''سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کے گھر اور نبی پاک کے روضۂ پاک پر جاؤں گی۔ پھر ایک بہت ہی پرانی اور شدید ترین خواہش پوری کروں گی کہ جہاں پر امی لوگ رہتے ہیں ''جلال پور جٹاں'' وہ میرے سسرال ''تلہ گنگ'' سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہے، یا تو انہیں اپنے پاس اپنے شہر میں گھر دلاؤں گی یا پھر خود وہاں گھر بناؤں گی۔ 10 سال سے بس یہی رونا اور یہی رونا کہ اکلوتی ہونے کے باوجود اماں، ابا نے اتنی دور بیاہ دیا۔''

س ''پسندیدہ شاعر؟''

ج ''مجھے شاعری سے حد درجہ شغف ہے اور میرے پسندیدہ شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے۔''

س ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج ''بالکل بھی نہیں۔ لڑائی کی ابجد سے بھی ناواقف ہوں۔ مزاجاً بہت سوفٹ سی نیچر کی مالک ہوں۔''

س ''کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟''

ج ''اچھی اور سلجھی ہوئی پیاری پیاری گفتگو کرنے والے لوگ دل کو بہت چھوتے ہیں۔''

س ''اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟''

ج ''تو پاکستان ''جنت نما'' ہوتا۔ (کیا خیال ہے آپ کا)۔''

س ''اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

ج ''صبح سویرے کا دلفریب اور سہانا سا وقت۔''

س ''آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟''

ج ''فوراً اسے پیشتر کہوں گی کہ فضول خرچ۔''

س ''کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟''

ج ''یقیناً ہوتا ہے۔ میرا نام تو میری شخصیت کا بھرپور آئینہ دار ہے جناب کنول کی طرح ہی ہوں میں، پاکیزہ، صاف شفاف اور بہت پیاری سی (آہم)۔ (اپنے منہ میاں مٹھو بننا ویسے کتنا اچھا لگتا ہے ناں)۔''

س ''وہ کون سا کام ہے جس کو کرتے ہوئے سوچ آتی ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟''

ج ''دنیا کی پروا کرنا چھوڑ دی ہے۔ جب دنیا کی پروا کرتے ہوئے کام کرتی تھی تب ہر وقت خون جلا رہتا تھا۔ اور اب جب دنیا کی کوئی پروا نہیں تو بس ہر وقت لال و لال ریڈ روز بنی گھومتی رہتی ہوں۔'' (ہاہاہا)۔''

س ''آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟''

ج ''کتا پیچھے لگ نہیں جائے، کتا بادولت کے پیچھے اسکول کے زمانے میں لگا تھا۔ اور اس بدتمیز و خونخوار کتے نے میری ٹانگ پر اپنے دانت یوں پیوست کیے تھے کہ بس پھر ما بدولت کو چودہ انجکشنز ناف پر لگوانے پڑے۔''

س ''آپ کی نظر میں محبت؟''

ج ''بقول میرے پسندیدہ شاعر ''امجد اسلام امجد'' کے۔''

محبت ایسا دریا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے
تو
پانی کم نہیں ہوتا

س ''کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟''

ج ''اپنی پیاری اماں جانی کی جنہوں نے اتنے پیار سے اور اتنے اچھے انداز میں میری تربیت کی کہ آج ایک دنیا تعریف کرتی ہے میری۔ مگر وہ دراصل میری اماں کی تعریف ہوتی ہے کہ جنہوں نے اتنے اچھے سے مجھے سب کچھ سکھایا۔ امی کے بعد بھائیوں کی اور اب اپنے بہت لونگ اینڈ کیئرنگ شوہر ''قیصر'' کی۔''

س ''اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے کیا؟''

ج ''ارے ایسی ویسی، میں تو خوشی سے پھولی نہیں سماتی اور اپنی ڈھیر ساری تعریفیں سمیٹنے کے باوجود بھی تعریف سننے سے کم از کم دل نہیں بھرتا۔ مگر ایک ایسا بندہ ہے کہ جس کے منہ سے اپنی تعریف سننے کو بے انتہا دل چاہتا ہے مگر وہ ٹھہرا ازلی کنجوس قیصر۔''

س ''ڈرامے دیکھتی ہیں؟''

ج ''ہاں جی...... بہت ذوق اور شوق سے تقریباً ہر چینل سے دیکھتی ہوں۔''

س ''اگر دوست ناراض ہو جائے تو؟''

ج ''تو ایک بھی پل ضائع کیے بغیر اسے فوراً منا لیتی ہوں۔ دراصل میں انا پرست نہیں۔''

س ''حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟''

ج ''سچ بتاؤں۔ جب ہر مہینے سویٹ سا ''کرن ڈائجسٹ'' میرے ہاتھوں میں آتا ہے تب جو خوشی بلکہ حقیقی خوشی مجھے ملتی ہے نا قابل بیان ہے۔''

س ''زندگی سے کیا سبق سیکھا؟''

ج ''شادی سے پہلے تک کی زندگی سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ مگر شادی کے بعد کی دس سالہ زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔''

س ''ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟''

ج ''میں ستاروں پر یقین نہیں رکھتی۔ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میں ورگو ہوں۔ بس اس سے آگے کچھ نہیں۔''

س ''کوئی آخری بات؟''

ج ''کہ آج مجھے ''مقابل ہے آئینہ'' میں خود کو شامل کر کے اس پیارے سے سلسلے میں جواب دے کر بہت زیادہ اچھا لگا۔''

☆☆

PakiBooks.Site

رخ چوہدری

شبِ غم کی سحر

لندن کے انتہائی سرد موسم میں بڑھیا نائٹ کلب کی عمارت کے نیچے بیٹھی ہر آتے جاتے بندے کے آگے ہیٹ کر کے اپنے بیمار شوہر کی دوا اور کھانے کے لیے پیسے مانگ رہی تھی کہ اچانک ٹمی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے بڑھیا کی جمع شدہ رقم لے کر بھاگ جاتی ہے۔

''سلیم منزل'' کے اکلوتے چشم و چراغ سلیم الدین جن کی والدہ حمیدہ خاتون ان کی شادی اپنی برادری یعنی نوابی رسم و رواج والی لڑکی سے کرنا چاہتی ہیں اور ان کے شوہر نواب علیم الدین اپنے دیرینہ دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ کو بطور بہو پسند کرآتے ہیں اور اس پسند میں سلیم الدین اور دونوں بہنوں کی پسند شامل ہوتی ہے مگر حمیدہ خاتون مختلف زبان، مختلف ثقافت اور کم تعلیم یافتہ بہو کو دل سے قبول نہیں کرتیں اور دن رات کڑھا کرتیں۔

ظہیر احمد ایک سرکاری افسر ہیں مزاجاً انتہا بد مزاج، اکھڑ، بات بات پر بیوی کی بے عزتی اور اس پر ہاتھ اٹھانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ظہیر احمد اور رقیہ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں اسما، ثمینہ، شکیل اور جمیل۔ ظہیر احمد کے بڑے بھائی کبیر احمد سخت ضرور تھے مگر بیوی پر ہاتھ اٹھانے کو مرد کی بزدلی اور کمزوری سمجھتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے عابد اور ساجد جو اسما اور ثمینہ کے منگیتر ہیں اور تین بیٹیاں جن میں دو شکیل اور جمیل کی منگیتر ہیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے

PakiBooks.Site

تیسری قسط



ساجد کے منہ سے نکلنے والا یہ کوئی معمولی ترکی پٹاخا نہیں تھا کہ معمولی سا دھماکا ہوتا کہ کچھ دیر کے لیے سب حیران ہوتے۔ بلکہ یہ تو ''ایٹم بم'' تھا۔ جس نے پل بھر کو سب کی سماعتوں کو سن کر دیا تھا۔ کیونکہ یہ دیوار میں ٹھکنے والی معمولی چھوٹی سی کیل نہیں تھی کہ ذرا سا رنگ اترتا۔ دوبارہ ہو جاتا۔ ارے اس دھماکے نے تو پل کے لیے سات پشتوں کی روایات کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

''حواسوں میں تو ہو میاں صاحب زادے کیا کہہ رہے ہو، غور کیا تھا اپنے الفاظ پر بولنے سے پہلے کہ یوں ہی گدھا ہانک دیا۔''

عبدالکبیر صاحب نے بیٹے کو سرتاپا گھورا جو عابد کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ گستاخی بھی کوئی معمولی نہیں تھی۔ لہجے میں بغاوت، چہرے پر ارادے کی سختی لیے، وہ پھر بھی باپ کی نگاہوں کی تپش برداشت نہ کر پایا۔ اس وقت لاؤنج میں موجود ہر کوئی ششدر تھا۔ بہنوں نے ڈرتے ہوئے پہلے بھائی کو دیکھا...... پھر ایک دوسرے کو اور تیسری نظر باپ پر تھی۔ جن کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔ البتہ صدیقہ بیگم کے چہرے پر حیرت نامی کسی چیز کا غبار نہیں تھا۔ چپ چاپ ہاتھ میں تسبیح لیے پڑھ رہی تھیں۔

''میں نے پوچھا...... میاں کیا بکواس کی ہے آپ نے۔ اس کا مطلب کیا ہے کہ تمہیں جرات بھی کیسے ہوئی کہ میرے مدمقابل کھڑے ہو کر تم اس رشتے سے انکار کر رہے ہو، جس سے کئی رشتوں کی جڑیں نکل رہی ہیں۔''

عبدالکبیر صاحب اتنا دبا کے غصہ سے بولے کہ ان کی سانس دب گئی صدیقہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اپنی جگہ سے اٹھیں اور پانی کا گلاس آگے بڑھایا۔

''آپ...... آپ پریشان نہ ہوں...... جی میں پوچھ لیتی ہوں انکار کی وجہ۔''

''بس! بس رہنے دیجیے بیگم صاحبہ یہ...... یہ سب آپ ہی کی تربیت ہے کہ جوان بیٹا۔ باپ کے سامنے کھڑا اس کے فیصلے سے انکار کر رہا ہے۔ اگر ڈھنگ کی تربیت کی ہوتی تو......!!

بات کرتے کرتے عبدالکبیر صاحب سینے پر ہاتھ رکھ کر ہانپنے لگے۔ صدیقہ اٹھ کر ان کو پکڑنے لگیں کبیر صاحب نے انہیں پرے دھکیل دیا۔ شاہدہ نے جلدی سے دراز سے زبان کے نیچے رکھنے والی گولی ابا کو دی جو انہوں نے گہرے سانس لیتے ہوئے زبان کے نیچے رکھی گھر کی فضا جس میں شادیانوں کی چھپی گونج تھی اب سراسیمگی چھا گئی تھی۔ ساجد اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا۔ چہرے پر تناؤ اور ہٹ دھرمی اس بات کی غماز تھی کہ کچھ بھی ہو جائے۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے گا۔ عابد نے ایک تیز نگاہ ساجد پر ڈالی اور باپ کی طرف بڑھا۔

''ابا جان...... ابا جان...... !چلیے ڈاکٹر کے ہاں چلتے ہیں...... چیک اپ ہو جائے گا۔''

''ارے نہیں جانا ہمیں کسی ڈاکٹر کے پاس اور نہ کسی ڈاکٹر کی پاس ہمارا علاج ہے۔ ارے یہ زخم ہماری ناخلف اولاد نے لگائے ہیں۔ اور دوا ڈاکٹر لگائے یعنی کہ حد ہو گئی۔ بچپن سے طے شدہ رشتے سے صاحب زادے نے یوں انکار کیا ہے گویا ہم نے ان کو لطیفہ سنایا ہو جو ان کو پسند نہ آیا ہو۔ حد ہو گئی۔'' صدیقہ بیگم ہاتھ مسل رہی تھیں کبھی بے بسی سے شوہر کو دیکھتیں تو کبھی بیٹے کو۔

''سنیے جی! آپ اتنا پریشان نہ ہوں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''جی...... جی کیوں نہیں آپ کے پاس تو جادو کی چھڑی ہے گھمائیں گی، جھٹ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ظہیر میاں کی زبان کے آگے بھی تو خندق کھدی ہے، کوئی لحاظ کیے بغیر بولے جاتے ہیں۔

اب...... اب کیا جواب دوں گا میں ظہیر کو...... کہ...... کہ میاں ہمارے صاحب زادے تو۔ خود ماہر نفسیات ہیں۔ اسی لیے وہ آپ کی نفسیاتی مریضہ بیٹی سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ ہائے...... اف!!''

عبدالکبیر صاحب سینہ دباتے گہری سانسوں کے ساتھ بولے جا رہے تھے۔ بیٹیاں اور بیگم بے بسی سے

دیکھ رہی تھیں۔

''امی جان! آپ ابا جان کو سنبھالیے میں ذرا ان صاحب زادے کے حال احوال معلوم کرتا ہوں، چلو تم ہمارے ساتھ۔'' عابد نے قدرے آہستگی سے ماں کے کان میں کہا اور ساجد کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا۔

''ہاں! اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ کیوں شادی نہیں کرنا چاہتے تم ثمینہ کے ساتھ۔ ارے میاں اس لڑکی کو بچپن سے دمہ کی بیماری ہے۔ کبھی کبھی تکلیف ہو جاتی ہے۔''

''بیماری الگ چیز ہے بھائی جان اور پاگل پن الگ چیز ہے اور سو باتوں کی ایک بات کہ مجھے ثمینہ پسند بھی نہیں ہے۔ میرا آئیڈیل کوئی اور ہے اور پھر ابا جان یا کوئی بھی مجھے ثمینہ کے ساتھ شادی کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔ میں بالغ ہوں مجھے دین نے اپنی پسند کی لڑکی سے نکاح کا حق دیا ہے۔''

ساجد کا لب و لہجہ چہرے پر ارادوں کی پختگی کی سختی عابد کو بہت سی باتیں سمجھا گئی تھی وہ گہرا سانس لے کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم کسی لڑکی کو پسند کر چکے ہو۔'' ساجد کی تنی گردن قدرے جھکی، نظریں بھی اعترافاً جھک گئیں۔

''جی...... جی وہ...... میرا مطلب ہے کہ۔ وہ...... وہ مجھے بہت پسند ہے اور میں اسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں بس۔'' اب ساجد کے اعترافی بیان کے بعد عابد شش و پنج میں پھنس گیا۔ ایک طرف ثمینہ بچپن کی منگ دوسری طرف ساجد اس کا دل اس کی پسند کسی گھمبیر جنگ کا بگل بجنے والا تھا گویا۔ وہ چپ چاپ ساجد کو دیکھے گیا۔ اب ساجد سختی کی سیڑھی سے اترا نرمی اور ملائمت کے راستے پر قدم رکھا۔

''دیکھیے! بھائی جان وہ بہت خوب صورت ہے بہت اچھی ہے۔ اس کے والدین انتقال کر چکے ہیں۔ بھائیوں کی ذمہ داری کم بوجھ زیادہ ہے۔ ایک دوست کی شادی میں، میں نے اس کو دیکھا تھا۔ تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔''

داستان عشق سناتے سناتے۔ ساجد حد ادب کراس کرنے لگا تو عابد نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈال کر ''حد ادب'' یاد کروایا تو وہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

''وہ......! وہ میرا مطلب ہے بھائی جان کہ میں، میں منیبہ ہی سے شادی کروں گا۔ پسند کی شادی...... میرا حق ہے اور یہ حق مجھے میرے اللہ نے دیا ہے۔ آ...... آ...... آپ میرا ساتھ دیں گے بھائی جان۔ پلیز! بتائیں ناں میرا ساتھ دیں گے۔''

اب ساجد نے عابد کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے سیاسی حربہ استعمال کیا۔ عابد کے ہاتھ تھام کر ملتجی لہجے میں کہا تو عابد نے ایک مجبوری نظر اس پر ڈالی، اسے اپنے باپ چچا اور خاندانی روایات کے پس منظر میں ایسا ہونا ممکن نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

''دیکھو! ساجد میں جانتا ہوں پسند کی شادی نہ گناہ ہے نہ جرم مگر تم سب کچھ جانتے ہو۔ میں اکیلا اگر تمہارا ساتھ دیتا بھی ہوں تو بغاوت کے الزام میں، میں بھی خاندان بدر ہو سکتا ہوں اور سب سے بڑھ کر ابا جان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا۔ ابا جان اور چچا جان۔ تمہارا انکار برداشت نہیں کریں گے ساجد قیامت آ جائے گی قیامت۔''

عابد جانتا تھا کہ بپھرے شیر اور آتے طوفان کو روکنا ناممکن ہے اس کے لیے۔ پھر بھی اس نے ساجد کو سمجھانا چاہا تو وہ مزید تپ کے اکھڑا۔

''تو آنے دیجیے قیامت...... آ جائے جس قیامت کو آنا ہے...... کم از کم مجھے تو اس نفسیاتی مریضہ سے شادی نہیں کرنی۔ کہہ دیجیے ابا جان سے۔'' پتھریلے اور اٹل لہجے میں ساجد نے اپنا فیصلہ سنا ڈالا۔ تو عابد گہرا سانس لے کر اس کو جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

”آئے ہائے ہماری دلہن بیگم نے پوتے کے لیے کتنے وظائف کیے بے شمار نام سوچ کر رکھے مگر......
ہائے رے قسمت پھر ہماری بہو بیگم نے پوتی ڈال دی دلہن بیگم کی گود میں۔ ہائے ہم اس قلق میں کہیں مر ہی نہ جائیں۔ ہوش کیجیے دلہن بیگم...... ورنہ ہم بھی بے ہوش ہوئے جاتے ہیں۔“

چمنیا بیگم بڑی وفاداری اور خلوص دل سے دلہن بیگم کے دکھ میں شریک تھیں۔ اسی وقت علیم الدین ننھی پری کو لے کر آ گئے۔

”ارے! بیگم دیکھیے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنی حسین پریوں جیسی پوتی سے نوازا ہے۔ بالکل آپ جیسی لگتی ہیں۔ وہی ناک نقشہ لیجیے پیار سے گود میں بٹھائیں اور اچھا نام رکھ دیجیے اس ننھی پری کا۔“

علیم الدین نے ننھی سی بچی بیگم کی گود میں ڈالی تو جیسے ان کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ کافی دیر اپنی دعاؤں کے قبول نہ ہونے پر ماتم کرتی رہیں پھر انہوں نے ننھی بچی کو دیکھا۔ تو لاکھ بہو سے عداوت، قسمت سے شکایت سہی دُعائیں قبول نہ ہونے کا صدمہ سہی۔ دادی کی ممتا سب پر حاوی ہوگئی ہونٹ بچی کی پیشانی پر آ لگے۔

”بشریٰ! یہ ہماری بشریٰ خاتون ہیں۔ ان کا نام بشریٰ خاتون ہی رہے گا۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے، جہاں بیٹیاں ہی پیدا ہوتی ہوں وہاں ایک بیٹی کا نام بشریٰ رکھ دو تو بعد میں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔“

علیم الدین جو اس بات پر خوش تھے کہ دادی نے نئی پوتی کو قبول کر لیا ہے۔ وہاں ان کی ضعیف الاعتقادی پر سر پیٹ کر رہ گئے۔ ابھی اس بات پر انہوں نے بحث مناسب نہ سمجھی کہ بیگم حالت غم میں ہیں اس لیے اس بحث کو کسی اور وقت کے لیے سنبھال کر کرتے کی جیب میں ڈالا۔

”سنیے! علیم صاحب یہ ہماری صرف ہماری پوتی ہیں۔“

”کیا...... کیا مطلب ہے بیگم آپ کا...... یہ صرف آپ کی پوتی ہیں۔ تھوڑی سی پوتی تو یہ ہماری بھی ہیں...“

”ہرگز نہیں قطعی نہیں یہ ممکن بھی نہیں، بشریٰ خاتون صرف ہماری پوتی ہیں۔ ہم اس پر اس کی جاہل اجڈ وا... سایہ بھی پڑنے نہیں دیں گے۔ ان کی ہم خود تربیت کریں گے اور پرورش کریں گے، اپنے نوابی انداز میں، نوابی... میں۔ اپنی نوابی ثقافت اور روایات کے رنگ میں رنگ دیں گے ہم اپنی ننھی بشریٰ خاتون کو اور اسی سلسلے میں ہم آپ کو بھی مداخلت کی اجازت نہیں دیں گے۔ چمنیا بیگم، جلدی سے گھٹی تیار کر کے لاؤ ہم اپنی بشریٰ خاتون کو دیں گے۔“

بشریٰ کیا گود میں آئی تھیں۔ حمیدہ خاتون ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کے لیے میدان میں اتر آئی تھیں۔ اب بھلا علیم الدین کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لہٰذا احسان جتاتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

”چلیے بیگم کیا یاد کریں گی۔ کر لیجیے پورے آپ اپنے ارمان۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“

اعتراض تو شگفتہ خاتون کو بھی نہیں تھا۔ مگر پھر بھی روئے جا رہی تھیں۔ سلیم میاں گھبرائے جا رہے تھے۔

”شگفتہ بیگم بھئی بس کر دیجیے۔ بیٹی کی پیدائش پر آپ اتنا روئیں گی ہمیں یقین نہیں آ رہا۔ بیٹی تو رحمت ہو... ہے...... اور......“

”رہنے دو، جی! زیادہ رحمت بھی لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی ویسے بھی میں ماں ہوں، بیٹی کے آنے... نہیں رو رہی۔“

شگفتہ خاتون نے کئی ٹشو ایک ساتھ نکالے ناک صاف کیا اور پھر رونا شروع کر دیا۔ سلیم میاں الجھ سے گئے۔

”تو...... تو! آپ کی ان حسین آنکھوں سے برستے اس ساون کی کیا وجہ ہے، کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں... اماں جان نے بشریٰ کا نام خود ہی رکھ لیا!“

”جی نہیں۔ بشریٰ میری ایک سہیلی کا نام بھی تھا۔ بڑی کمینی سی تھی۔ چوردی تھی۔ لڑاکی بھی اور تیز بھی...

...کی پر وہ مجھ سے اور میں اس سے بہت پیار کرتی تھی، رونا تو مجھے کسی ہور ہی گل پہ آ رہا ہے۔ ہائے...... میں مر جاؤں...... کیسے، کیسے ہوگا یہ سب میں کیسے برداشت کراں گی...... یہ صدمہ۔“

شگفتہ بات کرتیں پھر رونے کی بقیہ قسط کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتیں۔ سلیم میاں کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے ان آنکھوں کے پیچھے چھپے اس بھیگے راز کو پا لینا چاہتے تھے مگر فی الوقت تو کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔

”اوہو! سمجھا...... سمجھا...... آپ...... آپ اس بات پر افسردہ ہیں کہ اماں جان نے کہہ دیا ہے کہ بشریٰ خاتون کی پرورش وہ خود کریں گی۔ بشریٰ خاتون ان کے سانچے میں ڈھلیں گی اور یہ کہ وہ اپنے ماموں مامی کے ہاں پنجاب نہیں جایا کریں گی، مبادا وہ بھی اپنی والدہ کی طرح جاہل اجڈ نہ بن جائے...... کہیے، کہیے یہی وجہ ہے ناں آپ کی اس گریہ زاری کی۔“ سلیم الدین اپنے طور پر تو وجہ گریہ زاری جان چکے تھے اسی لیے چہرے پر اطمینان چھا گیا تھا۔ مگر شگفتہ نے اپنی بھیگی پلکوں سے معصوم شوہر کو دیکھا اور اب وہ باقاعدہ میاں کے گلے لگ کر مزید طوفانی انداز میں رونے لگیں۔

”او نہیں...... نہیں سلیم جی! ایسی کوئی بات نہیں میں تو خوش ہوں کہ کم از کم اماں ہوراں نے میری تی کو قبول تو کر لیا ورنہ تو میرا خیال تھا اماں جان نے میری بیٹی کو دیکھنا بھی نہیں۔“

تھوڑی دیر کے لیے شگفتہ خاتون نے سر اٹھایا...... ٹشو اٹھائے اور منہ صاف کیا اور پھر سلیم کے گلے میں بازو ڈال کر شدتوں سے رونا شروع۔

”اب! اب آپ ہماری برداشت کا امتحان لے رہی ہیں شگفتہ خاتون۔“

”او امتحان تو میرا شروع ہونے والا ہے سلیم جی......“

”شگفتہ خاتون، آپ کو کیا ہو گیا ہے، کس قدر مہمل باتیں کر رہی ہیں آپ کھل کر بات کیجیے ناں کیا مسئلہ ہے۔“

سلیم الدین نے اپنی حسین محبوب بیگم کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کیے تو شگفتہ نے ان کو دیکھا۔

”ہائے! قسمے تسی بڑے سوہنے او...... سلیم جی۔“ وہ پھر رونے لگیں سلیم الدین کھڑے ہو گئے۔

”اب اور نہیں شگفتہ خاتون آپ اس برسات کی وجہ بیان کیجیے۔“

”تو...... تو...... سنو فیر سلیم جی! بشریٰ خاتون کی پیدائش سے پہلے میں نے ایک وعدہ کیا تھا وہ بھی اپنے دل کی ساتھ...... اور...... اور سلیم جی اب وہ وعدہ پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے میں اس لیے رو پیٹ رہی ہوں۔“

اس کے بعد آنسوؤں کا ریلا کسی منہ زور سیلاب کی طرح ساری حدیں پار کر گیا۔

”اوہو بھئی شگفتہ! آپ بھی ناں مسلسل ہماری طبیعت کی خرابی کا اہتمام کر رہی ہیں۔ جلدی سے بتائیے۔ آپ نے کون سا وعدہ کیا تھا وہ بھی اپنے دل کے ساتھ جلدی سے بتائیے ورنہ ہمیں اختلاج قلب کا دورہ پڑ جائے گا۔“

”ہائے میں مر جاواں...... سلیم جی اللہ نہ کرے جی جو آپ کو کچھ ہو۔“

”تو پھر جلدی سے بتائیے آپ نے کیا وعدہ کیا ہے۔“

”وہ...... وہ...... سلیم جی! اماں ہوراں کو پوتے کی اتنی چاہت تو وہ چاہت میں تو پوری نہیں کر پائی۔ پر میں نے خود اپنے دل سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر اس بار بھی — میں اماں جی کی خواہش پر پوتا ان کی گود میں نہ ڈال پائی تو...... ان کا بیٹا واپس ان کی گود میں ڈال دوں گی۔“ بس یہ کہنا تھا کہ شگفتہ باقاعدہ بچوں کی طرح سلیم کے گلے لگ کر رونے لگیں۔ سلیم میاں پہلے تو شگفتہ کی بات نہیں سمجھے پھر انہوں نے سختی سے شگفتہ کو خود سے الگ کیا۔

”معلوم ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا مطلب ہے اس بات کا۔“

”ہاں! جی پاگل جھلی ہوں پر اتنی بھی نہیں کہ میں ایک ماں کے جذبات کو محسوس نہ کر سکوں۔ میں نے بشریٰ کی پیدائش سے پہلے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا بیٹا نہ ہوا تو آپ کو اماں ہوراں کو واپس کر دوں گی اور اب کر کے رہوں گی

آخر کو آپ اماں ہوراں کے کلے کلے پتر ہیں۔ بیٹا نہ ہونے سے ان کی نوابی نسل ختم ہو جائے تو...... تو یہ تو۔''

''شگفتہ بیگم میں تو آپ کو ایک معصوم سی سادہ سی خاتون سمجھتا تھا۔ مگر آپ کے شوخ چہرے کے پیچھے اتنی گہری سوچ ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم آپ کی اس قربانی میں، قربانی کا بکرا ہرگز نہیں بنیں گے۔ معذرت چاہتے ہیں۔ میری بیٹیاں ہی میرے بیٹے ہیں۔ شگفتہ بیگم آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟'' سلیم الدین نے شگفتہ بیگم کے سارے آنسو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیے۔

''آپ نہیں سمجھ سکتے سلیم جی اس لیے کہ آپ ماں نہیں ہیں نہ ہی عورت ہیں تو بھلا ماں کے جذبات کو کیسے سمجھ سکتے ہیں اور میں سمجھ گئی ہوں کہ ایک ماں کے کیا جذبات ہوتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کا ہاتھ واپس اماں ہوراں کے ہاتھ میں دے دوں تو مجھے سکون مل جائے گا کم از کم میں اماں جان کے لیے اتنا تو کر ہی سکتی ہوں ناں...... چلو اٹھو۔''

شدت گریہ سے شگفتہ بیگم کا چہرہ مزید حسین اور سرخ پڑ گیا تھا اور اسی حسن کے تو سلیم میاں دیوانے تھے مگر اس وقت وہ کس کرب سے گزر رہی تھیں اس کا اندازہ تھا ان کو...... ہر چند کہ وہ شگفتہ کی بات سے قطعی متفق نہیں تھے، تاہم ان کی تسلی کے لیے اٹھ کر والدہ کی خدمت حاضر ہو گئے۔ حمیدہ خاتون ننھی بشریٰ کو گود میں لیے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

''ہم، بشریٰ خاتون کو اپنی سوچ اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالیں گے یہ ہماری طرح ہوں گی۔ بالکل اپنی دادی کی طرح۔''

''تنک مزاج ہوں گی۔'' بظاہر اخبار کے مطالعے میں مصروف، علیم الدین کے کان بیگم کی باتوں پر تھے۔ شوہر کی نقطہ چینی پر حمیدہ خاتون نے انہیں گھورا پھر پروانہ کرتے ہوئے بشریٰ سے ہم کلام ہوئیں۔

''جی ہاں! ہماری بشریٰ بیگم۔ اپنی دادی جان کی طرح خوش مزاج ہوں گی۔ اپنا نوابی اور روایتی لباس بھی زیب تن رکھا کریں گی۔ اپنی دادی کی طرح نوابی رکھ رکھاؤ اور رسم و رواج کو ماتھے پر جھومر کی طرح سجائے رکھیں گی۔ اور اپنی دادی جان جیسی حسین ہوں گی۔''

''اف! یہ آپ کی خودستائی مار نہ ڈالے ظالم ہمیں۔ آپ کے اس جملے میں صیغہ ماضی اور صیغہ مستقبل ہے...... بیگم صاحبہ آپ حسین تھیں۔ بشریٰ حسین ہوں گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔'' بیگم کی تیز نگاہوں کی تپش سے بچنے کے لیے علیم الدین نے اخبار پھیلا لیا تھا سامنے۔

''ہونہہ! بشریٰ خاتون آپ اپنے دادا جان سے کہہ دیجیے، دادی جان ہم سے محو گفتگو ہیں۔ آپ اپنی چونچیا بند رکھیے۔''

''بشریٰ خاتون ہم آپ سے درخواست کریں گے آپ اپنی دادی کا حسن لے لیجیے گا۔ رکھ رکھاؤ رسم و رواج کی پاسداری لے لیجیے گا۔ مگر خدارا...... ان کی بد مزاجی اور تنک مزاجی ہرگز مت لیجیے گا۔''

''اپنی بات، بیگم کے کورٹ میں اچھال کر علیم الدین قریب تھا کھسک جاتے حمیدہ خاتون چنگھاڑیں۔

''کیوں! جی کیوں ہمارے مزاج کو کیا ہوا۔ ارے ہماری خوش مزاجی اور شوخ مزاجی تو خاندان بھر میں مشہور تھی۔ اور ایمان سے کہیے گا، آپ نے تو ہم سے شادی ہی ہمارے عمدہ مزاج کی وجہ سے کی تھی۔''

''درست فرما رہی ہیں آپ مگر شادی ہوتے ہی آپ کی شوخ مزاجی اور خوش مزاجی جانے کہاں کھو گئی کہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم بڈھے ہو گئے۔ وہ دونوں خواتین جن کو آپ خوش مزاجی اور شوخ مزاجی کہہ کر بلاتی ہیں ہمیں نہ مل سکیں۔ دیکھیے بشریٰ خاتون آپ نے اپنی دادی جان، خوش مزاجی اور شوخ مزاجی کی گلی سے ہرگز نہیں گزرنا...... البتہ آپ کے دادا جان کے بہترین مزاج خوش اخلاقی، بذلہ سنجی کے دروازے کھلے ہیں...... وہیں تشریف لے آئیے گا شعور آتے ہی۔''

PakiBooks.Site

علیم الدین نے بشریٰ کو گود میں لینا چاہا مگر حمیدہ خاتون نے جھپٹ لیا۔

''علیم الدین —— ابھی بشریٰ خاتون کی تعلیم و تربیت کا وقت ہے، ابھی ہمارا سبق باقی ہے جو ہم نے ان کو پڑھانا ہے۔ ہاں تو ہماری ننھی پری، اپنی والدہ کی زبان جس پر ان کو عبور حاصل ہے۔ ہرگز استعمال نہیں کریں گی ورنہ...... ورنہ دادی جان آپ سے خفا ہو جائیں گی۔''

اتنا لمبا لیکچر تھا اب ننھی پری بشریٰ کا بور ہونا تو بنتا تھا ناں اور اس بوریت کا اظہار ابھی وہ زور زور سے رو کر ہی کر سکتی تھیں سو شروع ہو گئیں۔ لیکچر کے خلاف احتجاج کرنے لگیں۔ چیخ چیخ کر رونے لگیں ان کے رونے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پٹاخا نما کوئی چیز ہوں گی۔

''ہائے! ننھی پری ہماری گڑیا...... چندا ہماری بٹیا کو کیا ہوا بھوک لگی ہے۔ ہم...... ہم ابھی چمنیا کو بلاتے ہیں آپ کے لیے تازہ دودھ بنا کر لائیں۔''

''اور حمیدہ خاتون، چمنیا خاتون سے کہیے گا۔ دو چار سکون طلب گولیاں بھی شامل دودھ کر دیں تاکہ چند گھنٹے سکون تو ملے ان کو آپ کے لیکچرز سے۔ لائیے ہم خود بہو بیگم کے پاس لے جاتے ہیں گڑیا کو۔''

''ہرگز! نہیں ہرگز بھی نہیں...... بشریٰ بیگم صرف ہماری گود میں رہیں گی۔ اور یہیں پلے بڑھیں گی۔ ہمیں اب اس گھر میں دوسری شگفتہ خاتون نہیں چاہیے۔ منیزہ تو ہمارے ہاتھوں سے نکل کر اپنے ننھیال کی ہو گئیں۔''

☆☆☆

''ملک جی! شگفتہ کا پھر فون آیا تھا۔ بڑی اداس ہو رہی ہے اپنی بچی کے لیے...... اور منیزہ کو دیکھیں کیسی خوش ہے یہاں ہمارے بچوں کے ساتھ۔'' ''بچی میرا تاں خود دل نہیں چاہتا کہ وہ یہاں سے جائے۔''

''ہاں! دل تو میرا وی نہیں چاہتا پر او...... سلیم دا وی فون آیا سی منیزہ کو چھوڑ جاؤ۔ شگفتہ بڑی اداس ہو رہی ہے۔ ایسا کرو تیار کر دینا میں خود جا کر چھوڑ آؤں گا اور چھوٹی کو بھی نہیں دیکھا۔''

''لو تسی وی ناں ملک جی، چھوٹی کو اویں دیکھنے چلے جانا ہے۔ اجے نے نہ شگفتہ کی شاپنگ کی، نہ نکی کے لیے کوئی زیور بنوایا۔ میں سوچ رہی ہوں ہم نے جیسے کڑے اپنی منیزہ کو ڈالے تھے ناں اس کی پیدائش پر ویسے ہی نکی بشریٰ کے لیے بنوائی ہوں۔ تے نال لے شگفتہ کے لیے جھمکے بنوا لیتی ہوں...... آخر نوابوں کی نوہ ہے۔ اب بندہ خالی ہاتھ جا کے بچی کو دیکھے گا تو اس کی سس تو ویسے بڑی کوئی بدمزاج تے لڑاکی سی عورت ہے۔ نجانے کیا باتیں بنائیں۔ آپ ایسا کرو تاں شگفتہ تے...... سلیم بھائی نو...... تسلی دا فون کھڑکا دو کہ چند دنوں تک آئیں گے۔ منیزہ کو چھوڑنے تے چھوٹی کو دیکھنے...... کی خیال ہے، ٹھیک کہہ رہی آں ناں!''

کمرے میں بکھرے بستروں اور کپڑوں کو تہ کر کر کے ہاجرا نے بڑی تفصیل سے اپنا ارادہ بتایا۔ اور رائے مانگی تو ملک صاحب فدا ہی تو ہو گئے تھے بیگم پہ۔ شوہر حضرات اس وقت بہت خوش ہوتے ہیں جب ان کی بیگمات ان کی ماں بہنوں کے لیے اچھے جذبات رکھتی ہیں اور خوش دلی سے کچھ کرتی ہیں...... اور ملک صاحب تو خوش نصیب ترین شوہر تھے۔

''او! صدقے جائیے۔ تواڈے خیال تو...... تے تواڈے توں وی۔ جیسا آپ کہو......'' اسی دوران اکبر دوڑتا ہوا آیا۔

''ابا جی! ابا جی...... تے امی جی۔''

''کی ہویا پتر سب خیر اے ناں۔'' ماں باپ گھبرا کر بولے۔

''اوہ! خیر کتھے ابا جی...... ! وہ پپوں نے منیزہ کو مارا ہے۔ وہ وچاری رو رہی ہے کہتی ہے۔ مجھے ابھی اور اسی وقت میرے گھر چھوڑ کر آؤ۔''

"فٹے! اس پتوں دا۔ جان نکالتی ہوں میں اس کی۔ ماں نے اپنی نند پر جان وارلی ہے اور نند پاپی پر۔ یہ پتوں نے ابھی سے ہونے والی پاپی کے بال نوچنے شروع کر دیے۔ ہیں ٹھہر ذرا توں پتوں۔" ہاجرا غصے میں باہر نکلیں تو دونوں ہی رو رہی تھیں۔

"مامی جی!" منیزہ ماں جیسی مامی سے لپٹ گئی۔

"ماں جی!" دوسری طرف پتوں آلپٹی...... ہاجرا نے دونوں کو بازو سے پکڑا، رنگین پائے والے بڑے سے پلنگ پر بٹھایا اور سمجھانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

"ہاں جی! پتر منیزہ جانا ہے ابا جی کے پاس دادی ہوراں کے پاس اپنی امی جی کول......"

"مامی جی! وہاں جانا بھی اچھا لگتا ہے...... ادھر رہنا بھی اچھا لگتا ہے۔ مجھے یہ گھر آپ ماما جی، اکبر بھائی، پتوں اور گائے بھینس ان کے کٹے کٹیاں بہت اچھے لگتے ہیں۔ یہ تنور بہت اچھا لگتا ہے۔ جس میں آپ روٹیاں لگاتے ہو، فیر دیسی گھی لگا کے دیتے ہو۔ بچی بڑا مزا آتا ہے۔ یہ سب چیز وہاں کیوں نہیں ہیں۔"

بڑا سا کچا صحن، جس کے ایک طرف تنور تھا۔ ایک طرف کچی مٹی کا بنا روایتی چولہا۔ قریب پڑی لکڑیاں اور گوبر بھی۔ ہینڈ پمپ بھی۔ بھینسوں کا ٹھکانا بھی، سب کچھ اس جگہ موجود تھا جو ایک دیہات کے گھر میں ہوتا ہے...... سادہ لوح ملک غیاث کو سادہ زندگی گزارنا پسند تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے پیسے کو زندگی کی کسی لگژری کے حصول کے لیے استعمال نہیں کیا تھا اور زندگی کا یہ سادہ انداز ہی منیزہ کو بھاتا تھا کہ یہاں آ کے جانے کا وہ نام نہ لیتیں۔ اسی لیے ہاجرہ اور ملک صاحب نے اپنے طور پر منیزہ کو اکبر کی دلہن بنانے کا اردہ کر لیا تھا۔ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

"امی جان! شگفتہ خاتون آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔" سلیم میاں شگفتہ کو محض اس لیے لے آئے کہ ہو سکتا ہے۔ شگفتہ کی یہ قربانی والدہ کے دل میں ان کے لیے جگہ بنا جائے۔ مگر حمیدہ خاتون نے مزید منہ پھلا لیا۔ بشریٰ کو جھولے سے نکال کر اپنی گود میں لے لیا۔ علیم الدین کتاب بند کر کے بیگم اور بہو بیگم کو دیکھنے لگے۔ دیکھیے میدان کون مارتا ہے۔

PakiBooks.Site

"امی! جان شگفتہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔" سلیم میاں نے پلٹ کر جو شگفتہ کو دیکھا تو بادل گرج چمک کے ساتھ برسنے کی پیش گوئی کے پیش نظر پریشان ہو کر دوبارہ گویا ہوئے۔

"حمیدہ خاتون! بہو بیگم آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ متوجہ کیوں نہیں ہو رہیں۔" علیم الدین کا لہجہ دھیما سہی آواز دبی دبی سہی مگر کچھ تھا ضرور کہ حمیدہ نے گہرا سانس لیا اور ایک سلگتی نگاہ شگفتہ پر ڈالی۔

"فرمائیے! بہو بیگم کیا اب ہمیں بولنے کے لیے آپ کو اپنی زبان بھی مستعار دینی پڑے گی...... کہیے کیا کہنا چاہتی ہیں۔ ان دو صاحب زادیوں کے بعد۔" بس اتنا سننا تھا کہ تھما ہوا سیلاب پھیلتا چلا گیا۔ اب حمیدہ خاتون کے پاؤں تھے اور شگفتہ خاتون کے ہاتھ۔

"میںوں! میںوں...... او...... میرا مطلب ہے اماں جان آپ مجھے معاف کر دیں اللہ کے واسطے معاف کر دیں۔" وہ ہچکیوں کے دوران بمشکل کہہ پائیں۔ علیم الدین سنجیدہ ہو گئے سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ بہو بیگم کس گناہ کی معافی مانگ رہی ہیں ساس سے۔ ایسی حیرت خود حمیدہ خاتون کو بھی تھی۔

"دیکھیے شگفتہ خاتون! آپ نے ہم سے ہمارا بیٹا چھین لیا...... ہم تڑپ کر رہ گئے آپ نے ان پانچ سالوں میں دو عدد پوتیاں ہماری گود میں ڈال دیں۔ تب بھی چپ ہیں۔ اب تیسری غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔" ساتھ ہی حمیدہ خاتون کے زخموں کی فصل بھی ہری ہو گئی ان کے آنسو۔ چھڑکاؤ کرنے لگے۔

"یہ...... یہ ہی تو وہ وجہ ہے اماں جان کہ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ اور...... اور میں آج آپ کو اپنا بیٹا واپس کرنے آئی ہوں۔" شگفتہ تڑپ تڑپ کر رو دیں۔ علیم الدین کھڑے ہو گئے، خود حمیدہ خاتون ششدر رہ گئیں۔

"مطلب کیا ہے آپ کا بہو بیگم!"

"اماں جان! میں جانتی ہوں آپ ماں ہیں اور ہر ماں کے ارمان ہوتے ہیں کہ اپنے بیٹے کے بیٹے گود میں کھلائے اُس کے وارث ہوں۔ مگر...... مگر میں ایسا نہیں کر سکی تو بشریٰ کی واری میں اپنے دل میں وعدہ کر لیا تھا کہ اب کی بار بھی لڑکی ہوئی میں آپ کو آپ کے بیٹے کا بیٹا نہ دے سکی تو...... تو...... آپ کو آپ کا بیٹا واپس کر دوں گی۔ یہ...... یہ پکڑیں اپنا بیٹا۔" غم سے نڈھال ہوتے ہوئے شگفتہ نے باقاعدہ سلیم میاں کا ہاتھ ان کی والدہ کے ہاتھ میں دیا تو...... لمحہ بھر کے لیے جیسے حمیدہ خاتون کو سکتہ ہو گیا، علیم الدین غصے اور حیرت میں سب دیکھتے رہ گئے۔

"بہو بیگم! یہ...... یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں ابا جی! اب میں اماں ہوراں کا پتر ان کو واپس کر دیا ہے۔ اب...... اب اماں جان آپ...... آپ جہاں چاہیں سلیم جی کی شادی کر دیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

اپنی آواز کی گونج میں شگفتہ تیزی سے اندر کی طرف بھاگیں، سلیم اور علیم الدین سکتے کی کیفیت میں اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔ دادی کی گود میں بشریٰ بیگم بھی احتجاجاً چیخنے لگیں تو حمیدہ خاتون گویا حواسوں میں واپس آئیں۔

"ان ہی قدموں پر رک جائیے بہو بیگم! خبردار جو ایک قدم بھی مزید بڑھایا ہو تو۔" حمیدہ خاتون کی آواز میں دھونس تھا حکم تھا۔ استحقاق تھا کیا تھا شگفتہ سمجھ تو نہیں پائیں۔ البتہ قدموں نے آگے بڑھنے والی گستاخی سے انکار کر دیا تھا وہ روتی ہوئی پلٹیں۔

"جی ماں جان......!" کئی آنسو دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

"یہاں آئیے شگفتہ خاتون۔ ہم ہمیشہ اپنے شوہر نامدار اور صاحب زادے سے کہا ہے کہ شگفتہ بیگم بہت چالاک...... معاف کیجیے عیار خاتون ہیں۔ مگر کون ہماری سنتا ہے۔ آج آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کے حسین معصوم چہرے کی اوٹ میں ایک چالاک شگفتہ چھپی بیٹھی۔ جس نے ایک ہی جست میں ہماری دشمنی کا دریا عبور کر لیا۔ ہمارا بیٹا ہمیں لوٹا کر خود عظمت کے پہاڑ پر چڑھ بیٹھیں اور ہمیں چیونٹی بنا ڈالا۔ آپ کیا سمجھتی ہیں ہم اتنے ہی گئے گزرے ہیں، ہمارا عقیدہ اتنا کمزور ہے۔ اللہ کریم پر ایمان نعوذ باللہ کمزور ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہیں۔ بھلے ہم زبان سے اول فول بک دیتے ہیں۔ وگرنہ ہمارا ایمان اللہ کی پاک ذات پر پختہ ہے۔ اگر ہمارے نصیب میں پوتے ہوئے تو...... آپ ہی ان کی والدہ ہوں گی۔ آپ ہماری بشریٰ خاتون کی والدہ ہیں۔ آئیے گلے لگ جائیے۔" حمیدہ بیگم نے باقاعدہ بازو پھیلا دیے تو شگفتہ بے یقین سی ہو گئیں۔ علیم الدین بھی بے یقینی سے بیگم کو دیکھ رہے تھے گویا یا تو وہ پاگل ہو گئی تھیں یا یہ خواب دیکھ رہے تھے۔

"اماں جان...... اماں جان!" شگفتہ خاتون ساس کے گلے جا لگیں اور رو دیں۔

"اماں جان! قسمے تسی بڑے چنگے او...... رج کے سوہنے تے من موہنے او...... اماں جان۔" ساس کے ہاتھ چومتے ہوئے شگفتہ خاتون رو دیں۔ سلیم میاں نے بشریٰ کی آڑ میں اپنے آنسو صاف کر لیے۔ وہ تو آج ڈر ہی گئے تھے کہ یہ دونوں خواتین ان کے ساتھ کیا کر دیں گی۔ سلیم میاں جہاں اللہ تعالیٰ کے مشکور تھے وہاں علیم الدین بھی اس جذباتی سین کے متاثرین میں شامل ہو گئے۔

☆☆☆

"ہائے! امی جان کتنی حسین ساڑھی ہے۔ دیکھیے تو اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی۔ کام ویسے کا ویسا ہی ہے۔ ذرا جو چمک میں کمی آئی ہو۔"

رقیہ بیگم اب بیٹی کی شادی کی تیاری کر رہی تھیں دوسری طرف بیٹے کی بری کا اہتمام بھی کرنا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ اپنا پرانا ٹرنک کھولے بیٹھی تھیں اسماء اور ثمینہ ماں کی شادی کے جوڑے نکال نکال کر دیکھ رہی تھیں۔ پر پل

کلر کی ایک کامدار ساڑھی ہاتھ میں لیے، اسماء کام کی تعریف کر رہی تھی۔

''ارے ہاں بھئی ہمارا دور بھی تو اچھا تھا۔ خاص لوگ، خاص سوچ، خاص کام۔ اب تو ہر چیز میں دھوکا ہے فریب ہے۔ خیر تم دیکھ لو جو جوڑے تمہیں پسند آ رہے ہیں نکال لو اور الگ کر کے رکھ لو، میں ڈرائی کلین کروا دوں گی۔'' رقیہ نے کھلے دل سے بیٹی کو آفر کی تو ثمینہ جو ابھی باہر سے آئی تھی ایک دم گھبرا کر آگے بڑھی۔ اسماء کے ہاتھ سے ساڑھی چھینی اور ماں کو دے دی۔

''اللہ نہ کرے امی جان اللہ نہ کرے کہ اسماء آپا آپ کے جوڑے کیوں لیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی زندگی دے اور...... اور آپ ہی پہنیں گی یہ سب جوڑے۔'' ثمینہ کو ماں سے عشق تھا وہ رقیہ سے لپٹ گئی۔

''ثمینہ! میری شہزادی میری گڑیا۔ میں اب اس عمر میں اتنے چمکیلے بھڑکیلے جوڑے پہنتی اچھی لگوں گی اور پھر ماں کی ہر چیز کی وارث اس کی بیٹی ہوتی ہے۔ میری جان...... تم، تم بھی دیکھو یہ، یہ فیروزی سوٹ دیکھو، یہ غرارہ دیکھو...... ارے یہ میرون ساڑھی تم پر بہت جچے گی۔ اٹھو...... ذرا پہن کر دکھاؤ مجھے۔'' رقیہ نے پیار سے ایک ایک جوڑا ثمینہ کے ساتھ لگا لگا کر دیکھا۔ اسماء شوخی سے ثمینہ کو دیکھے گئی مگر ثمینہ نے ناراض ہو کر منہ پھلا لیا۔

''امی جان مجھے کچھ نہیں چاہیے، مجھے صرف آپ چاہئیں۔ آپ۔'' وہ پھر ماں سے لپٹ گئی۔

''ٹھیک ہے امی جان! ثمینہ، تم امی جان کو لے لو اور میں امی جان کے سارے کپڑے لے لیتی ہوں۔ ہے ناں امی جان اور یہ جو گولڈ کی چوڑیاں ہے ناں یہ بھی آپ مجھے ہی دیجیے گا ثمینہ کو کچھ نہیں ملے گا۔'' اسماء شوخی سے ماں کے ہاتھ سے چوڑیاں اتارنے لگی تو ثمینہ کا سانس پھولنے لگا۔ وہ ہذیانی انداز میں ماں سے زور سے لپٹ گئی اسماء کو پرے دھکیل دیا۔

''آپا...... آپا...... آپ اتنی بری اور لالچی کیسے ہو سکتی ہو۔ میں آپ کو امی کے کنگن لینے نہیں دوں گی۔ مر جاؤں گی مگر نہیں لینے دوں گی۔''

''کیوں! تمہیں لینے ہیں تو بتاؤ ورنہ میں ہی لوں گی۔ تم امی رکھو میں یہ۔''

''آپا...... ! آپا۔'' ثمینہ ہسٹریک ہو گئی۔ پھولے سانس کے ساتھ وہ ماں سے لپٹی روئے گئی۔ رقیہ نے سرزنشی نظروں سے اسماء کو گھورا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے اسماء! جانتی ہو کہ وہ ماں پر کوئی کمپرمائز نہیں کرتی۔ پھر بھی...... جاؤ پانی لے کر آؤ۔ ثمینہ...... ثمینہ میری بچی...... ہوش میں آؤ۔ نارمل ہو جاؤ...... میں...... میں ہوں ناں اپنی بیٹی کے ساتھ...... اسماء کی مذاق کی عادت ہے۔ مذاق میں کہہ رہی تھی۔''

''کیوں...... کیوں! امی جان کیوں کرتی ہیں آپا ایسا مذاق مجھے وہم آتے ہیں...... وہ کیوں آپ کے کپڑے لیں گی کیوں آپ کی چوڑیاں لیں گی۔ اللہ نہ کرے اللہ نہ کرے میرے منہ میں خاک۔ آپ کو کچھ ہوا تو...... تو میں تو مر جاؤں گی امی جان آپ جیتی رہیں اللہ تعالیٰ میری زندگی بھی آپ کو لگا دیں...... امی جان۔''

ثمینہ کو ایسے ہی دورہ پڑ جایا کرتا تھا معمولی سی بات پر وہم آ جاتا وہ رائی کا پہاڑ بنا لیتی اور پھر وہ پہاڑ اس کی سانس کی نالی میں پھنس جاتا اور سانس اکھڑنے لگتی۔ ایسی کہ جان پر بن جاتی اور اس وقت ثمینہ کو سانس نہیں آ رہا تھا، آنکھیں پھیل رہی تھیں۔

''ثمینہ! ہوش میں آؤ، میں تمہارے پاس ہوں ناں کہیں نہیں گئی اور اب جب تک اللہ نے چاہا تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔''

''اور میں بھی۔ لو پانی پیو ڈرامے باز، مذاق کر رہی تھی۔ چھیڑ رہی تھی تمہیں اور تم...... ذرا ذرا سی بات پر جان پر بنا لیتی ہو اپنی بھی اور میری پیاری امی جان کی بھی۔''

اسماء نے ثمینہ کو پانی پلایا۔ رقیہ سے لپٹی تو رقیہ نے اسے غصے سے پرے دھکیلا۔

''اسماء! امت کیا کرو ایسی حرکتیں کتنی بار منع کیا ہے تمہیں۔ ایسی فضول باتیں کر کے مت طبیعت خراب کیا کرو اس کی، ننھی سی جان ہے۔'' ماں کی سرزنش پر اسماء نے گہری سانس لی۔ کپڑے سمیٹ کر ٹرنک میں ڈالے پھر ماں کے ساتھ آ بیٹھی دوسری طرح ثمینہ لپٹی ہوئی تھی ماں سے بڑی بڑی آنکھیں پھیلائے...... خوف زدہ سی ابھی بھی گہرے سانس لے رہی تھی۔

''یہی تو امی جان۔ یہ جو آپ کی ننھی سی جان ہے۔ نا آگے چل کر اس ننھی جان کو بڑے بڑے حالات فیس کرنے ہیں تو کچھ تو اس میں قوت مدافعت ہونی چاہیے ناں...... ورنہ...... حالات اسے کچل کر رکھ دیں گے۔ اس لیے میں اس کے ساتھ ایسی باتیں اور حرکتیں کرتی ہوں تاکہ یہ لڑے آگے بڑھے...... جواب دے...... مگر یہ آنٹی جھٹ جان پر بنا لیتی ہیں...... اور آپ ہمیشہ اس سائیکو......''

''امی جان! آپا نے سائیکو کہا۔'' ثمینہ پھر منمنائی۔ اسماء نے گھورا۔

''ہاں! کہوں گی سو بار کہوں گی سائیکو سائیکو...... تب تک کہوں گی جب تک تم بزدلی کے بھیانک پنجوں سے آزاد نہیں ہو جاتیں حالات سے لڑنے نہیں لگتیں۔ کیوں امی جان میں غلط کہہ رہی ہوں۔''

بات کرتے کرتے جہاں اسماء کا لہجہ بھیگا وہاں آنکھوں کے کنارے بھی نم ہو گئے۔ رقیہ نے اسماء کی پیشانی چوم لی۔

''نہیں...... ہرگز نہیں میری سمجھدار بیٹی کبھی غلط کہہ بھی نہیں سکتی۔''

''حالانکہ بہت ساری باتیں غلط کہہ جاتی ہیں۔''

''چپ میسنی۔'' اسماء نے ثمینہ کے سر پر چپت لگائی۔ ثمینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

''امی جان! آپ کو پتا تھا کہ ساجد نے کسی لڑکی کو پسند کر رکھا ہے تو آپ نے کیوں نہیں بتایا۔ چلیے ابا جان آپ کی بات نہیں سنتے تو آپ مجھ سے بات کرتیں۔''

عابد، ساجد کو اپنے فیصلے پر اڑا دیکھ کر سخت پریشان تھا کہ ہو گا کیا...... وہاں ظہیر صاحب کے کئی فون آ چکے تھے۔ شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں کبیر صاحب کی طبیعت خراب تھی۔ تو عابد نے ماں ہی کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔ تو وہ دکھ سے مسکرا دیں۔

''امی جان! میں نے کچھ پوچھا ہے بتائیے اب کیا ہو گا۔''

''ہونہہ! عابد بیٹا...... اس خاندان کی عورتیں خاندانی روایت کے مطابق سارے رشتے چلا اور نبھا رہی ہیں۔ ورنہ اختیار نامی کوئی شے ان کے پاس نہیں۔ شوہر بیویوں کو، بھائی بہنوں کو اور باپ بیٹیوں کو پاؤں کی جوتیاں بنا کر چلتے ہیں۔ میں نے ایک دن ساجد کی اس لڑکی کے ساتھ فون پر گفتگو سنی تھی اور اسی دن سمجھ لیا تھا کہ اب طوفان آیا کہ آیا۔ تمہارے ابا جان تو بات سنتے ہی طبیعت خراب کر لیتے ہیں ڈر کے مارے ان سے بات نہ کی۔ رہی تمہاری بات تو بڑے بیٹے تو والدین کے پر ہوتے ہیں۔ مگر میرے پروں نے مجھے ماں ہی نہیں مانا تو......''

''امی جان! بس کر دیں اب یہ جذباتی مکالمے۔ اب بتائیے کیا کرنا ہے میرا تو دماغ گھوم گیا ہے۔''

''ساجد کتنا ضدی کتنا ہٹ دھرم ہے وہ اپنے فائدے اور مفاد کے لیے کسی کی پروا نہیں کرتا وہ بچپن ہی سے سب جانتے ہیں۔ اس روز اس کی بات پر باپ کی طبیعت خراب ہو گئی اس کو احساس ہوا...... نہیں ہوا...... اس سے بات کرنا، اپنی بے عزتی کرانا ہے۔ میں تم بھی کسی کھاتے میں نہیں ہیں نجانے اس معصوم ثمینہ کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔''

صدیقہ بیگم کو ثمینہ کا زیادہ خیال آ رہا تھا۔ عابد الجھ کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔

''امی جان! کچھ کرنا ہو گا ناں کوئی مشورہ تو دیجیے ناں۔ ایسا کیا کیا جائے کہ ساجد، ثمینہ کے ساتھ کے لیے

تیار ہو جائے۔ وہ بتا رہا تھا کہ وہ لڑکی منیبہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ والدین سر پر نہیں تو بھابھیوں کو، کسی بھی ایرے غیرے سے اس کی شادی کر کے جان چھڑانا ہے۔ چونکہ ساجد منیبہ کو چاہتا ہے تو...... وہ......"

"میں...... میں بے بس تو ہر کسی کی مجبوری کو سمجھتی ہوں بیٹا! مگر اختیار میں کچھ نہیں، کیا کروں۔ یہ اگر گستاخی کر کے اس لڑکی سے شادی کر لیتا ہے تو ثمینہ کا کیا ہوگا، ثمینہ کو بھی چھوڑو، بقیہ تین رشتوں کا کیا ہوگا۔ نئے رشتوں کی بساط الٹ گئی تو پرانے رشتے بھی ختم ہو جائیں گے...... سمجھاؤ اپنے بھائی کو...... ورنہ......"

صدیقہ کی بات جاری تھی کہ عابد کے فون پر شکیل کی کال آ گئی۔ اس نے ماں کو دیکھا، وہ بے بسی سے گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔

"السلام علیکم! شکیل کیا حال احوال ہے۔"

"الحمد للہ سب خیریت ہے۔ تایا جان کیسے ہیں۔ امی جان نے بتایا تھا کہ ان کی طبیعت خراب رہی ہے۔"

"ہاں! ہارٹ پیشنٹ کا تو پتا ہے ناں...... ایسے ہی رہتے ہیں۔ خیر تم بتاؤ وہاں کیا چل رہا ہے۔"

"شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یار ہر روز شاپنگ اور اس وقت میں نے اس بات کے لیے فون کیا ہے کہ ثمینہ اور ساجد کا کارڈ تو صرف نکاح کا چھپے گا ناں۔ کیونکہ رخصتی تو ابھی نہیں ہے۔"

شکیل اپنی لے بولے جا رہا تھا، اس بات پر یک بارگی موبائل عابد کے ہاتھ میں لرز گیا۔ ماں کو دیکھا جو گہری سوچوں میں گم تھیں۔

"کہاں کھو گئے یار عابد! میں ثمینہ اور ساجد کے نکاح کی بات کر رہا ہوں۔ ابا جان پوچھ رہے ہیں کہ نکاح کے کارڈ چھپوائیں یا نہیں۔"

"نہیں!"

☆☆☆

"اسٹاپ...... اسٹاپ راہی...... خبردار جو تم نے ٹمی کو ہاتھ بھی لگایا۔ راہی...... راہی۔" روبیکا تیزی سے ٹمی کی طرف جاتے راہی کے راستے میں آئی مگر طوفان جب آتا ہے تو ہر رکاوٹ عبور کر لیتا ہے۔ اور چند ہی لمحوں میں گستاخ اٹھارہ سالہ بیٹی ٹمی کے سنہرے خوب صورت بال راہی کی مٹھی میں تھے۔

"تم...... تم...... خود کو سیل کر کے، میرے پاؤنڈز مجھے لوٹاؤ گی۔ ہاں یہ ہی بکواس کی ہے ناں تم نے...... ہاں یہ ہی بکواس کی ہے ناں۔"

راہی پاگل ہو گئے تھے غصے میں انہوں نے نہ دیکھا بیٹی ہے نہ دیکھا کہاں لگے گی۔ مارتے گئے۔ روبیکا درمیان میں آئی وہ بھی پٹی۔ مگر باپ بیٹی کا مقابلہ خوب تھا۔ باپ کے ہاتھ اور بیٹی کی زبان دونوں کو ہی اپنے اپنے فن پر عبور حاصل تھا۔

"ہاں ڈیڈ! میں نے یہ ہی کہا۔ اینڈ آئی ول۔ آپ مجھے چند پاؤنڈ کا طعنہ مارو گے تو...... مجھ سے وصول کرنا چاہو گے تو میں یہ ہی کروں گی ناں...... اینڈ لسن مجھے اب اس کچن ہاؤس میں نہیں رہنا۔"

"اوکے! تو تم اب اس گھر میں بھی نہیں رہو گی۔" راہی نے ایک زوردار تھپڑ اس کے ملائم گال پر جڑ دیا کچھ دیر کے لیے اس کے گال پر ان کے ہاتھ کی انگلیاں ابھر آئی۔ ٹمی منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف جھکی...... روبیکا چلائی...... اور راہی کو زوردار دھکا دے کر دیوار سے مارا ان کے سر میں چوٹ لگی۔ خون بھی نکلا مگر ماں بیٹی بے حسی سے دور کھڑی دیکھتی رہیں۔

"سنو! راہی اپنا یہ وحشی پن چھوڑ دو...... ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔" کارپٹ پر سر جھکائے بیٹھے راہی گہری سانس لے رہے تھے۔ انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرا خون سے بھر گیا۔ انہوں نے ماں بیٹی کو خونخوار نظروں سے

تھورا۔

"قتل کردوں گا تم دونوں کو، چھوڑوں گا نہیں...... روبیکا...... تم، تم...... اف۔" وہ غصے میں اٹھے تو سہی مگر پھر چکرا کر گر گئے۔ روبیکا آگے بڑھی۔ ثمی اپنا گال سہلاتی رہی پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"راہی! بلیڈنگ ہو رہی ہے، چلو کلینک چلتے ہیں۔" روبیکا نے ان کا بازو پکڑ کر انہیں اٹھانے کی کوشش کی۔ تو راہی نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ڈونٹ ٹچ می۔ مجھے معلوم ہے تم بیٹی کے ساتھ مل کر مجھے مار دو گی۔"

"بھاڑ میں جاؤ راہی۔ تمہارا یہ شک یہ غلط فہمی تباہ کردے گی تمہیں۔ چلو گاڑی میں کلینک چلتے ہیں۔ یہ لو...... ہیٹ کوٹ پہنو...... اٹھو۔"

روبیکا کا غصہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ آتا تیزی سے، اترتا بھی تیزی سے۔ راہی سے اس کی لو میرج تھی کوئی مذاق نہیں تھا۔ بس ایسے ہی راہی کی بدمزاجی سے ماحول خراب ہو جاتا تھا۔ راہی کو زخم میں سخت تکلیف تھی اس لیے اس نے روبیکا کی بات مان لی۔ وہ خوب پیک ہو کر نیچے آیا۔ سر پہ ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ روبیکا نے اس کا بازو پکڑ رکھا تھا کہ چکرا کر گر نہ جائے۔ دونوں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ثمی نے زوردار ہارن دیا۔ دونوں چونک کر مڑے۔ ثمی اپنا بیگ لیے گاڑی میں بیٹھی جا رہی تھی۔

"کہاں دفع ہو رہی ہے یہ...... اسٹوپڈ گرل۔"

"تم جب اسے جانوروں کی طرح پیٹو گے تو وہ بھی کچھ نہ کچھ ری ایکٹ تو کرے گی ناں۔ جانے دو جہاں جاتی ہے۔ آجائے گی دوستوں کے ساتھ غصہ شیئر کر کے۔ تم چلو گاڑی میں بیٹھو۔"

"مام! اپنے ہسبینڈ سے کہہ دو...... میں اس کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔" ثمی کے سرخ گالوں پر ابھی بھی باپ کی انگلیوں کے نشان تھے۔

"اوہ! کم آن...... ڈونٹ سے...... لائیک دس۔ جاؤ فرینڈز کے ساتھ چل کرو۔ غصہ اتر جائے تو آجانا۔"

"نیور...... نیور...... آئی ول ناٹ کم...... بائے۔" ثمی نے فیصلہ سنایا۔ باپ کے قریب سے گاڑی نکالتے ہوئے بریک لگائے شیشے گرائے...... اور چڑانے والے انداز میں کہا۔ "بائے ڈیڈ فار ایور...... بائے مام۔"



"ثمی! کم بیک ڈارلنگ کم بیک۔" روبیکا اس کی جاتی گاڑی کو جاتا دیکھ کر گیٹ پر بیٹھ کر رونے لگی۔ راہی نے آگے بڑھ کر جھٹکے سے اسے اٹھایا۔

"اس کا سوگ بعد میں منانا، پہلے مجھے ہاسپٹل لے چلو۔ بہت تکلیف میں ہوں، میں۔"

"بھاڑ میں جاؤ۔ نجانے کیسے بے حس ظالم باپ ہو تم۔ جوان بیٹی گھر چھوڑ کر چلی گئی اور تمہیں اپنی چوٹ کی پڑی ہے۔ ہٹلر کہیں کے۔"

"جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں روبیکا بیگم وہاں بیٹی کہیں بھی چلی جائے کہیں بھی رہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا...... تم بیٹھو سوگ مناؤ چابیاں دو میں خود ہاسپٹل چلا جاتا ہوں۔" راہی نے اس کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی چھینی اور گاڑی گیٹ تک لائے اتنی دیر میں روبیکا کو یا تو راہی کی بات سمجھ میں آگئی تھی یا راہی کا ساتھ دینا اخلاقی فرض سمجھا تھا۔

☆☆☆

"نہیں! ارے بھئی عابد کن خیالوں میں ہو ثمینہ اور ساجد کا نکاح صرف، رخصتی نہیں ہے۔ اس لیے ان کا کارڈ الگ چھپے گا ابا جان نے کہا ہے۔"

"ہاں، ہاں! تو چھپوالو...... ناں...... نہیں وہ میرا مطلب ہے ابھی رک جاؤ۔ باقی کارڈ تو ہم بھی چھپوا رہے

www.paksociety.com

...... ثمینہ اور ساجد والا معاملہ پوچھ...... وہ میرا مطلب ہے۔

"ہاں یار! عابد پاگل ہو گئے، اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو۔ کیا مطلب ہے...... ثمینہ اور ساجد کے نکاح کا معاملہ۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں۔" عابد اس کشمکش سے گھبرا چکا تھا۔ اس نے شکیل سے شیئرنگ کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں ہوٹل میں بیٹھے پریشان ہو رہے تھے۔

"تم نے سمجھایا نہیں...... یعنی کہ حد ہوگئی شادی اور ان کے نکاح میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ کہ ساجد میاں کو کوئی اور لڑکی پسند آگئی ہے...... ابا جان کو پتا چلا تو قیامت یقینی ہے۔"

"ارے! بھائی ہمارے ابا جان تو اس دن سے دل تھامے بیٹھے ہیں۔ اب ہوگا کیا۔" دونوں سر جوڑے بیٹھے مسئلے کا حل تلاش کر رہے تھے۔

"دیکھو شکیل! ایسا کرتے ہیں ہم دونوں ساجد سے بات کرتے ہیں سمجھاتے ہیں۔ اگر وہ ضدی لڑکا نہ مانا تو اس کی بات مان لیں گے۔" اپنی بات کرنے کے سے پہلے عابد نے شکیل سے نظریں چرائیں اور پھر کپ میز پر رکھا مگر شکیل کے ہاتھ میں پکڑا کپ غصے سے لرزنے لگے۔

"کیا! کیا...... یعنی کہ کیا مطلب ہے تمہارا۔ یعنی تمہارا مطلب ہے کہ ساجد کو اس لڑکی سے شادی کرنے کی اجازت دے دی جائے اور ثمینہ! ثمینہ کا کیا ہوگا۔ ہاں کیا سوچ کر تم نے یہ بات کہی ہے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ ثمینہ ساجد کا نکاح نہ ہوا تو کوئی شادی نہیں ہوگی۔ یار تم نے مجھے حیران کر دیا ہے۔"

شکیل کو اتنا غصہ آگیا تھا کہ اسے احساس ہی نہیں کہ وہ پبلک پلیس پر ہیں۔ وہ کھڑا ہو گیا عابد بھی گھبرا گیا اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"شکیل...... شکیل بیٹھ جاؤ۔ تحمل سے بات کرتے ہیں۔ میری بات کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ساجد کو اس لڑکی سے شادی کی اجازت دے دینی چاہیے۔ بلکہ دیکھتے ہیں کہ آیا ثمینہ میں ایسی کیا کمی ہے جس کی وجہ سے ساجد کسی اور لڑکی کی طرف...... وہ میرا مطلب ہے کہ۔" بات عابد کے منہ سے نکل چکی تھی اب اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بہن کے ذکر پر شکیل نے خوں خوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا عابد...... کیا، کیا کمی ہے، میری بہن میں لنگڑی اندھی ہے...... بدصورت ہے کیا...... نہ کیا کمی ہے۔ اس میں...... معصوم سی بچی ہے وہ ابھی...... پھر ایسی کون سی خرابی یا کمی ہے جو ساجد میاں کو تو نظر آگئی ہمیں...... نہیں آئی۔"

"نہیں شکیل میرے بھائی ایسی بات نہیں...... بس وہ ذرا زیادہ ہی سیدھی سادی رہتی ہے اور...... اور بیمار بھی تو......"

"ہاں تو کیا! بیمار رہتی ہے تو اس کا مطلب ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس سے شادی نہیں کرے گا۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ساجد کسی اور لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

"سچ مانو تو یہی وجہ ہے شکیل! اب کیا کریں ساجد تو کسی طور پر بھی ثمینہ کے ساتھ شادی کے لیے تیار نہیں۔"

عابد کے اعتراف جرم کے بعد شکیل پریشان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"کیا کریں اب۔" شکیل اور عابد پریشان بیٹھے سوچتے رہے کوئی حل نکالا جا سکے۔ پھر دونوں نے سب سے الگ ساجد کو ہر طرح سے سمجھایا۔ اس فیصلے کے بعد کے حالات...... نفع نقصان مگر ساجد تو گرفتار محبت ہو چکا تھا، کسی طور نہ مانا۔ عابد نے بذات خود منیبہ سے بات کی اچھی لڑکی تھی رونے لگی۔

”بھائی جان! میں تو خود ان سے کہتی ہوں کہ ثمینہ سے نکاح کرلیں۔“

”نہیں کروں گا میں اس پاگل سائیکو لڑکی سے شادی۔ تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی نہ کرو، مگر میں ثمینہ سے شادی نہیں کروں گا۔“ اور پھر یوں ہوا کہ ساجد کے انکار کا راز سب پر کھل گیا۔ کبیر صاحب تو پہلے دل پکڑے بیٹھے تھے۔ اب ظہیر بھی آپے سے باہر ہوگئے۔

”ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے بھائی آج سے سارے نئے رشتے ختم سارے پرانے رشتے ختم سمجھ لیجیے آپ کا کوئی بھائی تھا ہی نہیں۔“

اور وہ قیامت جسے روکنے کی عابد نے بہت کوشش کی آ کر رہی۔ ساجد ٹس سے مس نہ ہوا۔ بھلے باپ کو ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ وہ آئی سی یو چلے گئے۔ ظہیر صاحب بھی دل پر ہاتھ رکھے پھنکارتے پھرتے۔ پاؤں میں کانٹا چبھنے والا معمولی درد نہیں تھا کہ ذرا سی دیر میں ٹھیک ہو جاتا۔ نئے اور پرانے رشتے ختم ہو رہے تھے۔ باقی سب کا تو جو حال تھا۔ سو حال تھا۔ ان حالات کی اکلوتی وجہ ثمینہ تھی۔ سب سے چھوٹی سب سے حساس خاندان کی اس بے ضرر فرد کی وجہ سے خاندان بکھر گیا تھا...... اور بچپن سے جس شخص کو وہ چپکے چپکے چاہے جا رہی تھی وہ ہرجائی نکلا۔ ایک حساس سی نازک سی دمہ کی مریضہ کے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کو شدید دمے کا اٹیک ہوا۔

”امی! امی! جان...... آ...... آ...... آپا۔“

☆☆☆

آغا منزل میں دو مخالف پارٹیوں کی دو عورتوں نے ایک دوسرے کو تسلیم کیا کہ زندگی مسکرانے لگی۔ شگفتہ خاتون کی فرمانبرداری اور حمیدہ خاتون کا اللہ پر یقین اور تقویٰ اللہ تعالیٰ کو شاید اتنا پسند آیا تھا کہ بشریٰ خاتون کی پیدائش کے دو سال بعد ہی۔ کلیم اور وسیم جڑواں بھائی بن کر دادی کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حمیدہ خاتون بہو شگفتہ کو سر پر بٹھا لیتیں۔

”کیوں! کہیے...... حمیدہ خاتون اب تو آپ خوش ہیں دیکھ لیا ناں آپ نے کہ آپ نے پورے یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر توکل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو دو پوتوں سے نواز دیا، اب تو آپ کو شگفتہ بیگم کی قدر کرنی چاہیے۔“

”دیکھیے علیم صاحب! ہماری ایک جنگ تو تھی کہ پوتے نہیں ہیں۔ وہ تو پروردگار نے ہماری دعائیں ہمارے وظائف قبول فرما کر کلیم اور وسیم میاں نواز دیے...... مگر...... مگر۔“

اب وہ پھر چھکوں پھکوں رونے لگیں۔ علیم الدین نے حیرت سے ان کو دیکھا۔

”حمیدہ خاتون! جہاں آپ میں بہت سی خامیاں ہیں وہاں ناشکری آپ کی سب سے بڑی خرابی ہے یعنی کہ ابھی بھی بہو بیگم سے ساس بہو والی روایتی دشمنی...... حد ہے بیگم حد ہے۔“

”ارے! آپ سمجھتے کیوں نہیں، ہمارے نوابی خون میں ملاوٹ شگفتہ بیگم وجہ سے ہوئی۔ ہماری نسل بٹ کر رہ گئی۔ زبان ثقافت روایات سب بٹ گیا۔ ہماری خواہش تھی کہ ہماری بہو مگر آہ۔“ حمیدہ خاتون کا یہ دکھ تو اب قبر میں بھی ان کے ساتھ جانے والا تھا، مگر شگفتہ بیگم ساسوں ماں کو مسلسل خوش کر رہی تھیں کلیم اور وسیم کے بعد...... غفیر اور آخر میں زبیر دادی کی گود میں ہمکنے لگے تو گویا شگفتہ بیگم اب معتبر ہو گئی تھیں۔ زندگی بے حد حسین ہو گئی تھی۔ چار ننھے منے...... نواب زادے...... والد والدہ کی زبان و ثقافت کے امین ہو گئے۔ جیسے ان کو والد کی زبان پر عبور حاصل تھا۔ جیسے وہ والد کے لکھنوی انداز میں ڈھلے تھے...... ویسے ہی اپنی والدہ کی زبان اور روایات کی ادائیگی پر عبور رکھتے تھے...... اور...... اپنے پوتے اور پوتی منیزہ کی ان صلاحیتوں پر تو حمیدہ خاتون

کلیجہ تھام کر چلایا کرتیں۔

”ہمارے سلیم کی میاں کی نسل تیتر بٹیر بن گئی۔ ایسے میں سو فیصد ان کے رنگ ڈھنگ میں ڈھلی ننھی بشریٰ چلی آتیں۔ غرارہ پکڑے اپنے ہاتھ سے پان بنا کر دادی کے منہ میں رکھتیں بڑی بی کی طرح انگلیاں چاٹ کر گویا ہوتیں۔

”ارے! دادی جان آپ ہرگز بھی پریشان نہ ہوں۔ ان چاروں چھوٹے بھائیوں کو آپ ذرا سنبھلنے دیجیے پھر دیکھیے گا ہم کیسے ان کی تربیت کرتے ہیں کہ ایک دم لکھنوی بانکے بن جائیں گے۔“

”ہائے! ہم قربان اپنی ننھی پری کے، دیکھیے تو دلہن بیگم بشریٰ خاتون کتنی سمجھدار ہیں۔“

”ہاں چمنیا...... ایک یہ ٹکڑا ہی ہے۔ جس سے قلب حزیں کو قرار ملتا ہے۔ لیجیے چمنیا بیگم! یہ ہماری دلاری کا صدقہ ہے، فقیر کو دے دینا۔“

حمیدہ خاتون نے بٹوے سے سو روپے نکال کر چمنیا کو دیے تو چمنیا نے پان نگلتے ہوئے پیسے اپنے بٹوے میں منتقل کرلیے۔

”ارے! دلہن بیگم ہم سے بڑا فقیر کون ہے۔ اور پھر اپنی شہزادی کی بلائیں جب ہم ہر وقت اپنے سر لینے کے لیے تیار ہیں تو پھر کسی اور کی کیا ضرورت۔“

☆☆☆

ٹمی گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مگر جتنے پیسے لے کر نکلی تھی وہ تو دو روز بھی نہ نکال سکے۔

”میک! اب کیا کریں۔ آئی ڈونٹ ہیو منی......“

”اور! میرے پاس بھی نہیں ہیں کہ تمہیں آفر کرتا۔“

”تمہارے پاس کبھی ہوئے بھی ہیں۔ گیٹ اے سائڈ...... بیگر...... کم ٹمی شیئر۔“ جینی نے میک کو گھورا وہ جو ٹانگیں پھیلا کر سارے فٹ پاتھ پر لیٹا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جینی کے ہاتھ سے برگر جو وہ کھا رہی تھی۔ لینے کی کوشش کی اس نے ہاتھ پیچھے کرلیا اور ہاف کر کے ٹمی کو دیا جو اس نے بغیر کسی شکریے کے چھین لینے والے انداز میں پکڑا اور بڑی بڑی بائٹ لے کر کھانے لگی۔

”چھوڑو گی نہیں اس بڈھے راہی کو۔ مجھے فٹ پاتھ پر پھینکا ہے ناں میں......“ وہ آخری بائٹ لے کر ہاتھ مسل کر صاف کرتی کھڑی ہوگئی۔ جینی اور میک بھی کھڑے ہوگئے۔

”چلو، کلب چلتے ہیں۔“ میک نے آفر کی تو ٹمی اور جینی استہزائیہ انداز میں ہنسیں اور سرد رات میں فٹ پاتھ پر چلنے لگیں۔ چلتے چلتے وہ اپنے ہی جنرل اسٹور کے سامنے رک گئی۔ جینی اور میک بھی رک گئے اب ٹمی تو جانے کیا سوچ رہی البتہ میک نے جینی کو آنکھ دبا کر دیکھا اور ٹمی کے ساتھ آگے آگے چلنے لگا۔

”ٹمی! یو نیڈ...... منی۔“

”یس! آف کورس بٹ مائی مام، ڈیڈ نہیں دیں گے۔ جانتے تو ہو کک آؤٹ کرچکے ہیں۔“ ٹمی نے اپنے جنرل اسٹور کو دیکھا۔

”اوہ! کم آن! ٹمی یہ اتنا بڑا جنرل اسٹور تمہارا ہے ناں۔“

”آف کورس میرا ہے۔“

”تو! جاؤ اور جتنے چاہو...... پیسے چرا لاؤ۔“ میک کے مشورے پر ٹمی اور جینی دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے ہی اسٹور میں چوری۔

"آ... آ... آئی کانٹ انڈر اسٹینڈ... میک۔"

"ڈسلی گرل...! اندر جاؤ، فیک منی... اور پھر عیش کرو۔" اور پھر میک نے اپنی شیطانی چالوں میں ٹمی اور جینی کو بھی شریک کرلیا۔ اور اب ٹمی اپنے ہی اسٹور میں چوری کرنے کے لیے تیار تھی۔

"بٹ کی... کی... کیسے لاؤں گی؟" ٹمی نے اسٹور کی گلاس ونڈو سے سر جوڑ کر اندر جھانکا، منہ میں پانی آگیا۔ میک کا مشورہ اچھا لگا اور قابل عمل بھی مگر چابی کیسے حاصل کی جائے۔

"ارے! بھئی نو پرابلم اپنے گھر واپس جاؤ ڈیڈ سے سوری کہو اور نظر بچا کر کی لے اڑو... اینڈ دین... جاؤ ٹمی مزا آجائے گا۔ خوب ہلا گلا کریں گے۔ خوب کھائیں گے پئیں گے۔" جینی اور میک کے چل پروگرام نے ٹمی کو گھر کے گیٹ تک پہنچا دیا۔

"ٹمی مائی ڈارلنگ میری جان... آئی نو تم... تم ضرور آؤ گی۔ کم... کم... راحی، راحی دیکھو تو کون آیا... آئی ٹولڈ یو کہ ٹمی آجائے گی... ٹمی... ٹمی میری جان میری بیٹی۔"

راحی بستر میں پڑے تھے دل اداس اور بوجھل تھا اور جس کے لیے تھا وہ اب خود واپس آگئی تھی دل چاہا اٹھ کر باہر چلیں جائیں اور بیٹی کو سینے سے لگالیں۔ مگر راحی کو اپنا بھرم بھی بہت عزیز تھا۔

"سو! واٹ اس کو آنا ہی تھا۔ آ کر کوئی ماں باپ کے سر پر احسان نہیں کیا تمہاری بیٹی نے۔ جتنے پیسے اس کے پاس تھے۔ اس میں یہ دو تین دن ہی باہر گزار سکتی تھی۔ اب ایک بھگوڑی بیٹی کو ویلکم کرنے کے لیے میں آ نہیں سکتا۔" اکتایا لہجہ، غصہ دلاتے الفاظ ٹمی نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ہونٹ کاٹ لیے۔ ماں تو ماں ہوتی ہے...... بیٹی جا کر لوٹی تھی روبیکا اسی بات پر خوش تھی نہیں چاہتی تھی کہ بیٹی پھر جائے۔

"کم آن جانتی تو ہو اپنے ڈیڈ کی بدمزاجی...... چلو اندر کیا کھاؤ گی...... دو دن کہاں رہیں۔ جینی کے گھر یا مارتھا ہاؤس۔" روبیکا پیار سے اس کا ہاتھ تھامے اندر لاتے ہوئے بولے جا رہی تھی اور ٹمی باپ کی باتوں سے اپنے اندر اٹھتے شعلوں کو دباتی رہی کہ ابھی اسے کام تھا۔

"مام! اسٹاپ دس لیکچر لڑکی جب گھر سے نکل گئی وہ کہاں رہی کسی کے ساتھ رہی کیا فرق پڑتا ہے۔ انی وے میں اور جینی اس کے گرینڈ پا کے فلیٹ میں تھیں۔"

"اوکے...... اوکے...... بٹ یہ بہت بری بات ہے کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے انسان دوسرے کے گھر میں رہے۔ نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں کروگی۔ اوکے تمہارے ڈیڈ......"

"اوہ! کم آن مام مجھے ڈیڈ کے بارے میں بات نہیں کرنی۔"

"ٹمی! ہی از یور فادر۔"

"آئی نو مام...... اسٹور کی کی دیں۔"

"واٹ! اسٹور کی کا تم کیا کروگی۔"

"خود ابھی تو ڈیڈ نے کہا تھا کہ میں فضول گھومنے کے بجائے اسٹور کو ٹائم دوں۔ ابھی ڈیڈ اور آپ نہیں جا سکتے ہو تو مجھے کی دیں میں اور جینی دیکھیں گے۔"

جب انسان کی نیت اور ارادے ناپاک ہوں تو نظریں خود ہی دائیں بائیں ہو جایا کرتی ہیں۔ البتہ اس بات پر روبیکا حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی کہ جس بات پر اس نے باپ سے بڑی مار کھائی اب وہی کام کرنے

PakiBooks.Site

کے لیے خود آگئی تھی۔ ابھی ماں بیٹی میں بحث چل رہی تھی کہ راحی ٹھنڈ کے باوجود اٹھ کر آگئے۔ روبیکا اسے دیکھ کر بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر راحی کے سامنے لے آئی۔

"راحی...... راحی! میں نے کہا تھا ناں کہ اپنی بیٹی پر اعتماد کرو، دیکھو اب خود کہہ رہی ہے کہ اسٹور کی، کی دو وہ بیٹھے گی وہاں۔" اس اطلاع پر راحی نے بیٹی کو دیکھا وہ خودسری سے ویسے اکڑی کھڑی تھی۔ چہرے پر رعونت اور تناؤ تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں اسٹور میری ذمہ داری ہے میں خود سنبھال لوں گا۔ مجھے اس آدھی سے زیادہ انگریز لڑکی پر رتی برابر بھروسا نہیں۔ گو بیک۔" راحی، بیٹی کے جسمانی حرکات و سکنات سے ہی سمجھ گئے تھے کہ صاحب زادی کے ارادے کیا ہیں۔ ٹمی کو بہانہ چاہیے تھا چلانے کے لیے شروع ہوگئی۔

"دیکھا...... دیکھا مام! پھر آپ کہتی ہیں کہ ہی از مائی فادر مجھے ان کا خیال کرنا چاہیے۔ ان فیکٹ آپ لوگوں کو میری ضرورت ہی نہیں۔ چلی جاؤں گی۔ بٹ آپ کے اسٹور پر نہیں بیٹھوں گی۔ ہونہہ کیا پیرنٹس ایسے ہوتے ہیں۔ سیلفش۔"

وہ باپ کو گھورتی، پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی تو کافی بناتی روبیکا شوہر پر پل پڑی۔

"تمہیں پتا ہے راحی! تم ناں ٹوٹلی پاگل ہو چکے ہو۔ اتنی دولت آخر تم کس کے لیے جمع کر رہے ہو۔ دو دن کے بعد بیٹی گھر آئی ہے اور...... اور تم......"

"ہاں بیٹی تو گویا حج کر کے آئی ہے ناں مجھے تو اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنے چاہیے تھے۔ ہونہہ تم چونچلے اٹھاؤ اسی ناخلف بیٹی کے۔" خود صوفے پر کمبل لپیٹ کر بیٹھ گئے۔

"راحی! تم بہت ضدی ہو۔ کی دو ٹمی کو دو روز سے تم نے خود بھی نہیں اسٹور کھولا، نہ میں کھول سکی۔ اب ٹمی کو دو کی۔"

روبیکا کے اصرار پر راحی خاموش رہے۔ مگر اپنے کمرے میں اپنے نرم گرم بیڈ پر لیٹی...... ٹمی کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

"واؤ! مزا آگیا۔ اپنے لگژری روم تیری یاد بہت آئی جب میں جینی کے گرینڈ پا کے اسٹور نما چھوٹے سے روم میں لیٹی تھی۔ لیکن اگر ڈیڈ نے کی نہیں دی تو...... تو...... کیا چور کے لیے راستے بہت۔" وہ مختلف سوچوں میں گھری نرم گرم بستر میں جانے کب سوگئی۔ روبیکا اس کے لیے کافی لے کر آئی تو وہ بے سدھ سو رہی تھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیشانی پر ممتا کی مہر ثبت کی۔

"میری لڑاکی بیٹی اپنے مام ڈیڈ سے ہی لڑتی رہتی ہے۔ یہ راحی بھی تو بچوں کی طرح مقابلہ کرتا ہے اس کے ساتھ...... ڈونٹ وری مائی چائلڈ...... میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

گہری نیند میں سوئی بیٹی کے پاس بیٹھی کتنی ہی دیر اس سے باتیں کرتی رہی۔ پیار کرتی رہی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی جب وہ گہری نیند کی وادی کی سیر کو نکلے گی تو بیٹی اسٹور کی چابیاں لے کر اڑن چھو ہو جائے گی۔

"واٹ! میرے اسٹور میں چوری ہوگئی ہے۔"

☆☆☆

آغا منزل میں تو گویا وقت پر لگا کر اڑا تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کب کلیم وسیم غفیرا اور زبیر خوبرو جوان بن گئے۔

منیزہ کو اس کے ماموں مامی بڑے چاؤ اور ارمانوں سے بہو بنا کر لے گئے اور قلیم میاں نے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے ماموں کی بیٹی زہرہ کو کب نظر و دل میں بسایا اور دادی کی لاکھ مخالفت کے باوجود اپنے دادا اور والد کی رضامندی سے دلہن بنا کر لے آئے۔ اب حمیدہ خاتون جو گزرتے وقت کے ساتھ جسمانی اعتبار سے کمزور ضرور ہوگئی تھیں مگر دل اور دل میں مخصوص لوگوں کے لیے بغض و عناد بہو سے اختلاف موجود تھا۔ زہرہ جبیں بھی اپنی پھپھی شگفتہ کی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں۔

وسیم کے لیے حمیدہ خاتون اٹھ کھڑی ہوئیں کہ وہ خود پسند کریں گی۔ وسیم میاں نے سر تسلیم خم جو کیا تو دادی جان نے اپنی لکھنوی ایک سہیلی کی نواسی انیسہ خاتون کے نام کا سہرا وسیم میاں کے سر باندھ دیا۔ اور بشریٰ خاتون جو کہ حمیدہ خاتون کی انتہائی چہیتی پوتی تھیں۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے چچیرے بھیا کے بیٹے اچھن میاں کی بہو بنا دیا تھا اور اب بشریٰ خاتون ...... اپنے سیکنڈ لاسٹ بھائی غفیر میاں کے لیے اپنی نند گلشن جہاں کے لیے چکر پر چکر لگایا کرتیں۔ اب حمیدہ خاتون کے لیے اس سے زیادہ مقام مسرت کون سا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے تو جھٹ ہاں کر دی مگر علیم الدین جن کی دھان پان شخصیت پر وقت نے سوائے کمزوری کے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ اڑ گئے۔

"قطعی نہیں! گلشن جہاں ہمیں اپنے والد محترم کی طرح ایک آنکھ نہیں بھاتیں اور کیا ہم نے ہی ٹھیکا لے رکھا ہے...... اچھن میاں کے ٹوٹے پھوٹے لڑکیوں کو سہاگن کرنے کا۔"

"ابا جان! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں دیکھیں ناں اماں ہوراں نے میری گود ہی خالی کر دی...... پھر اپنے ایویں جئے کو جے جئے بھتیجے کو میری اتی سوہنی پیاری سی بشریٰ کو ویاہ دیا اور اب میرے نکے جئے۔ چوچے غفیر کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ مجھے وہ گلشن جہاں بالکل پسند نہیں۔"

اتنے عرصے کے بعد شگفتہ خاتون نے زبان کھولی وہ بھی اس لیے کہ ان کو اپنی ایک کزن کی بیٹی بہت پسند تھی۔ منیزہ کئی بار اس سلسلے میں چکر لگا چکی تھی۔ مگر حمیدہ خاتون نے ٹکا سا توڑ انکار کر دیا تھا۔ جس پر شگفتہ نے تو دل ہی دل میں ساسوں ماں کی عزت افزائی کی۔ البتہ سسر صاحب نے ان کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس پر حمیدہ اور خود بشریٰ خاتون تن کر کھڑی ہوگئیں۔

"کیوں! امی جان کیا مسئلہ ہے اور کمی ہے۔ گلشن جہاں میں ...... حسین ہیں۔ سرو قد ہے اور میٹرک بھی کر رکھا ہے اور لکھنوی کھانوں پر تو گلشن کو عبور حاصل ہے۔"

"ہائے! ہم صدقے قربان جائیں گلشن جہاں کے۔ اے ننھے میاں اور آپ کو کیا چاہیے۔ اتنے گنوں والی بہو مل رہی ہے۔"

"اے ننھے کی والدہ، ہم اتنے گنوں والی بہو سے نجات چاہتے ہیں۔ حمیدہ خاتون ہمیں معلوم ہے آپ اچھن میاں اور ان کی اولاد پر کیوں مہربان ہیں۔ ہمیں گلشن جہاں ہرگز قبول نہیں۔" علیم الدین اب تک اپنے ماضی کے رقیب کے حسد میں مبتلا تھے۔

"سلیم میاں! اپنے والد محترم کو سمجھائیے...... مردوں سے حسد کریں گے تو ان کا نقصان ہوگا۔ جل جل کر راکھ ہو جائیں گے۔"

"ابا جان! اماں جان ٹھیک کہہ رہی ہیں...... ماضی بھولنے کے لیے ہوتا ہے۔ بھول جائیے سب اور گلشن جہاں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیے۔"

"میاں! ہم کہہ چکے ہمارے طرف سے انکار سمجھا جائے۔" علیم الدین نے بیگم کو گھورا اور اخبار پھیلا لیا۔

"مجھے وی گلشن جہاں کے رشتے سے انکار ہے۔" وقت کے ساتھ ساتھ۔ چار بیٹوں کی ماں بن جانے کے

بعد شگفتہ میں بھی اعتماد آ چکا تھا انہوں نے ساس کے خوف کے پیچھے سے کسی بلی کی طرح جھانکا اور میاؤں کر کے انکار کر دیا۔ تو دادی کی گود میں پل کر بڑی ہونے والی دادی کی سوچ میں ڈھلی بشریٰ خاتون ماں کے سامنے علم احتجاج لے کر کھڑی ہو گئیں۔

''امی جان! آپ بلاوجہ کی مخالفت کر رہی ہیں گلشن جہاں ہماری بہت اچھی نند ہیں اور ہمیں بہت پسند ہیں اور......''

''او! بس کر...... کیسے وہ...... وہ کے حمایتیں کر رہی ہے اپنی نند کی۔ سلیم جی مجھے تو لگتا ہی نہیں۔ یہ کبوتری بھی میری بیٹی ہے۔ اماں ہوراں نے تو اپنا آپ اس کے اندر ٹکو ٹک بھر کے، اوپر سے ٹانکے لگا دیے ہیں کہ جو وی ہو۔ سو بات کی ایک بات غفیر میرا بڑا بھول سا بچہ ہے۔ میں انی کو چالا کو ماسی گلشن جہاں سے اس کا ویاہ نہیں کراں گی۔'' غفیر کی باری شگفتہ بیگم نے اپنا حق استعمال کیا تھا۔ جس کی حمایت علیم الدین بھرپور کر رہے تھے۔ تو سلیم الدین نے بھی شگفتہ کے حق میں ووٹ ڈال کر اپنی وفاداری کا ثبوت دے دیا تھا۔ کیا کیجیے اس غفیر میاں کے دل کا، وہ جانے کب بشریٰ خاتون کا بیگ سنبھال کر آتی جاتی، تیکھے نقوش والی گلشن پر آ چکا تھا۔ انہوں نے فیصلہ اپنی مخالفت میں ہوتا دیکھا۔ تو بشریٰ کے کان میں منمنائے۔

''آپا بیگم......! کچھ کیجیے ناں والدہ کو سنبھالیے ناں۔''

''آپا قربان جائے۔ آپ سکون میں رہیے۔ دلہن تو آپ کی گلشن جہاں ہی بنیں گی۔ کیوں دادی جان۔''

بشریٰ خاتون نے دادی کو پان بنا کر دیا تو انہوں نے اپنی سمجھ دار پوتی کی بلائیں لے لیں۔ اور پھر حسب سابق حمیدہ خاتون کی پارٹی، جو کہ بشریٰ خاتون کی شمولیت سے بہت مضبوط ہو چکی تھی اپنا بل پاس کروا کر رہی مطلب گلشن جہاں غفیر کی دلہن بن گئیں تو شگفتہ جہاں نے ماتھا پیٹ لیا۔



''پھپھی جی! حوصلہ کرو...... حوصلہ۔'' ان کی بڑی بہو زہرہ جبیں غیاث باجی کی لاڈلی۔ نے اپنی پھپھی کو حوصلہ دلایا۔

غفیر کی شادی کے بعد اب سب سے چھوٹے زبیر میاں کا رشتہ زیر بحث تھا۔

زبیر سب سے چھوٹے تھے مگر بڑے تیز طرار اپنی بات منوا کر دم لینے والے تھے۔ ان کو نہ والد کی طرف کی لڑکیاں پسند تھیں نہ ہی والدہ کے زرخیر علاقے کی گلاب کلیاں۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور یونیورسٹی میں ان کی کلاس فیلو تھی شہلا اور شہلا کسی مل اونر کی صاحب زادی، حسن تو تھا...... حسن زن کہیں زیادہ تھا۔ نخرے اتنے کہ پلٹ کر دیکھنا گوارہ نہ کیا تھا کبھی...... کسی کو خاطر میں نہ لانے والی تنک مزاج لڑکی زبیر کی پہلی اور آخری خواہش بن چکی تھی اور یہ خواہش اس وقت شدت اختیار کر گئی جب شہلا نے بھی لکھنؤ کے نوابی خاندان کے خوبرو بانکے کو اپنی پسندیدگی کی سند دے دی۔

☆☆☆

کبھی کبھی انسان اپنی خواہش کی تکمیل میں خواہش کے حصول میں اتنا خود غرض ہو جاتا ہے کہ اسے اس بات سے کوئی بھی فرق نہیں پڑتا کہ اس کے فیصلے سے کسی کی جان پر بنتی ہے یا جان جاتی ہے...... ساجد کسی پتھریلی چٹان کی طرح اپنے فیصلے پر جما ہوا تھا۔ دونوں گھرانوں میں گویا۔ صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ظہیر صاحب نے ثمینہ کی ساتھ بقیہ رشتے بھی توڑ کر، تاحیات تعلقات منقطع کرنے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ ہر کوئی دکھی اور بے بس تھا۔ کوئی کچھ کر سکتا تھا حالات کو نارمل کر سکتا تو ساجد کا اپنی ضد چھوڑ کر، معافی مانگ کر، ثمینہ سے نکاح کرنا تھا۔ کیا ماں کیا خالہ کیا۔ بھائی بہن کس کس نے اچھا برا نہ سمجھایا تھا۔ نتائج کی سنگینی کا ڈر وا دیا تھا مگر ساجد ٹس سے مس نہ ہوا۔

ساجد! ابا جان کی حالت نازک ہے۔'' عابد نے بے بسی سے کہا۔

''دیکھو بھائی...... مان جاؤ ابھی بھی وقت ہے ایسا نہ ہو۔ تم اپنی خواہش تو حاصل کر لو۔ مگر ابا جان کو تمہاری وجہ سے کچھ ہو گیا تو صدمہ پچھتاوا تمہیں کسی پل چین نہ لینے دے گا۔ ڈاکٹر ابا جان کے متعلق کچھ زیادہ امید نہیں رکھتے۔''

اس سارے لیکچر کے بعد بھی ساجد نے گہرا سانس لیا۔ سگریٹ سلگایا۔ گہرا کش لے کر کھڑکی کی طرف منہ کر کے بولا۔

''موت زندگی کا وقت مقرر ہے عابد بھائی! اللہ کے حکم سے سب کچھ ہوتا ہے...... اگر...... اگر اللہ نہ کرے ابا جان کا وقت آ گیا تو میرا ثمینہ کے ساتھ نکاح بھی ان کو روک نہیں سکتا۔''

''ہاں نہیں روک سکتا مگر جاتے جاتے وہ یہ سکون اور اطمینان تو ہمراہ لے کر جائیں گے ناں کہ ان کے بیٹے نے ان کی بات مان لی۔ اور بقیہ رشتے بھی برقرار رہے۔ دیکھو ساجد تمہاری ذرا سی قربانی......''

''ذرا سی بھائی! ذرا سی قربانی......!'' ساجد بھنا کر پلٹا جلتی سگریٹ ہاتھوں میں مسل ڈالی۔

''میری ہی محبت میری خوشیاں آپ کی نظر میں ذرا سی قربان کی حیثیت رکھتی ہے اور پھر میں ہی قربانی کا بکرا کیوں بنوں باقی سب اپنا فیصلہ کیوں نہیں بدلتے اور پھر میں کون سا...... دنیا کا آخری مرد ہوں کہ میں نے ثمینہ سے شادی نہ کی تو وہ......''

''مطلب! تم نے ثابت کر دیا کہ تم اتنے خود غرض ہو کہ تمہیں کسی موت سے بھی فرق نہیں پڑتا کس قدر بے حسی سے تم ابا جان کے لیے یہ بکواس کر رہے۔ میں تمہاری جگہ پر ہوتا تو ایسی لاکھوں محبتیں قربان کر دیتا ابا جان پر۔''

حالات بہت سنگین صورت حال اختیار کر گئے تھے۔ کبیر صاحب کومہ میں چلے گئے تھے۔ ثمینہ کو استھما کا زبردست اٹیک ہوا تھا۔ دیگر افراد خانہ دعاؤں میں لگے تھے۔ ساجد بے حسی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا...... یہ صورت حال دیکھ کر منیبہ نے بھی ساجد کو منع کر دیا تھا کہ وہ اتنے لوگوں کی ناپسندیدگی اور بد دعاؤں میں نئی زندگی کا آغاز کرنا نہیں چاہتی...... اس پر ساجد اور پاگل ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔ تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی نہ کرو...... مگر کچھ بھی ہو جائے میں اس پاگل سائیکو...... دائمی مریضہ ثمینہ سے شادی نہیں کروں گا۔''

یہ تو تھا...... ساجد کا فیصلہ...... لیکن انسان نہیں جانتا کہ وہ کس گمان میں کس بھول میں ہوتا ہے۔ اکڑ اکڑ کر زمین پر چلتا ہے...... غرور سے فیصلے کرتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ اصل فیصلے تو خالق کل کائنات کے ہوتے ہیں۔ انسان تو ہر وقت ہر گھڑی ہر بات کے لیے ایک ایک سانس کے لیے۔ اللہ رب العزت کی حکم کا پابند ہے محتاج ہے۔ اور اصل فیصلے تو ہمارے مالک کے ہیں اور یہ فیصلے بھی ہمارے حق میں بہتر اور بہترین ہوتے ہیں۔ اور ساجد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

منیبہ کے انکار بعد ہوا وہی جو اللہ نے چاہا تھا۔ کبیر صاحب کومہ کی حالت میں انتقال کر گئے تھے۔ اور ٹوٹے رشتے واپس اپنی جگہ قائم ہو گئے تھے۔ کبیر صاحب کی وفات کے تین ماہ بعد ہی نہ چاہتے ہوئے بھی...... ثمینہ باقاعدہ دلہن بن کر مسز ساجد بن کر اس کے کمرے میں سہمی بیٹھی تھی کہ دروازہ دھڑ سے کھلا...... ثمینہ کا سانس پھولنے لگا۔

☆☆

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

نادیہ احمد

نمک نا لاگی

اس کی آنکھ ابھی لگی تھی کہ اچانک ناگہانی افتاد سی زوردار اور نوکیلی شے چادر پہ آکر گری اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ایک تو مصیبت یہ بے وقت کی لوڈشیڈنگ نے عاجز کر رکھا تھا۔ جل کڑھ کر وہ چادر لیے چھت پہ چلی آئی تاکہ کم سے کم سکون سے سو تو سکے۔ کل کی بارش کے بعد موسم بھی زیادہ گرم نا تھا لیکن کمروں میں تو آگ برس رہی تھی۔ وہ بھی جب ایک کمرے میں ایک ایک خاندان بس رہا ہو تو ان حالات میں چھت اور چارپائی ہی عافیت نظر آتی ہے۔

چندھیائی آنکھوں سے اپنے اردگرد ٹٹولا۔ اوائل دنوں کے چاند کی مدہم سی روشنی میں چمکتی سفید سی شے کو اس نے یہاں وہاں دیکھتے اس احتیاط سے اٹھایا کہ کہیں یہ کوئی چھوٹا موٹا بم ہی نا ہو جو اس کے اٹھاتے ہی پھٹ جائے۔ مڑا تڑا کاغذ ایک پتھر پہ لپٹا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ تو کیا یہ کوئی رقعہ تھا جو کسی نے اسے رات کے اس پہر بھیجا تھا۔ اس نے جلدی جلدی سرہانے پڑا سیل فون اٹھایا اور اس کی روشنی میں چھت کا جائزہ لیا۔ کہیں بھی کوئی نہیں تھا۔ نا ہی ان کی چھت پہ نا پڑوس میں تو پھر آخر یہ رقعہ آیا کہاں سے......! وہ عجیب مخمصے کا شکار تھی۔ ایک تو نیند سے آنکھیں کھلنا مشکل ہو رہا تھا اس پہ سحری میں بس اب تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ دو گھڑی آنکھ لگانے کو ملی تو اس نئی مصیبت میں آپھنسی۔ سحری کے بعد بھی سونا نصیب نہیں ہوتا تھا کیونکہ ابھی کالج بھی کھلے ہوئے تھے۔

بہرحال اس نے ذہن میں اُمڈتی سب سوچوں پہ دو حرف بھیجتے فلیش لائٹ جلائی اور رقعہ پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ خط پڑھتی گئی اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور اس سے پہلے کہ پھیل کر بھینگی ہو جاتیں وہ جھٹ چارپائی سے اتری اور چھت کی گرل تک آکر نیچے صحن میں جھانکا۔ اندھیرے میں انمول کھڑا اسے دیکھ کر اب ہاتھ ہلا رہا تھا۔ یہ رقعہ اسی نے چھت کا نشانہ لے کر گرل سے اوپر پھینکا تھا اور اب نیچے کھڑا دھیمی آواز میں تصدیق کر رہا تھا۔ چاندنی کا دل کیا اسی پتھر سے سر پھاڑ ڈالے اس کا لیکن اس کی نئی نئی گستاخی کا سوچ کر ارادہ ترک کیا اور ہاتھ کے اشارے سے حوصلہ دیتی واپس اپنی جگہ پہ چلی گئی۔

''لو بھلا اس کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے دور میں اب اس رقعے بازی کی کیا ضرورت ہے''۔ جل کر کہتی وہ ایک بار پھر چارپائی پہ لیٹ گئی اور چادر تان لی۔

''میں بھلا کبوتر ہوں جو اس کے رقعے پہنچاؤں۔''

ایک بار پھر وہ غصے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور بڑبڑانے لگی۔ بہرحال جو بھی تھا کام تو اسے ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

''پکوڑوں میں نمک تھوڑا کم رہ گیا یا شگفتہ!''

دردانہ پھوپھو نے حسب عادت دبا کر افطار کرنے کے بعد آخری جملے میں سارے کیے کرائے پہ پانی پھیر دیا تھا۔ نئی چچی شگفتہ......! ارے وہی اپنے احتشام چچا کی دلہن جن کی شادی پہ پھوپھو کا لونگ گواچا تھا، نے اپنی الگ مزاجی کے باوجود فروٹ چاٹ پہ ہاتھ صاف کرتی دردانہ پھوپھو کو بس ایک نظر ناگواری سے دیکھا اور پھر ساتھ ہی مسکرا کر بات بنائی۔

''باجی روزے میں اوپر نیچے ہو جاتا ہے نا۔ کل آپ کے لیے اسپیشل کرارے والے پکوڑے بناؤں گی۔'' شگفتہ چچی کو اور کچھ آتا تھا یا نہیں پر دوسروں کو مرچیں لگانا خوب آتی تھیں لیکن اس گھر میں آکر انہوں نے سب سے زیادہ جس ایک بندی کی نفسیات کو سمجھنے کے بعد ان سے رابطے بنائے تھے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ گھر میں چھوٹی سی بات پہ تڑ کی باتڑ کی جواب دینے والی شگفتہ چچی، دردانہ پھوپھو کے سامنے بھیگی بلی بنی ہوتیں تو اس کی بس ایک وجہ تھی کہ خاندان کے سب لوگ ایک طرف اور دردانہ پھوپھو ایک طرف...... یعنی ایک پھوپھو سب پہ بھاری اور شگفتہ چچی نے بس اسی بھاری بھرکم نند سے دوستی بنائی تھی۔ اسی لیے ان کی ایسی باتوں کو پانی کی طرح پی جاتی تھیں۔

''ارے جیتی رہو۔ میں نے تو بس یونہی کہہ دیا۔ چاٹ تو ویسے تم نے خوب بنائی ہے۔ بھئی مزا آگیا۔'' ویسے میں رکنے کے لیے نہیں آئی۔ تراویح کے بعد گھر جاؤں گی۔'' پھوپھو نے ایک دم پینترا بدلا۔

''نہیں باجی بس آپ آج رک رہی ہیں۔ کیوں امی؟'' شگفتہ چچی نے دادی کو بھی شامل کر لیا اور دادی چپ...... ایک تو منہ میں کریم والے دہی بڑے اس پہ دردانہ پھوپھو کو روکنے کی التجا...... یا اللہ اب جائیں تو جائیں کہاں؟

''باجی سے کہیں نا آج یہیں رک جائیں۔ روز روز تو آنا ہوتا نہیں پھر اب آئی ہیں تو دو چار دن رک کے جائیں''۔ دادی نے جلدی جلدی پھلکیاں نگلیں لیکن چچی نے ایک کو تین چار دن میں بدل کر دادی کو بولنے کا موقع بھی نا دیا۔

''اب آئی ہو تو رک جاؤ۔'' مشکل سے بس یہی نکلا زبان سے۔ اچھی افطاری گلے پڑی ان کے۔

حالانکہ رمضان کے آغاز میں ہی ایک مشترکہ افطار کا اہتمام ہو گیا تھا جس میں دونوں بیٹیوں نے بھرپور شرکت کی تھی لیکن پھر وہی حسب عادت پھوپھو کے گلے شکوے...... ارے بھئی ہمارا کون ہے آگے پیچھے...... ہمیں تو کوئی پوچھتا ہی نہیں...... لوگوں کا میکا ہوتا آئے دن بلاوے آتے یہاں تو سر سے اتار دیا بس۔ میری ہمسائی اب تک چار افطار ڈنر کھا چکی ماں کی طرف...... ایک ایک بھائی نے الگ بلا کر دعوت کی اور ایسی ہی بہت سی شکایتوں بمعہ مثالوں کے ہر روز دادی یا کسی بھی بھائی بھابھی سے شکوہ معمول ہو گیا تو آج دادی نے بلاوا بھیج ہی دیا۔ پھوپھو تو جھٹ پہنچ گئیں۔ گھر میں



PakiBooks.Site

آج لوگ بھی اتفاق سے کم تھے۔ سب سے بڑے جاوید بھائی اور سردار چچا کی فیملی کو رضیہ پھوپھو نے اپنی طرف افطار پہ بلایا ہوا تھا۔ چند روز پہلے شگفتہ چچی گئی ہوئی تھیں دادی کے ساتھ۔ اس دن پھوپھو کو بھی بلایا تھا۔ دراصل رضیہ پھوپھو نے درخواست کی تھی وہ اکیلی ہیں تو روزے میں اتنا بڑا اہتمام نہیں کرسکتیں اس لیے سب کو دو حصوں میں تقسیم کر کے انہوں نے دو الگ دن افطار کروادی۔

''یہ امی...... ویسے باجی نے آپ کو نہیں بلایا؟'' پھوپھو اب ایک نئے موضوع کی طرف آگئیں۔ حالانکہ جانتی تھیں آج اگر دادی ساتھ چلی جاتیں تو رو رو کے ماں سے شکایتوں کا دفتر کھل جاتا جسے بیٹی کی ذرا پروا نہیں۔

''رضیہ نے مجھے بھی کہا تھا میں نے سوچا تم آرہی ہو نا۔ اسی لیے رک گئی۔'' لو جی دادی کو بھی ابھی اتنی صاف گوئی دکھانی تھی۔

''ہائے تو بھلا مجھے نا بلاتیں آپ...... چلی جاتیں بیٹی کے ہاں کھانے پہ۔ میرا کیا تھا میں نا بھی آتی تو کسی کو کیا فرق پڑ جاتا۔''

''ارے بھئی ہم کون سے اتنے اہم ہیں۔ جو ہماری خاطر دعوتیں چھوڑے کوئی۔'' پھوپھو کا میٹر اسٹارٹ ہوچکا تھا۔ دادی نے بے اختیار سر پیٹا۔ شاید یہ ان کے رکنے کی ٹینشن تھی کہ وہ اپنے تاثرات کو کنٹرول میں نا رکھ پائیں اور ان کی سنجیدگی سے پھوپھو نے اک نیا معنی اخذ کرلیا۔

''ہو تو آئی تھی ایک بار اس کی طرف اب روز روز بیٹیوں کے گھر جانا اچھا لگتا ہے کیا؟ کیوں شروع ہوجاتی ہے دردانہ بلاوجہ۔'' مجبوراً بات سنبھالتے دادی کو بھی فارم میں آنا پڑا۔ بہرحال پھوپھو کون سا ٹلنے والوں میں سے تھیں۔ شکل ایسی بنالی جیسے ہری مرچیں چبالی ہوں۔

''باجی کل نا میری امی عیدی لائی تھیں۔ آپ کے لیے بھی سوٹ ہے اس میں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔'' شگفتہ چچی نے بات سنبھالی۔

''ہائے چچی! دیکھو ذرا کتنی اچھی ہیں۔ بھئی ایسی ہوتی ہیں مائیں! عیدی بھی لائیں تو ساتھ میرے لیے بھی جوڑا۔'' پھوپھو کی بتیسی یوں باہر آئی کہ چچی اور دادی کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہوگیا۔

شگفتہ چچی تو سوٹ لینے جلدی سے کمرے میں کھسک گئیں البتہ دادی اب وہیں بیٹھی بس کھانس ہی سکیں کہ کسی طرح ہنسی رک جائے۔

''پہلی عید ہے نا اس لیے اہتمام سے آئی ہے۔ سب کے ہی جوڑے دیے ہیں انہوں نے۔''

پھوپھو جو بھاوج کے میکے کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں دادی کے اس جملے پہ بدمزا سی ہوگئیں۔ اسی وقت شگفتہ چچی جوڑا تھامے باہر آئیں اور پھوپھو کو پکڑایا۔

''یہ رنگ تو میں نے کبھی نہیں پہنا۔'' موڈ تو سب کے جوڑے سن کر خراب ہوا تھا۔ سوٹ کا معائنہ کرتے برا سا منہ بنا کر بولیں۔

''ہاں تو باجی اب پہن لینا۔'' سامنے بھی بہرحال شگفتہ چچی تھیں۔

''نہیں وہ باقی سب کے جوڑے کیسے ہیں۔ وہ دکھا دو شاید ان میں سے کوئی رنگ پسند آجائے مجھے۔'' دل کی بات زبان پہ آگئی تھی آخر۔

''سب کو کل ہی دے دیے تھے۔ رابعہ جاتے ہوئے رضیہ کا سوٹ لے گئی۔'' دادی نے تھکی مارتے بتایا۔

''اچھا تو سب نے اپنی پسند کے اچھے رنگ پہلے ہی رکھ لیے اور میرے لیے یہ چھوڑ دیا بے کار سا۔'' سوٹ اٹھا کر صوفہ پہ پٹختے پھوپھو نے اعلانِ جنگ کیا تھا۔ دادی تو دادی شگفتہ چچی بھی بوکھلا گئیں۔ ساری محنت غارت سمجھو۔

''باجی یہ تو امی سب کے نام لکھ کر لائی تھیں۔

دیکھیں اس پہ نام لکھا ہے اور امی نے تو خاص آپ کے لیے خریدا تھا۔ کہنے لگیں دردانہ کا رنگ صاف ہے تو ہلکا رنگ خوب کھلے گا اس پہ۔'' واہ رے چاپلوسی۔ چچی نے کیسے تیر نشانے پہ مارا تھا۔ اب تو دردانہ پھوپھو نہال۔ جھٹ سوٹ خود پہ لگائے دیکھا اور دادی اور چچی سے پوچھنے لگیں کہ بھلا کیسا لگ رہا ہے تو۔ لگ تو تیر اچھا ہی رہا تھا کہ پھوپھو تھیں ہی خوب گوری چٹی...... کچھ بھی پہن لیتیں سج جاتی تھیں۔

☆☆☆

مغرب کی نماز کے بعد سب صحن میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

''ارے چاندنی دیکھنا تو لگتا تمہارے امی ابو آگئے۔'' دادی کی آواز پہ چاندنی نے کمرے سے سر باہر نکالا۔ پھوپھو کے خوف سے وہ کمرے میں گھسی ہوئی تھی ورنہ اس وقت تو ٹی وی پہ رمضان اسپیشل ڈرامے دیکھ رہی ہوتی تھی۔ سب کے ساتھ وہ نہیں گئی تھی۔ جوتیاں پاؤں میں پھنسائی، سست روی سے چلتی وہ دروازے تک پہنچی۔ دروازہ کھولا تو انمول کھڑا تھا۔ ساتھ میں عالیہ (چاندنی کی امی) اور رابعہ چچی کے ساتھ باقی کی پلٹن یعنی ان کے بچے تھے۔ دونوں چچا وہیں سے تراویح کو نکل گئے تھے۔

''خالہ آئی ہیں۔ میں بھی کہوں یہ شور کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔'' انمول، نانی اور مامی کو سلام کرنے آیا تو دردانہ پھوپھو دیکھ کے شرارت سے جملہ کسا۔

''ہائے تو کیا میں شور کرتی ہوں؟'' وہ پیار لینے جھکا تو پھوپھو نے ایک زور کی دھپ لاڈ سے بھانجے کی کمر پہ ماری۔ ساتھ ہی ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے ہماری خالہ کی تو شان ہی الگ ہے نا۔ لاکھوں کے مجمعے میں پہچانی جاتی ہیں۔'' لو جی پھوپھو تو اب ہواؤں میں اڑنے لگی تھیں۔ بھانجے نے پھونک ہو بھر دی تھی۔ بہرحال وہ کچھ دیر بیٹھ کر واپس جانے لگا۔ عالیہ اور رابعہ بھی نند سے مل کر اب اپنے کمروں میں کپڑے بدلنے چلی گئی تھیں۔ انمول واپس جانے لگا تو دادی کے کہنے پہ چاندنی پیچھے دروازہ بند کرنے گئی۔ اچانک انمول نے پیچھے رک کر پورچ میں کھڑے چاندنی سے بات چیت کرنا شروع کردی۔

اب دادی اور شگفتہ چچی نے تو اس طرف دھیان نا دیا لیکن یہ منظر پھوپھو کی زیرک نگاہوں سے بچ نا سکا۔

''ارے امی! میں نے سنا ہے باجی انمول کے لیے چاندنی کا رشتہ مانگ رہی ہیں؟'' نگاہیں ان دونوں پہ ٹکائے انہوں نے بیٹھے بیٹھے ماں کی کمر میں کہنی مارتے ہوئے پوچھا۔ شگفتہ چچی کو بھی مسالے دار باتوں کا شوق تھا لہٰذا وہ بھی کان لگائے سننے لگیں۔

''ایسا تو کچھ نہیں بس رضیہ نے اتنا کہا تھا انمول کے لیے اپنے ہی گھر کی لڑکی لاؤں گی۔ باقی جو قسمت۔ چاندنی کا تو کوئی ذکر نہیں کیا۔'' دادی نے من وعن جو سچ تھا بیان کردیا۔

''لو تو بھلا یہ الگ سے افطاریاں آپ کو سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ بھائی جان کی تو باجی ویسے ہی بہت سگی ہیں۔ اب بیٹی بھی ان کی ہی لیں گی۔'' پھوپھو کہاں کی بات کو کہاں ملا کر اپنی ایک الگ داستان بنا چکی تھیں۔

''افطاری تو اس نے احتشام اور شگفتہ کی بھی الگ سے کی تھی۔ اب ان کے تو ابھی کوئی اولاد ہی نہیں...... تو بھی نا دردانہ کہیں سے بھی بات نکال لیتی ہے۔ پھر اگر وہ ایسا کر بھی دے تو یہ اچھا ہی ہے نا۔ اب تیرے اپنے تو دونوں بچے ابھی چھوٹے ہیں اور پر سے ہیں بھی لڑکے۔ تو لڑکی پیدا کرلے میں رضیہ کو کہوں گی انمول کے لیے بیس سال رک جائے اور بہن کی بیٹی لے لے۔'' دادی بھی ان کی ماں تھیں۔

اگلی پچھلی ساری ایک ساتھ پوری کرتیں خود نماز کے لیے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ پیچھے پھوپھو اور شگفتہ چچی خاموش بیٹھی رہیں۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد انمول

PakiBooks.Site

بھی چلا گیا تو چاندنی دروازہ بند کر کے بے دلی سے
ایک بار پھر چپل گھسیٹتی پھوپھو اور چچی کو دیکھ کر بناوٹی
مسکراہٹ کا تاثر دیتی اپنے کمرے میں جا گھسی۔
"مجھے تو لگتا ان دونوں کا چکر چل رہا ہے۔"
پھوپھو نے سرگوشی کے انداز میں شگفتہ چچی سے کہا۔
"ہاں باجی اب تو مجھے بھی لگتا ہے۔ آج کل
یہ انمول ہمارے گھر کے کچھ زیادہ ہی چکر لگا رہا
ہے۔" شگفتہ چچی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
"دیکھا...... تمہیں بھی ایسا محسوس ہوا نا۔ بیٹے کا
زور ہے ورنہ باجی بھی اپنے بہن، بھائی کی اتنی سگی
ہو جائے کہ ان کا بوجھ ہلکا کر دے۔ ارے بڑا جگر
چاہیے ہوتا ہے بھائی کی بیٹی کو بہو بنانے کے لیے۔"
پھوپھو اپنے خدشے کی شگفتہ چچی کی زبانی تصدیق پہ
ایک دم پھیل کر اب نئے جوڑ توڑ کرنے لگیں۔
"ہاں باجی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کل بھی
انمول رات ہماری طرف ہی تھا اور آدھی رات کو
جب لائٹ گئی تو صحن میں چکر کاٹ رہا تھا۔" شگفتہ
چچی نے ایک اور راز سے پردہ اٹھایا۔
"میں اب تین چار دن یہیں ہوں۔ تم دیکھنا
اس بھید کا تو پتا کر کے ہی جاؤں گی۔ ان شاء اللہ۔"
منہ پہ ہاتھ پھیرتے دردانہ پھوپھو نے فیصلہ کن
انداز میں کہا اور اپنا قیام ایک کی جگہ مزید کئی دن
تک بڑھا لیا۔

☆☆☆

انمول، رضیہ پھوپھو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ فوج
میں کپتان تھا اور ان دنوں اپنی چھٹیوں پہ گھر آیا ہوا
تھا۔ ننھیال میں سب کا ہی لاڈلا تھا تو دوسرے رضیہ
پھوپھو کا گھر بھی پچھلی گلی میں تھا لہٰذا اکثر وہ نانی کے
گھر پایا جاتا۔ ویسے تو وہ دردانہ پھوپھو کا بھی لاڈلا
تھا اسی لیے جب اس کی خواہش پہ رضیہ پھوپھو نے
بیٹے کو فوج میں بھیجا تو اس وقت سب سے زیادہ
واویلا دردانہ پھوپھو نے ہی مچایا تھا۔

"بھلا کوئی اکلوتی اولاد کو ایسے دور بھیجتا ہے۔
ارے انہیں تو پیسے بچانے تھے نا...... اسی لیے بیٹے کو
فوج میں بھیج دیا کہ جا اب مفت کی روٹیاں کھا۔"
پھوپھو نے آٹھ آٹھ آنسو بہاتے انمول کے جانے
کے بعد اپنے زریں خیالات کا اظہار کچھ ان الفاظ
میں کیا تھا اور اسی انمول کو بڑے ماموں کی بیٹی
چاندنی سے بات کرتے دیکھ کر انہوں نے چائے
کی پیالی میں طوفان مچا دیا تھا۔ شگفتہ چچی بھی اس
معاملے میں ان کی ہم خیال بنی ہوئی تھیں۔ اسی
لیے رات گئے تک دونوں نند بھابھی اسی سے متعلق
اظہار خیال کرتی رہیں۔ اب اگر دیکھا جائے تو
انمول اور چاندنی کے مابین کوئی معاملہ تھا بھی یا پھر
رضیہ پھوپھو کا ان دونوں کے رشتے کا کوئی ارادہ تھا
اس میں یہ دونوں بندیاں ہرگز اسٹیک ہولڈر نا
تھیں۔
دردانہ پھوپھو کے تو جیسے کچھ دیر پہلے اماں
نے کہا دو لڑکے تھے تو شگفتہ چچی کے آنگن میں ابھی
کوئی شگوفہ کھلا ہی نا تھا۔ اس طرح اصولی طور پر
انہیں اس سے کوئی فرق پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔
لیکن نا جی...... دردانہ پھوپھو کے ہوتے کوئی پھڈا نا
ہو اب یہ تو ہو نہیں سکتا۔ باقی شگفتہ چچی بھی ہم نوالہ
ہم پیالہ ہوئی چسکے لینے لگیں۔
صبح کالج کے لیے نکلتے چاندنی نے حسب
معمول تمام خواتین کو مشترکہ سلام کیا اور کیری بیگ
کندھے پہ لٹکائے باہر نکل گئی۔ پھوپھو کی رگ
جاسوسی اچانک ہی پھڑکی شگفتہ چچی کو کہنی مار کر وہ
ایک دم اپنی جگہ سے اٹھیں اور بلی کی چال چلتیں
چاندنی کے پیچھے دروازے تک گئیں اور چھپ کر
دیکھنے لگیں۔ گلی کے نکڑ تک پہنچ کر چاندنی رک گئی
تھی۔ اچانک دوسری طرف سے انمول کی گاڑی
آ کر رکی اور چاندنی جھٹ اس میں بیٹھ گئی۔ اس
کے بیٹھتے ہی گاڑی فراٹے بھرتی یہ جا وہ جا اور

دردانہ پھوپھو بھاگتی ہوئی گھر کے اندر...... چہرے
پہ فاتحانہ مسکراہٹ سجائے پھوپھو نے آنکھوں کی
آنکھوں میں شگفتہ چچی کو کمرے میں چلنے کو کہا۔
"کہا تھا نا میں نے ان کا چکر چل رہا ہے۔
دیکھو چوری پکڑ لی میں نے۔" اپنا ہاتھ آگے کرتے
انہوں نے شگفتہ چچی کے آتے ہی داد طلب نگاہوں
سے بتایا۔
"سچی باجی؟ کیا دیکھا آپ نے؟" ان کے
ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے شگفتہ چچی کچھ حیرت کچھ تجسس
کے ملے جلے جذبات لیے ان کے برابر بیٹھ گئیں۔
دردانہ پھوپھو نے مرچ مسالے لگا کر چاندنی کے
انمول کی گاڑی میں بیٹھنے کا قصہ سنایا۔
"ہائے تو کیا روزے میں ڈیٹ مارنے گئے
ہیں دونوں۔" شگفتہ چچی نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے پرکا
کو بنا ڈالا۔
اس کے بعد اگلا آدھا گھنٹہ دونوں کے
درمیان اسی موضوع کو لے کر کھسر پھسر ہوتی رہی۔
جس میں ملنے کی ممکنہ جگہوں کے علاوہ لانگ ڈرائیو
کے روٹس پہ تبادلہ خیال کے ساتھ رضیہ پھوپھو اور
عالیہ کے درمیان کی رقابت زیر بحث رہی اور اس کا
اختتام اس وقت ہوا جب انمول چابی گھماتا گھر میں
داخل ہوا۔ نانی سے کچھ دیر باتیں کر کے وہ جمائیاں
لیتا ان کے کمرے میں سو گیا اور چاندنی کے گھر
واپس آنے سے گھنٹہ پہلے اپنے گھر چلا گیا۔
شگفتہ چچی تو کچھ بدمزا سی ہوئیں کہ انہیں اب
پھوپھو کی بات پہ اعتبار نہیں ہو رہا تھا۔ اگر ان
دونوں کا چکر تھا تو پھر انمول فوراً ہی واپس کیوں آیا
اور آ گیا تھا تو چاندنی سے ملے بغیر چلا بھی گیا لیکن
دردانہ پھوپھو یہ ماننے کو راضی نا تھیں اور ٹھان لی تھی
کہ ان دو تین دنوں میں وہ ہر حالت میں ان کے
افیئر کا پتا لگا کر رہیں گی۔

☆☆☆

"کیا مسئلہ ہے اب کیوں فون کیا ہے
انمول؟" اپنے سیل فون پہ بات کرتی چاندنی کی
زبان سے انمول کا نام سن کر پھوپھو کے پاؤں
زمین نے جکڑ لیے تھے۔ دروازے کی اوٹ میں
چھپ کر وہ اب اس کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہی
تھیں۔ ارے اخلاقیات جائے بھاڑ میں اب
جاسوسی نام کی بھی کوئی شے ہے نا۔
"نہیں تم پلیز کل مت آنا...... میں خود چلی
جاؤں گی۔" چاندنی کچھ اکھڑے لہجے میں بولی۔
"اچھا تو کل پھر کالج ڈراپ کرنے کی آفر
ہو رہی ہے۔" دوسری طرف کی گفتگو خود ہی فرض
کرتے انہوں نے دل ہی دل میں چیخ کر کہا تھا۔
"بڑے کوئی فضول انسان ہو تم اور مطلبی
بھی۔" چاندنی اسے ہنستے ہوئے ڈانٹ رہی تھی۔
اب اس جملے کے پیچھے بھلا انمول کا کیا مطلب
ہو سکتا تھا یہ ایک اور راز تھا لیکن پھوپھو اس وقت
اس راز کی گہرائی ناپنے کے موڈ میں نا تھیں۔
"اچھا چلو ٹھیک ہے آ جانا۔ کرتی ہوں میں
کچھ بندوبست۔" چاندنی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا
اور کال بند کر دی۔ پھوپھو اس ساری یک طرفہ
ڈسکشن سے کچھ بھی سمجھ نہیں پائی تھیں لیکن پر عزم
تھیں کہ پتا تو وہ لگا ہی لیں گی۔

☆☆☆

"آ جاؤ کپتان صاحب! بڑے اچھے وقت پہ
آمد ہوئی ہے۔ آج نہاری اور لال روٹی منگائی ہے
کھانے میں۔" احتشام چچا نے انمول کو دیکھتے ہی
پرجوش سے انداز میں کہا۔
"بسم اللہ کریں ماموں! میں ابھی کھانا کھا کر
ہی نکلا ہوں۔" اس نے یہاں وہاں دیکھتے مسکرا کر
کہا اور پھر احتشام چچا کے زور دینے پہ ان کی ہی
پلیٹ سے دو نوالے کھا کر باہر نکل گیا۔
"چاندنی ایک منٹ میری بات سننا۔" وہ

ہاتھ دھونے جا رہی تھی کہ انمول نے دیکھتے ہی روک لیا۔ اسے سر ہلا کر آنے کا کہتے وہ خود باتھ روم میں چلی گئی۔ انمول چھت پہ تھا۔ چاندنی اوپر گئی تو دردانہ پھوپھو بھی ان کے تعاقب میں دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتی اوپر کو دوڑیں اور چھت والے کمرے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان کی باتیں سننے لگیں۔

''تم نے بات کی؟'' انمول کی آواز پہ کان لگائے وہ دم سادھے کھڑی تھیں۔

''بات بھی کی تھی اور تمہارا رقعہ بھی پہنچا دیا تھا۔ اتنا بڑا منہ بن گیا اس کا۔ نخرے تو پہلے ہی ساتویں آسمان پہ ہیں کمینی کے۔'' چاندنی تپ کر بولی ساتھ ہاتھ سے اشارہ کرتے منہ کا سائز بھی واضح کیا تھا۔

''یار تم سے اتنا چھوٹا سا کام نہیں ہوتا۔ کیسی کزن ہو تم؟'' انمول نے شکوہ کیا تھا۔

''ہیں، یہ دونوں کس کام کی بات کر رہے ہیں اور یہ کمینی کون ہے بھلا جس کے منہ کا سائز ڈسکس ہو رہا ہے۔'' پھوپھو حیران پہ حیران ہوتی عجیب کشمکش کا شکار تھیں۔ وہ تو ان دونوں کا افیئر کھوجتی پھر رہی تھیں یہاں تو کوئی تیسرا اپھڈا تھا۔

''ایسی ہی کزن ہوں میں۔ جتنا کر سکتی تھی کر چکی۔ اب تم تھوڑے کو بہت سمجھو اور میری جان چھوڑو۔ جان عذاب میں ڈال دی ہے قسم سے۔'' دونوں ہاتھ جوڑتے وہ تنک کر بولی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ پھوپھو کی تو جان پہ بن آئی۔ اب جو اگر وہ دونوں انہیں وہاں کھڑا دیکھ لیتے تو ان کا اپنا ہی تماشا بن جانا تھا۔ جس رفتار سے اوپر آئی تھیں واپسی کا سفر بھی اسی رفتار سے کیا پر اس بار دو کی جگہ تین اسٹیپ پھلانگنے کی کوشش میں دھڑام سے سیڑھیوں سے گریں اور سیدھی صحن میں کیچ آؤٹ ہوئیں۔

''ہائے اللہ میں مر گئی۔ میری کمر...... میرا پیر......'' وہ واویلا مچا کہ گھر کے سب لوگ پھوپھو کی وبقاء پہ ان کی طرف دوڑے۔ انمول اور چاندنی حیران پریشان چھت سے نیچے جھانک رہے تھے۔

''ارے دردانہ تو سیڑھیوں تک کیسے پہنچ گئی بھلا۔ ابھی تو ہمارے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔'' احتشام چچا نے حیرت کا اظہار کرتے سوال کیا۔

''ان دونوں کا چکر پکڑنے ان کے پیچھے گئی تھی چھت پہ۔ جانے کیا کھچڑی پکا رہے دونوں او... اکیلے میں۔'' درد کی شدت تھی یا اپنی ہار کا غم پھو... نے دل کی بھڑاس نکالتے انمول اور چاندنی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک ہاتھ سے کمر سہلا... دوسرے سے پاؤں دباتے وہ جل کر بولیں تو ا... ساتھ سب نے ہی چاندنی اور انمول کو دیکھ... دونوں کا ہی رنگ فق تھا۔

''ان دونوں کا کون سا چکر، کون... کھچڑی...... لگتا ہے دردانہ تیرے پاؤں میں نہ... سر پہ چوٹ لگی ہے۔'' عالیہ تو بیٹی کا نام سن... آگ بگولا ہو گئیں۔ یوں اب سگی پھوپھی... لگائے گی تو باہر والے جانے کیا سے کیا کر دیں۔

''لو بھلا مجھ پہ بگڑ رہی ہیں۔ بیٹی پہ قابو نہیں... دو دن سے انمول اسے کالج چھوڑ رہا ہے۔ پتا... ہے آپ کو؟'' پھوپھو نے ایک اور بھید کھولا... چاندنی نے کھا جانے والی نظروں سے انمول... دیکھا لیکن اس پل وہ نہیں جانتی تھی عالیہ کی نگا... بھی خوں خواری اس کو گھور رہی ہیں۔

''ہاں تو کیا ہوا۔ انمول کوئی پرایا ہے۔ مل... ہوگا باہر تو چھوڑ دیا کالج۔'' دادی نے بات سنبھال...

''ڈھک لو ڈھکن پوتی اور نواسے پہ ا... چاند نکلے گا تو کل عالم دیکھے گا، میں کہے دیتی ہو... ان دونوں پہ نظر رکھو۔'' پھوپھو کون سا رکنے والو... میں سے تھیں۔

''اللہ کا خوف کریں خالہ! کون سا چکر؟ کون سا چکر...... میرے اتنے برے دن نہیں آئے جو اس انگلی ہلی سے چکر چلاؤں میں۔'' سب اسے بچوں کی طرح دیکھ رہے تھے کب تک خاموش رہتا۔ اور بول ہی پڑا لیکن چاندنی کو تو جیسے پتنگے لگ گئے۔

''آئے ہائے تو کیا میرے برے دن آئے ہیں جو تم جیسے لنگور سے افیئر ہوگا میرا؟ شکل دیکھی ہے اپنی۔ کیپٹن کیا بن گیا خود کو ہیرو سمجھ لیا ہے۔ کھولوں ابھی تمہارا پول؟'' وہ چمک کر بولی تو انمول نے آنکھوں ہی آنکھوں میں معذرت کرتے روکا۔

''چاندنی، انمول...... جلدی بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے؟ دردانہ کو ایسا کیوں لگا اور تم دونوں اتنے دن سے کیا کھچڑی پکا رہے ہو؟'' احتشام چچا نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ جو بھی تھا بات کی تہ تک پہنچنا ضروری تھا۔ ورنہ جانتے تھے پھوپھو ایک کی دس کرتی آگے پہنچائیں گی۔

''ماموں! وہ دراصل چھٹی سے پہلے میری اپنے آفیسر سے منہ ماری ہو گئی تھی۔ بات چھوٹی سی تھی لیکن بس آپ کو تو پتا ہے افسری سر پہ سوار ہو تو دماغ خراب ہو جاتے ہیں۔ میں نے معافی مانگی پر اس نے قبول نہیں کی۔ لیکن مجھے اپنے ذرائع سے پتا چلا تھا کہ شکایت اس نے آگے نہیں پہنچائی۔ اس کی بہن چاندنی کی کلاس فیلو ہے تو میں نے چاندنی سے کہا اس سے میری سفارش کر دے کہ وہ اپنے بھائی سے میرے لیے نرم رویے کا کہہ دے۔''

ڈرتے ڈرتے انمول نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی تھی۔ وہ رقعے والی بات بھی بتا دی جس میں اس نے ساری بات لکھ کر چاندنی کے ذریعے اس کی سہیلی کہکشاں کو بتائی تھی اور اپنا رینک اور نام وغیرہ کی تفصیلات بھیجی تھیں۔ اسی چکر میں وہ دو تین دن سے روزانہ اس کی منت سماجت کر رہا تھا کہ وہ اپنی سہیلی پہ دباؤ ڈالے اور پھوپھو دردانہ نے اس مسئلے کو کیا سے کیا بنا ڈالا جبکہ اس چکر میں اپنی ٹانگ اور کمر الگ تڑوا بیٹھیں۔

''ایسے مسئلوں میں ٹانگ اڑائے گی تو ٹوٹے گی بھی۔ میں تو کہتا ہوں اچھا ہوتا اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹتیں۔ چار دن سکون سے تو رہتے ہم۔'' سارا بھید کھلنے پہ جب سب اپنے اپنے کام کاج پہ واپس لگ گئے تو سامنے بیٹھے احتشام چچا نے جل کر کہا۔ صد شکر معاملہ وہیں ختم ہو گیا تھا ورنہ رضیہ پھوپھو کی ناراضی بھی برداشت کرنا پڑتی۔ دادی اور چچا نے انمول کو منع کر دیا کہ انہیں کچھ نا بتائے۔

''دفع ہو منحوس...... بددعائیں دے رہا ہے کم بخت۔'' پھوپھو نے بھی جوابی وار کیا۔ وہ اب تک بیٹھی اپنی ٹانگ دبا رہی تھیں۔ رابعہ اور شگفتہ چچی ہنسی دباتی اندر چلی گئیں۔ احتشام چچا جلے کٹے منہ موڑے بیٹھے تھے تو پھوپھو بھی اب ان سے بات نہیں کر رہی تھیں۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو پھوپھو کو ہی ہول سا اٹھنے لگا۔ پلٹ کر دادی کو دیکھا اور منہ ان کے کان کے قریب کرتے بولیں۔

''ویسے امی! باجی کا ارادہ تو ہے نا چاندنی اور انمول کی شادی کا؟'' پھوپھو کو اس حال میں بھی چین نہیں تھا۔ ایک بار وہی قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔

''بس کر دے دردانہ! بس کر دے...... کیوں ہر وقت فساد کے بہانے تلاش کرتی رہتی ہے۔'' دادی نے جھڑکتے پھوپھو کو خاموش کرایا۔ وہ بس اپنا سا منہ لیے بیٹھی رہ گئیں۔ جاسوسی کا شوق تو سیڑھیوں سے گر کر پورا ہو ہی گیا تھا، گپ شپ پہ بھی پابندی لگ گئی۔ اب بھلا مسالے دار چٹخارے دار باتوں کے بغیر یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔

''لگتا ہے کوئی نیا ٹاپک سوچنا ہی پڑے گا گوسپ کے لیے۔'' دکھی سا منہ بنائے پھوپھو نے سوچا تھا۔

☆☆

www.PakiBooks.site

ناولٹ

مجھ سنگ نیناں لڑا گئے

قرۃ العین سکندر

وہ کچن میں برتنوں کے ڈھیر سے نبرد آزما تھی۔ تفکرات کی لکیریں ماتھے پر جیسے سلوٹیں نقش کر گئی تھیں۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھے۔ جبکہ اس کی برتنوں کی اٹھا پٹخ باہر دادی جان بھی سن کر اپنے اندر اٹھتے ہوئے جوار بھاٹے کو اپنے اندر ہی ٹھنڈی سانسیں لے کر تحلیل کر رہی تھیں۔ ابھی اگر طوبیٰ کہیں ان کے بالکل قریب کھڑی ہوتی تو وہ ہوتی اور دادی ہوتیں۔ ابھی بھی دادی جان کی عقابی نگاہیں کچن کی جانب ہی مرکوز تھیں۔ یوں جیسے ہی طوبیٰ کچن سے باہر نکلے گی وہ اسے آن کی آن میں دبوچ لیں گی۔ برتنوں کا ڈھیر دھو کر فارغ ہو کر طوبیٰ طمطراق سے باہر نکلی تھی۔ چہرے پر روٹھے پن کی گہری چھاپ تھی۔

''ادھر آؤ ذرا۔'' دادی نے خشمگیں نگاہیں اس کے چہرے کے بگڑے زاویے پر مرکوز کرتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ وہ چار و ناچار رک کر دادی کے پاس وہیں تخت پوش پر ایک جانب ٹک سی گئی تھی۔

''دیکھو بیٹا کاہے کا غصہ، میں جانتی ہوں کہ تم اپنی تمام چیزوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہو۔ مگر انسان کو چاہیے کہ وہ مہمان کی توقیر کرے۔ وہ بچہ چند دن کے لیے آ رہا ہے۔ وہ بھی میرے بصد اصرار پر۔'' وہ اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔ ہمہ تن گوش تھی۔

''جانتی ہو، جب میں اور اس کی نانی چھوٹے تھے تو ہماری محبت اور بہناپے کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ وہ تو میرے نصیب میں جدائی رقم تھی۔ پردیس میں آ پڑی۔ لاہور سے کراچی تک کا یہ سفر طے کرنے کے بعد یہیں کی ہو رہی۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے۔ جب میری گڑیا اور اس کے گڈے کی شادی تھی۔'' دادی جان جیسے ماضی میں کھوسی گئی تھیں۔

''جی، جی سب معلوم ہے۔ آپ کی گڑیا نے عنابی رنگ کا غرارہ زیب تن کیا تھا۔ گڈے نے سرمئی رنگ کا کرتا پہن رکھا تھا۔ سکھیوں نے اپنی ہی انگلیاں دانتوں تلے داب لی تھیں، اس دن میٹھے پکوان بنے تھے اور خوب یادگار شادی تھی۔ اتنی یادگار کہ بس۔'' وہ بالکل زچ ہوئے بیٹھی تھی۔ تب ہی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع مل گیا تھا۔ دادی نے اس کی تضحیک آمیز انداز اپنی عینک کی اوٹ سے گھورا تھا۔ پھر دو تین دھمو کے اس کی کمر پر رسید کیے تھے۔

''ارے کم بخت زبان چلاتی ہے دادی کے سامنے۔'' دادی کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ طوبیٰ کی کراہ نکل گئی تھی اور آنکھیں لبالب پانیوں سے لبریز تھیں۔

''ہونہہ جا رہی ہوں کمرہ خالی کرنے۔ منحوس مارا خدا کرے راستے میں ہی ایکسیڈنٹ ہو جائے اس کا۔''

آخری جملہ اس نے نسبتاً ہلکی آواز میں ادا کیا تھا۔ وہ بھی جاتے جاتے ورنہ دادی جان کی شامت دوبارہ آ جاتی پھر اس نے کمرے میں آ کر اپنے کمرے کا جائزہ الوداعی نگاہوں سے لیا تھا۔ وہ ایک نفیس طبیعت کی مالک لڑکی تھی۔ جسے اپنی ایک ایک شے سے محبت تھی۔ یوں مہینہ بھر کے لیے اپنے ہی کمرے میں کسی اور کی حکومت اور اپنے ہی حقوق سے دست برداری اسے قطعاً قبول نہ تھی۔ مگر دادی جان کی

PakiBooks.Site

دیرینہ سہیلی حنا بیگم کا نواسا یہاں اپنے ایک تھیسس کے سلسلے میں آرہا تھا۔ اسے اپنے پروجیکٹ کا مطلوبہ مواد یہیں درکار تھا۔

تھیسس کے لیے اسے کراچی میں تمام مقامات کی سیر کرنا تھی۔ تمام اہم نکات کو اپنے تھیسس میں زیر بحث لانا تھا۔ سارا مسئلہ اس شخص کی پرائیویسی اور تنہائی سے لے کر خاموشی تک کا تھا۔ اسے مکمل یکسوئی درکار تھی طوبیٰ کا کمرا اوپر بالائی منزل پر تھا جبکہ نیچے صفورہ بھابھی کے لاڈلے سپوت ہر وقت چوں چاں کرتے ادھر ادھر منڈلاتے دھینگا مشتی کرتے پائے جاتے تھے۔

صفورہ بھابھی کا اپنا ہی واویلا کم نہ ہوا کرتا تھا۔ وہ کچن میں کام کم اور زبان زیادہ چلاتی تھیں۔ صبح سویرے ہی ان کی کترنی شروع ہو جاتی تھی۔ ان کی مسلسل چلتی ہوئی زبان کو گھر بھر میں کترنی کا نام دادی جان نے ہی دیا تھا۔

''اللہ رے زوبی تیری بہو تو اپنی کترنی گھڑی بھر کو منہ میں نہیں داب سکتی ہے۔'' اور یہ ایک تلخ اور کڑوا سچ بھی تھا۔ اس میں کوئی دو رائے نہ تھی کہ صفورا بھابھی گھر بھر کی تمام ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے اٹھائے ہوئے تھیں۔ مگر اس کے باوجود ہر کام کرتے ہوئے۔

''اوئی اللہ یہ برتن یہاں پڑے ہیں۔ اوئی اللہ یہ کشن کس نے یہاں پھیلا رکھے ہیں۔ اوئی اللہ رات کو آنے والی آندھی نے سارا گھر ہی ملیامیٹ کر ڈالا ہے۔'' ساتھ ساتھ سارا بکھراوا سمٹ جاتا۔ مگر زبان مسلسل چلتی بھی رہتی تھی۔ گھر چم چم کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ مگر دوسروں کے سر میں دھم دھم ہونے لگتی تھی۔ اور پھر بالآخر سب کی نظریں اس کے کمرے پر جا رکی تھی۔ الگ تھلگ پرسکون سا تھا۔ اس لیے سب کی متفقہ رائے کے بعد اسے ہی قربانی کا بکرا بننا تھا۔ سو وہ دل کے ارمان دباتی سامان لیے سارا کے کمرے میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ جو بے حد انہماک سے ٹی وی پر میوزک شو سے لطف اندوز ہو رہی تھی، اچانک کال بیل پر ہڑبڑا سی گئی تھی۔ اس وقت سب ہی اپنے اپنے کمروں میں محو استراحت ہوا کرتے تھے۔ وہی واحد تھی، جو اس وقت لاؤنج میں چائے سے لطف اندوز ہوتی ہوئی میوزک سن رہی تھی۔ بے دلی سے اس نے کپ میز پر رکھا تھا اور بیرونی گیٹ تک آئی تھی۔ اس نے چند لمحوں بعد دروازہ کھولا تو سامنے کوئی اجنبی شخص کھڑا تھا۔

آنکھوں پر سیاہ عینک موجود تھی۔ رنگ بے حد گورا اور نقوش تیکھے سے تھے۔ کسرتی بدن کا مالک وہ شخص بے حد وجیہہ تھا۔ اس کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد طوبیٰ نے کہا۔ ''جی فرمائیے کس سے ملنا ہے۔''

''جی مجھے ذوالکفل کہتے ہیں میں لاہور سے آیا ہوں، مجھے حنا بیگم نے بھیجا ہے۔ مجھے فہمیدہ بیگم سے ملنا ہے۔''

اس نے تیز تیز لہجہ میں تعارف کا مرحلہ طے کیا تھا۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ چکی تھی کہ موصوف وہی ہیں جن کے مرنے مارنے تک کی دعائیں وہ کر چکی تھی۔ مگر وہ اب عین حقیقت بن کر نازل ہو چکے ہیں۔

''جی آئیں اندر۔'' اس نے سرد سے لہجے میں ایک جانب اس کے لیے راستہ بنایا تھا۔ وہ اس کے ایک جانب ہونے کا ہی جیسے منتظر تھا۔ فوراً اندر آ گیا تھا اور وہ قبل اس کے کہ اسے اوپر کا راستہ دکھاتی اسے دادی جان کی آواز نے چونکا دیا تھا۔

''ارے ماشاء اللہ بیٹا آ گئے تم۔'' دادی کی یادداشت کمال کی تھی۔ کل ہی سارا نے انہیں ذوالکفل کی تصویر دکھائی تھی جو انہوں نے آنکھ بھر کر نہ صرف دیکھی تھی۔ بلکہ اسی قدر پرکشش لڑکے کو دیکھ کر نجانے کیوں ٹھنڈی آہ بھی بھری تھی۔ وجہ بالکل صاف ظاہر تھی۔ گھر میں دو دو جوان لڑکیاں موجود تھیں۔ ان کی آرزو تھی کہ یہ دوستی اب رشتے داری میں تبدیل ہو

جائے۔ بچپن سے ان کی جو دوستی اب تک حنا بیگم سے قائم و دائم ہے۔ اس میں مزید استحکام پیدا ہو جائے۔

ذوالکفل نے آگے بڑھ کر سلام پیش کیا تھا اور دادی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈھیروں ڈھیر دعاؤں سے نوازا تھا۔

''ماشاء اللہ کتنا سوہنا ہے۔'' دادی کی تعریف پر اس کا چہرہ کھل سا اٹھا تھا۔ جبکہ طوبیٰ کو لگا جیسے اس نے کڑوا کریلا نگل لیا ہو۔ وہ منہ کا بگڑا زاویہ بنائے ان دونوں کو محبتوں کے مظاہرے کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب دادی نے اسے مہمان کے لیے فالسوں کا شربت بنانے کا حکم صادر کیا تھا اور اس کا ہاتھ تھامے اسے ٹھنڈے ٹھار اے۔ سی کی خنک زدہ سی خوش گوار ٹھنڈک والے لاؤنج میں لے آئی تھیں۔ جہاں ذوالکفل کے بے زار کن چہرے کے تاثرات از خود ہی خوش گواریت میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ اتنا طویل سفر طے کرنا اس کے لیے تھکاوٹ کا سبب تھا۔ پھر اس کو نئی جگہ نئے ماحول میں خود کو مدغم کرنے کا ایک فطری اندیشہ لاحق تھا۔ مگر یہاں دادی سے مل کر اسے بالکل وہی مانوس لمس محسوس ہوا تھا۔ جو نانی جان کی ممتا بھری شفقت میں پنہاں تھا۔

طوبیٰ ان کو باتوں میں محو چھوڑ کر سیدھا اندر کچن میں آ گئی تھی۔ باہر سے ان دونوں کی باتوں کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ دادی اس سے لاہور والوں کے حالات دریافت کر رہی تھیں اور وہ مہذب لب و لہجہ میں جوابات دے رہا تھا۔ وہ الجھن بھری نگاہوں سے فالسوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بارہا فالسوں کا شربت پیا تھا مگر بنانے کی نوبت ایک مرتبہ بھی نہیں آئی تھی۔ کیونکہ یہ کام کرنے کے لیے صفورا بھابھی تھیں اور وہ نہ سہی تو سارا بھی ہر کام میں لپک جھپک اپنے آپ آگے بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت صفورا بھابھی یا سارا کو جگانا اسے کسی طور مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق اس نے جیسے تیسے شربت بنایا جگ بھرا گلاس ٹرے میں رکھا اور لاؤنج میں آ گئی تھی۔ دادی اس وقت تک ذوالکفل سے یوں گھل مل سی گئی تھیں جیسے برسوں کی پہچان ہو۔ ذوالکفل اس وقت شدت سے پیاس محسوس کر رہا تھا۔ اس نے گلاس بھرا اور فوراً منہ سے لگایا مگر اس کے بعد اس کے چہرے کے یک لخت بے حد عجیب سے تاثرات ہو رہے تھے۔ نہ وہ اس شربت کو اپنے حلق سے نیچے اتار سکتا تھا اور نہ ہی دادی اور طوبیٰ کے سامنے پھونک سکتا تھا۔ بے حد تکلیف دہ کیفیت سے گزر کر اس نے بامشکل وہ گھونٹ بھرے تھے۔ نتیجتاً اس کو کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا تھا۔ کھانس کھانس کر اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو چکی تھیں۔ دادی نے ہراساں نگاہوں سے اس کے چہرے کی متغیر ہوتی حالت کو بغور ملاحظہ کیا تھا اور سارا مسئلہ شربت میں پا کر انہوں نے گلاس کو اٹھا کر بغور معائنہ کیا تھا۔ سامنے ہی گٹھلیاں تیر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک ناگوار سی نگاہ طوبیٰ پر ڈالی تھی۔

''نا ہنجار اس کو چھلنی میں چھان کر نہیں لانا تھا کیا؟''

طوبیٰ کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ نظر مجرموں جیسی جھک گئی تھی۔

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
دست مسیحا
نگہت سیما
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

"نہیں دادی جان! مسئلہ صرف یہی نہیں ہے ذرا اس میں مرچیں تو ملاحظہ کریں۔ اچھی طرح سے چیک کر لیجیے گا کم تو نہیں۔"

ذوالکفل نے مروت بالائے طاق رکھ کر طوبیٰ پر چوٹ کی تھی۔ اس کے بعد تو چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ دادی نے طوبیٰ کی وہ خبر لی کہ بالآخر اسے ہی ثالث کا کردار ادا کرنا پڑا تھا۔ تب تک شور سے سارا بھی بھاگم بھاگ کچی نیند سے جاگ کر باہر آ چکی تھی۔ اور ماجرا کیا ہے سمجھنے کی سعی میں ہلکان ہو رہی تھی۔ ایک انجان کو دیکھ کر رفتہ رفتہ جیسے سارا معاملہ سمجھ گئی تھی۔

تبھی اس نے خاموشی سے ٹرے اور جگ اٹھایا کچن میں گئی اور فٹافٹ نئے سرے سے فالسوں کا شربت بنا لائی تھی۔ تب تک طوبیٰ بائیکاٹ کرتی روتی دھوتی وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ اس مرتبہ ذوالکفل نے محتاط انداز میں ننھا سا گھونٹ بھرا تھا۔ ذائقہ دار لذیذ شربت اس نے ذرا کی ذرا نگاہ ترچھی کر کے سارا کو دیکھا تھا۔ جو اس کی جانب ہی متوجہ تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ دادی کا بھی اٹکا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔

☆☆☆

"اب رونے سے کیا حاصل ہوگا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب اٹھو منہ ہاتھ دھو باہر چلو، سب کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ جانتی ہو ناں دادی جان کو یہ بالکل پسند نہیں ہے کہ کھانے کے اوقات میں کوئی رفو چکر ہو بہانے بازی بنائے۔" سارا ناصحانہ انداز میں اسے سمجھانے میں ہلکان ہو رہی تھی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ اس میں کیا کیا ڈلتا ہے۔ تم بھی تو سو رہی تھی۔"

طوبیٰ کا تو رنج ہی کم نہ ہو رہا تھا۔ ایک اجنبی دشمن کے سامنے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے گئے تھے۔ اب وہ اس کے سامنے کبھی بھی سر اٹھا کر نہ جی سکتی تھی۔ اس کا ازلی دشمن بن چکا تھا۔ پہلے تو اس کے کمرے پر قابض ہو گیا۔ پھر اس کی وجہ سے دادی نے اس کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی تھی۔ اس پہ اس اجنبی شخص کی دبی دبی مسکان۔ وہ جھرجھری لے کر تصور میں اس شخص کو دیکھ کر دوبارہ غم سے نڈھال سی ہو گئی تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے نہ آؤ کھانے پر، مزید عزت افزائی کے لیے تیار رہنا۔" سارا کی اس دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ وہ فوراً سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ پھر سارا کے ساتھ عقب میں وہ بھی دسترخوان پر پہنچ چکی تھی۔ اشتہا انگیز خوشبو نے اسے بھوک کا احساس دلایا تھا۔ اس نے ذرا کی ذرا سب کا جائزہ لیا تھا۔ سب بالکل مطمئن سے انداز میں بیٹھے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کسی نے بھی اس کی آمد کا خاص نوٹس نہ لیا تھا۔ مگر اس ذوالکفل نے اس کے آنے پر چونک کر اسے دیکھا تھا طوبیٰ کی متورم نگاہیں اور سوجا ہوا چہرہ اس بات کا غماض تھا کہ وہ کافی دیر تک روتی رہی ہے۔ ذوالکفل نے ایک ٹیس سی دل میں اٹھتی محسوس کی تھی۔ نجانے کیوں۔ مزید وہ کچھ سوچتا کہ دادی نے اسے مخاطب کر دیا تھا۔

"بیٹا تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں یہ کباب



PakiBooks.Site

زوبی بیگم نے لپک جھپک کباب اس کی... رکھے تھے۔ اس نے ایک ممنونیت بھری نگاہ زوبی بیگم پر ڈالی تھی۔ نئے ماحول میں خود کو مدغم کرنے ا... اس نئے ماحول سے وابستہ نئی ترجیحات کو طے کرنے میں ابھی اسے وقت درکار تھا۔ فرداً فرداً سب سے متعارف ہو چکا تھا۔ زوبی بیگم اور آصفہ بیگم کا آپس میں پیار بہنوں جیسا تھا۔ کہیں سے بھی وہ دیورانی جٹھانی نہیں لگتی تھیں۔ صفورا کے بچوں کا شور گھر بھر کی جان تھا۔ صفی سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا۔ جبکہ اس کی اشعر سے اچھی سلام دعا ہو گئی تھی۔ اشعر تقریباً اس کا ہی ہم عمر تھا۔ جبکہ عمر نو عمر لڑکا تھا۔ شوخ و شنگ طبیعت کا مالک لڑکا زندگی سے بھرپور اپنی بذلہ سنجی سے محفل میں چار چاند لگا دیتا تھا۔ سارا اسے کچھ سنجیدہ پروقار اور متانت سے پر لڑکی لگتی تھی۔ جبکہ طوبیٰ اس کے لیے ابھی تک معمہ ہی تھی۔ نجانے کیوں اسے بعد میں تاسف ہوا تھا کہ اس کے منہ سے شربت کے لیے

...والا جملہ بھی طوبیٰ کی شامت اعمال کی اصل وجہ بنا تھا۔ کہیں نہ کہیں گہرا ملال سا بھی تھا۔ اس کے بعد قدرے طویل وقفے کے بعد وہ آئی تھی اور بے حد بجھے دل کے ساتھ بے حد لذیذ کھانے پر جھکی ہوئی بارے باندھے کھا رہی تھی۔ مگر وہ زیادہ دیر اس کے متعلق سوچ نہ سکا تھا۔ کوئی نہ کوئی اسے باتوں میں اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا۔ اور وہ چونک کر از سر نو چہرے پر بشاشت بھری مسکان لیے جواب دینے لگ جاتا تھا۔ یہاں آ کر اسے واقعی گھر کا ماحول ملا تھا۔ اور جو خدشات اس کے دل میں واہموں کی صورت سر ابھار رہے تھے سب ختم ہو گئے تھے۔

☆☆☆

وہ لان میں پھیلتی ہوئی شام میں کین کی کرسی پر بیٹھی ڈھلتے سائے دیکھ رہی تھی۔ بوگن ویلیا کی بیل اسے ہمیشہ ہی اپنی جانب کھینچتی تھی۔ شام کے منظر میں دن بھر کی تمازت نہ رہی تھی۔ بلکہ خنک روسا موسم در آیا تھا۔ وہ کرسی پر جھولتی اطراف میں خوش نما پھولوں کو دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ اس وسیع العریض لان میں وہ اور اشعر مل کر اپنی باغبانی کا مشغلہ اور شوق پورا کیا کرتے تھے۔ لان کی اس شادابی اور ہریالی کا اصل سہرا اشعر کے بعد طوبیٰ کو ہی جاتا تھا۔ وہ تو ہر روز کھلنے والے نئے گلاب سے خود کلامی کے سے انداز میں محو گفتگو رہا کرتی تھی۔

اگرچہ بالائی منزل اس کا مسکن ہوا کرتا تھا۔ مگر شام کا سارا وقت وہ ادھر ہی نیچے والے پورشن میں گزارا کرتی تھی۔ اور اب تو جب سے ذوالکفل آیا تھا۔ اس کا سارا وقت ادھر ہی گزرتا تھا۔ کبھی ایک ایک کیاری کو پانی دیتی گملے میں پانی بھرتی وہ ان کی نگہداشت کرتی ہوئی خود کو معتبر سا گمان کرتی تھی۔ کسی بھی مرجھائے ہوئے پودے سے یوں الفت کے اظہار کرتی کہ جیسے ہر پودا اس سے محو کلام اسے دن بھر کی روداد غم سنا رہا ہو۔ وہ گہری سوچ میں گم تھی جب ذوالکفل آ کر اس کے عین عقب میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

Free Download
and
Read Online
From :
PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

"نجانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ مجھ سے خفا خفا ہیں۔ باقی سب اہل خانہ تو مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ سوائے آپ کے۔" وہ عین اس کی نگاہوں میں جھانکتے جیسے دل میں اترنے کی سعی کر رہا ہو۔ کم از کم طوبیٰ کو اس کی روشن کشادہ چہرے پر بکھرے ہوئے جذبات الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ اس لیے وہ فوراً ہی رخ موڑ گئی تھی۔

"میرے پاس اتنا فضول وقت ہی نہیں کہ آپ پر خرچ کروں۔" اس نے بے دلی سے کہا تھا۔ اس کے انداز میں ہی اس کی خفگی ظاہر ہو رہی تھی تبھی ذوالکفل ہولے سے ہنس دیا تھا۔

"آپ کی کزن تو بہت ہی ہنس مکھ ہیں۔ آپ کس پر چلی گئی ہیں؟" وہ سیدھا اس کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے اسے بری طرح ڈسٹرب کر رہا تھا۔ دل اتھل پتھل سا ہونے لگا تھا۔ یقیناً وہ سارا کے متعلق گوش گزار تھا۔

"جی ہر انسان کا اپنا مزاج ہوا کرتا ہے۔ سارا کو عادت ہے ہر ایرے غیرے کو سر پر بٹھانے کی۔" وہ طنز کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔ اب کے ذوالکفل نے سنجیدگی سے اس کا اصل مسئلہ سمجھنا چاہا تھا۔ مگر وہ اسے یکسر نظر انداز کرتی ہوئی۔ بنا معذرت کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"سنیں کیا ایک کپ چائے مل سکتی ہے بنا مرچوں کے۔" اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ وہ طنز فرما رہا ہے۔

"جی ضرور ملے گی بمع زہر کے۔" وہ پاؤں پٹختی ہوئی سیدھی کچن میں آئی تھی۔ اس کا طوفانی انداز آمد دیکھ کر ہانڈی بھونتی ہوئی صفورہ بھابھی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"اوئی اللہ تم نے تو مجھے ڈرا کر ہی رکھ دیا۔" وہ اس کو دیکھ کر سٹپٹا کر بولی تھیں۔ وہ واقعی اپنے انداز پر خفت زدہ سی ہوگئی تھی۔

"بھابھی وہ ایک کام تھا مجھے۔" وہ انگلیاں چٹخاتی ہوئی بولی تھی۔ معلوم تھا کہ بیگانے مہمان کو چائے نہ ملی تو ایک نئی شکایت کا موقع دادی کے کھاتے میں کھل جائے گا۔

"ہاں ہاں بولو۔" صفورا بھابھی متجسس لہجہ میں بولی تھیں۔

"وہ جو مہمان آیا ہوا ہے...... جو وبال جان بن گیا ہے اسے اس وقت ایک کپ چائے کی طلب ہے۔ پلیز آپ بنا دیں گی۔" اس نے جلے کٹے انداز میں کہا تو صفورا بھابھی نے ایک ناگوار سی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ تیز تیکھی نگاہ آر پار ہوتی۔ صفورا بھابھی بھاری تن و توش کی ایک خاتون تھیں معاملہ فہم اور جہاندیدہ بھی۔ یوں ہی پورے گھر کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ اس وقت نند صاحبہ کا یہ تقاضا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ جب کہ کھیر نیچے لگنے کے قریب تھی۔ اور ہانڈی بھوننے والی تھی۔

"تم سارا کو بول دو۔ میرے پاس بالکل مہلت نہیں ہے۔ اور ابھی میں نے آٹا بھی گوندھنا ہے۔ تم لوگ تو بالکل ہی کاہل بن گئی ہو۔"

صفورا بھابھی نے آج سے پہلے کبھی یوں منہ پر کہا تھا۔ ہاں پیٹھ پیچھے سو فسانے بناتی تھیں۔ آواز اس قدر اونچی تھی کہ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے ذوالکفل نے بخوبی سن ہی لی ہوگی۔ پھر صفورا بھابھی نے احسان عظیم جتا کر چار باتیں سنا کر چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا تھا۔ پھر گاہے بگاہے یہی ہونے لگا تھا۔ وہ ذوالکفل کے سامنے سارا اور طوبیٰ دونوں کا کاہلی اور سستی کا ہولناک نقشہ کھینچتی تھیں اور وہ زیر لب مسکراتا سر اثبات میں ہلاتا ہوا چپ چاپ سن لیتا تھا۔

اب ایسا بھی نہ تھا کہ پورا کا پورا گھر ہی صفورا بھابھی کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا ہو۔ یہ درست تھا کہ صفورا بھابھی کے ہاتھوں میں بھرپور نفاست تھی۔ مگر ان کے ہر ہر کام میں سارا ہاتھ بٹاتی تھی۔ شادی سے قبل سارا ہی زوبی بیگم کے ساتھ مل کر کھانا بناتی تھی۔ اور اوپر تلے کے کاموں کے لیے جز وقتی ملازمہ ضرور رکھی گئی تھی۔ مگر بہرحال یہ ایک حقیقت تھی کہ سارے کام یونہی مل بانٹ کر ہو ہی جاتے تھے۔ طوبیٰ کچھ کام چور سی تھی۔ مگر اس کی کمی بھی سارا اپنی کاوش سے پوری کر دیتی تھی۔ شادی کے بعد صفورا بھابھی نے کھانا پکانے کی ساری ذمہ داری خود سنبھال لی تھی۔ زوبی بیگم کو بھی آرام سا مل گیا تھا۔ پھر کھانا بھی وہ خوب بناتی تھیں۔ مگر وہ اس کا سازشی ذہن نہ بھانپ سکی تھیں۔ سارا جوان کے ہاتھوں سے گندے برتنوں کا ڈھیر دھوتی۔ سبزیاں کاٹتی ہوئی کچن کو ساتھ ساتھ پھیلاوا اور بکھراوا سمیٹتی ہوئی ہلکان ہوتی۔ وہ کسی پس منظر کا حصہ بن جاتی تھی۔ سارا کریڈٹ ساری تعریفیں صرف اور صرف صفورا کے ہی حصہ میں آتی تھیں۔ سب کی نظر میں وہ معتبر اور سارا کاہل اور کام چور سی بن جاتی تھی۔

آٹا گوندھنا اور شدید ترین گرمی میں روٹیاں بنانے کی ذمہ داری وہ آرام سے سارا کے حوالے کر دیتی تھیں کہ اسے اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔ چار برتن دھونے کے لیے کون سا پہاڑ توڑ لیا تھا۔ ماشاءاللہ بھرا پرا کنبہ تھا۔

مرد حضرات کھلے دل سے کھانے کے عادی تھے۔ وہ روٹیاں گرم گرم پکائی جاتی اور گرمی میں پگھلتی جاتی تھی۔ جبکہ سب صفورا کے ہاتھ کے بنے قورمہ کی لذت میں کھوئے جاتے تھے۔ اس قدر عذاب میں روٹیاں بنانے کے بعد بھی اسے دو لفظ ہی سننے کو ملا کرتے تھے۔

"تم بھی بھابھی کے ساتھ ہاتھ بٹایا کرو۔ یوں بھی پیپرز سے تو فارغ ہی ہو۔" وہ ٹکر ٹکر اپنی ماں کا اور اپنے باپ کا منہ دیکھتی رہ جاتی تھی اور سارا تو ایک طرف طوبیٰ پر تو واقعی سست الوجود ہونے کا ایک لیبل چسپاں تھا۔ جو درحقیقت درست بھی تھا۔ طوبیٰ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اشعر بڑا تھا۔ پھر طوبیٰ اور سب سے چھوٹا عمر تھا۔ سب اس پر جان چھڑکتے تھے۔ آصفہ بیگم نے بھی طوبیٰ کو ہاتھوں کا چھالا بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اس کے حصے کا کام وہ نبٹا دیتی تھیں۔ جانتی تھیں کہ وہ نرم و نازک سی ہے۔ دھان پان سی لڑکی جلدی تھکن سوار کر لیتی ہے۔ سارا کی بات الگ تھی جب بھابھی گھر آ جاتی ہے تو نند کو بھی بھاوج کے شانہ بہ شانہ کام کروانا پڑتا ہے۔ کنواری نند کے لیے یہ ایک کڑا امتحان ہوتا ہے وہیں ساس کے لیے بھی ایک آزمائش دور ہوا کرتا ہے۔ اس لیے زوبی بیگم نے ابھی سے اپنا رویہ سارا کے لیے تھوڑا لچک دار سا کر لیا تھا۔

مگر صفورا بھابھی کا ہر وقت بلا تکان مہمان کے سامنے اپنے ہی کاموں کا ذکر کرنا تحیر زدہ تھا۔ اس کا عقدہ بھی چند دن بعد کھل ہی گیا۔ جب انہوں نے اپنی اکلوتی چھوٹی بہن ندا کو بلوا بھیجا تھا۔

"ندا اگر چند دن میرے پاس رہ لے گی تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا ناں دادی جان۔"

لگاوٹ بھرا انداز دیکھ کر دادی جو اس کی شاطرانہ چالیں اور دور اندیشی سے مسافت کا سفر طے کر چکی تھیں مسکرا دی تھیں۔

"مجھے کیا اعتراض ہوگا بہو بیگم! اپنی ساس سے تو پوچھ لو۔ مجھ سے زیادہ اب تم اس کے لیے جواب دہ ہو۔"

دادی نے بھی بات کا گول مول جواب دے کر جیسے اپنے تئیں جان چھڑائی تھی۔

ندا بھی ایک لڑکی کم اشتہار زیادہ لگا کرتی تھی۔ فل میک اپ میں بھڑکتے شوخ لباس میں وہ گرمی کی شدت میں مزید اضافہ کرتی ہوئی اعصاب پر بھاری گزرتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کے انہی طور طریقوں کی صفورا بھابھی تعریف کرتے نہ تھکتی تھیں۔

☆☆☆

"ندا بھی اتنی دور فیصل آباد سے آئی ہے اس کو بھی کراچی گھومنے کا بے حد شوق ہے۔ میں سوچ رہی تھی۔ کل جب تم لوگ جاؤ تو ذرا ندا کو بھی ساتھ لے جانا۔ اس کا بھی جی بہل جائے گا۔ میں تو سارا دن کام کاج میں مصروف رہتی ہوں۔ بچی ہے۔"

صفورا بھابھی اشعر اور ذوالکفل کو پکوڑوں کے ساتھ چائے دیتے ہوئے لب بستہ تھیں۔ اشعر کے گلے میں تو پکوڑے پھانس بننے لگے تھے۔ وہ بخوبی ندا کے ارادوں سے واقف تھا۔ جسے بچی کہا جا رہا تھا۔

وہ کہیں سے بھی بچی نہ تھی۔ بلکہ ایک شاطرانہ صفت لڑکی تھی۔ جسے موقع کی مناسبت سے پینترے بدلنا بھی خوب آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سب مہربانی اور ساری توجہ محض ذوالکفل کے لیے ہے۔ وہ ایک نہایت خوش حال گھرانے کا واحد چشم و چراغ ہے۔ وہ اپنے والدین کا ایک ہی اکلوتا بیٹا ہے۔ جبکہ اس سے چھوٹی بہن بھی ہے۔

اشعر جانتا تھا کہ ندا نے ذوالکفل سے پہلے اس پر ہر طرح سے اپنا عکس چھوڑنے کی حتی المقدور کوشش کی تھی۔ مگر اشعر کو تو کوئی اور ہی دل کو بھاتا تھا۔ سادہ سے چہرے مہرے والی سارا تو ایک مدت سے اس کا دل موہ چکی تھی۔ دل کی یہ محبت وہ نہاں خانے میں سینت سینت رکھنے کا قائل تھا۔

اسے معلوم تھا کہ زمانے کی کوئی دیوار بھی درمیان میں حائل نہیں ہے۔ وہ جب چاہے اس کا نام لے سکتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اچھی سی جاب لگ جائے اس کے بعد جب امی نے اس کے یا پھر سارا کے رشتے کے بابت بات کی تو وہ صاف واشگاف لفظوں میں دل کا مدعا اپنی ماں کی عدالت میں رکھ دے گا۔ آصفہ بیگم ایک وسیع دل کی مالک خاتون تھیں۔ وہ ہر بات میں اپنے بچوں کو اولیت دیا کرتی تھیں۔ ان کی پسند و ناپسند خوشی ناخوشی کا گہرا خیال کیا کرتی تھیں۔

”ارے صرف ندا ہی کیوں۔ میں تو کہتی ہوں کل چھوڑو۔ پرسوں چھٹی کا دن بھی ہے۔ سب مل کر کسی جگہ آؤٹنگ کا پروگرام بناتے ہیں۔ سارا اور طوبیٰ بھی خوش ہو جائیں گی۔“ دادی کی بات سے صفورا بھابھی کا منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا تھا۔ ندا جو قریب ہی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک ادائے دلبری سے بیٹھی ہوئی تھی۔ بری طرح سے بل کھا کر رہ گئی تھی۔ سارا اور طوبیٰ کو جب اس نئی مہم کا علم ہوا تو سارا تو خوش تھی جبکہ طوبیٰ کا منہ لٹک گیا تھا۔

”اب تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ سارا جو کل کے دن کی مناسبت سے الماری میں سر دیے کپڑے کھنگالنے میں لگی تھی۔ اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر بولی تھی۔

”ساحل سمندر پر جانا تو ٹھیک ہے۔ مگر وہاں وہ راجہ اندر بنا بیٹھا ہو گا۔“ اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

”تو تم کون سی کسی جگہ کی شہزادی سے کم ہو۔ تم اسے دیکھنا بھی مت۔ اگنور کرنا۔ چلو ناں، موڈ اچھا کر لو۔“

پھر واقعی وہ بھی سب بھول بھال کر اس کے ساتھ سر جوڑے کپڑے منتخب کرنے میں منہمک ہو چکی تھی۔

صبح سویرے ہی سب جاگ چکے تھے۔ ناشتے سے فراغت کے بعد دوپہر ڈھلے سب کا جانے کا ارادہ تھا۔ اگرچہ ہر شے ہر جگہ کھانے کی دستیاب ہوا کرتی ہے۔ مگر دادی جان کو تو گھر کا ہی کھانا پسند تھا۔ سو گھر سے ہی وہاں کے لیے پکوان تیار کیے گئے تھے۔ کچھ سامان راستے سے لے لینا تھا۔ بہت عرصے کے بعد سب مل کر یوں کسی تفریحی پروگرام پر جا رہے تھے اس لیے سب ہی پرجوش سے تھے۔ مرد حضرات میں صرف بچے ہی شامل تھے۔ ایک کار میں تو اشعر کے ساتھ صفورا بھابھی، ندا اور بچے شامل تھے۔ دوسری کار میں ذوالکفل کے ساتھ دادی، سارا اور طوبیٰ، زوبی اور آصفہ بیگم تھیں۔ مگر عین وقت پر آصفہ بیگم نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ مرد حضرات گھر پر ہیں۔ ان کو کسی چائے پانی کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ اچھا نہیں لگتا اس لیے وہ گھر پر ہی رک جاتی ہیں۔ یوں بھی وہ آرام کرنا چاہ رہی تھیں۔ ان کی بات اپنی جگہ درست بھی تھی۔ سو کسی نے بھی اصرار نہ کیا۔ یوں یہ دونوں کاریں قافلے کی صورت روانہ ہو گئی تھیں۔

صفورا کی حتی الامکان کوشش تھی کہ ذوالکفل ندا کے ساتھ ہی کار میں روانہ ہو۔ مگر دادی نے عین وقت پر یہ کہہ کر، کہ ان کی کار میں بھی گھر کا ایک مرد ہو، بات ہی ختم کر دی تھی۔ اس لیے بیک سیٹ پر سارا طوبیٰ دادی تھیں جبکہ فرنٹ سیٹ پر اشعر کی کار کے تعاقب میں وہ کار چلا رہا تھا۔ اور فرنٹ سیٹ پر زوبی بیگم تھیں۔

PakiBooks.Site

بیٹا بھی کار چلاتی ہے ناں۔“ یہ دادی تھیں جو اس کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر حواس باختہ سی تھیں۔ وہ مسکرا کر رہ گیا تھا۔ کیا بتاتا کہ اس کی اپنی بھی کار ہے۔ مگر طویل سفر کے خدشے کے پیش نظر نانی نے اسے اس میں آنے کی اجازت نہ دی تھی۔ وہ صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا تھا۔

”چلائی تو نہیں مگر آج آزما لیتا ہوں۔“ دادی کا رنگ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ جبکہ سارا اور طوبیٰ نے بھی ایک دوسرے کو پلٹ کر چونک کر دیکھا تھا۔ مگر جونہی سفر کا آغاز ہوا ان کا خوف زائل ہوتا چلا گیا تھا۔ وہ مشاق ڈرائیور کی طرح کار چلا رہا تھا۔ اور یہی نہیں نجانے کیوں بیک ویو مرر سے بار بار اس کی نگاہیں طوبیٰ کے چہرے پر پھسل سی رہی تھیں۔ جو اس وقت کاٹن کے لباس میں تک سک سے تیار بے حد جاذب نظر دل کے پاس پاس لگ رہی تھی۔ آج اس کا نروٹھاپن بھی خوش گواریت میں ڈھل چکا تھا۔ شیشے کے پار دیکھتی وہ کسی بچی کی مانند پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ ذوالکفل کی نگاہوں کی مسلسل پڑتی تپش سے اس نے گھبراہٹ سے پلٹ کر عین سامنے لگے آئینے میں دیکھا تھا۔ روشن نگاہیں ستائش بھرے انداز میں اس کو سراہ رہی تھیں۔ دل اچانک بہت زور سے دھڑکا تھا۔ کیا کچھ نہ تھا ان نگاہوں میں۔ محویت، اپنا پن اور اجنبیت کی چادر گرائی سدھا در دل پر دستک دیتی ہوئی مخمور نگاہیں دل میں میٹھی سی کسک جگا رہی تھیں۔

اس نے جلدی سے نگاہ ہی پلٹ لی تھی۔ جب تک وہ منزل پر نہ پہنچ گئے وہ شیشے سے پرے سر دیے بیٹھی رہی۔ اس کی اس ادا پر ذوالکفل مسکراتا رہا تھا۔ یہی نہیں آج تو طوبیٰ نے دیکھا اس کا ہر انداز ہی نرالا تھا۔ وہاں جب وہ پانی سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی سارا پر پانی گرا رہی تھی۔ قدرے فاصلے پر دور کھڑا ذوالکفل اس کو گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

بعض مناظر دل کو اس قدر بھلے لگتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ اسے تصور کی آنکھ میں قید کر لیا جائے۔ نجانے یہ وہی ایک پل تھا جب اس کا جی چاہا تھا کہ ہر شے اوجھل ہو جائے اور وہ صرف اور صرف طوبیٰ کو یونہی زندگی سے بھرپور انداز میں کھلکھلاتا ہوا دیکھتا رہے۔ محبت نے پورے استحقاق سے اس کے دل پر ڈیرہ جما لیا تھا اور جہاں طوبیٰ اپنی پوری طمطراق سے جلوہ افروز تھی۔

”کیسی لگ رہی ہوں میں۔“ عقب سے ندا نجانے کب آن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ چونک کر رہ گیا تھا۔

”جی۔“ وہ متحیر زدہ سا کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے کترا رہا تھا۔ ندا نے بھی دل میں ٹھان لی تھی۔ اخیر تک کوشش جاری رہے گی۔

☆☆☆

فیروز صاحب اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کا کاروبار کرتے تھے۔ انہوں نے مختلف کنسٹرکشن کمپنیوں میں رقم انویسٹ کی ہوئی تھی۔ وہ ایک معاملہ فہم سنجیدہ اور بردبار طبیعت کے انسان تھے۔ عرصہ ہوا ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ ذوالکفل اور چھوٹی مینا دونوں کو انہوں نے بھرپور توجہ سے پالا پوسا تھا۔ ذوالکفل کی والدہ حنا بیگم کی اکلوتی اولاد تھیں۔ بیوی کے بعد وہ یہیں رہتی تھیں اور اب بیٹی کے بعد اس کے بچوں کو دیکھ کر ان میں ہی اپنی بچی کی مہک کو ڈھونڈتی رہتی تھیں۔

دولت کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی اولاد کو ہمیشہ سادگی سے جینا سکھایا تھا۔ جو سادگی ان کی اپنی شخصیت کا خاصہ تھی۔ وہی اب ان کے بچوں میں بھی آ چکی تھی۔ انہوں نے بی اے کے فوراً بعد ہی مینا کا رشتہ ایک جگہ طے کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پھر ایک جگہ سے اچھا رشتہ آنے پر انہوں نے اپنی آمادگی بھی ظاہر کر دی تھی۔ حنا بیگم کو بھی وہ لوگ بہت بھائے تھے۔ یوں آنا فاناً یہ رشتہ طے پا گیا تھا۔ چند ماہ کے بعد شادی رکھ دی گئی تھی۔ جبکہ اس کے برعکس ذوالکفل پر سارے خاندان کی نیت تھی۔ مگر ذوالکفل نے کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا یہ اہم ترین فیصلہ از خود کرنا چاہتا ہے۔ جس پر حنا بیگم نے کوئی بحث یا حجت نہ کی تھی۔

انہی دنوں اس کے ایک پروجیکٹ کے سلسلے

میں کراچی جانے کا ذکر ہوا تھا۔ اچانک بجلی کی کوندے کی طرح حنا بیگم کے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ وہ اسے اپنی دیرینہ دوست فہمیدہ کے پاس بھیج دیں۔ پھر یہ عزیز داری رشتہ داری میں بھی بدل سکتی تھی۔ بارہا باتوں ہی باتوں میں فہمیدہ نے اپنی پوتیوں کا ذکر کیا تھا۔

اور اب وہ چاہتی تھیں کہ کاش ان میں سے ہی کوئی ایک ذوالکفل کے دل کو بھا جائے۔ جبکہ وہ تو بضد تھا کہ وہ ہوٹل میں رہ لے گا۔ اس کو کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ دولت کی ریل پیل تھی۔ اور اس قسم کا کوئی بھی مسئلہ لاحق نہ تھا۔

مگر چونکہ حنا بیگم تو کچھ اور ہی ارادہ کیے بیٹھی تھیں۔ اس لیے انہوں نے اسے اصرار دے کر کچھ وعدے وایفا کر کے بھیج دیا تھا۔ یہاں آ کر وہ خوش ہی تھا۔ مگر اس نے کسی طرح بھی یہاں آ کر اپنی مالی حیثیت کا اظہار نہ کیا تھا۔ ان سب کے نزدیک ذوالکفل بھی ان کی طرح ایک کھاتے پیتے گھرانے کا واحد چشم و چراغ ہے۔ اس کے بااخلاق رویے اور عادات سے بہت جلد ہی اہل خانہ اس کی ان خوبیوں کی بدولت اس کی گرویدہ ہو چکے تھے۔ سوائے طوبیٰ کے، دل سے کہیں نہ کہیں تو وہ بھی معترض تھی۔ مگر وہ نجانے کیوں اس کے متعلق زیادہ سوچتے ہوئے گھبراہٹ کا شکار سی ہو جاتی تھی۔ اس لیے جھلائی ہوئی رہتی تھی۔

☆☆☆

سارا نے اسے چائے کا مگ تھمایا تھا۔ جب اس نے سارہ کو پکار کر روک لیا تھا۔ سارہ کی نگاہوں میں تحیر اُمڈ آیا تھا۔

"جی۔" اسے ذوالکفل سے اس بات کی توقع نہ تھی۔ آج سے پہلے اس نے تو کبھی اسے مخاطب تک کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

"آپ کی کزن دکھائی نہیں دے رہی ہیں ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" وہ خوش دلی سے بول رہا تھا جبکہ دل طوبیٰ کو دیکھنے کا تمنائی ہو رہا تھا۔

"طوبیٰ کو تو بخار ہے۔ صبح سے پڑی ہوئی ہے۔" وہ تو بڑے آرام سے کہہ گئی تھی۔ مگر ذوالکفل کو عجیب سے وسوسے کا شکار کر گئی تھی۔ دل عجب سے خدشات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ فوراً ہی سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا ہے طوبیٰ کو۔" وہ پریشان سا پوچھ رہا تھا۔ سارا نے اس کے چہرے پر بکھری فکرمندی کو بغور ملاحظہ کیا تھا اور پھر زیر لب مسکرا دی تھی۔

"کوئی اتنی سنجیدہ حالت بھی نہیں ہے۔ بخار ہے دوا کھالی ہے اس نے ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ مسکرا کر بتا رہی تھی۔ جبکہ وہ متفکر سا ہو گیا تھا۔ اسے سارا کا مسکرانا بھی ناگوار خاطر گزرا تھا۔ جبکہ سارا تو معاملہ فہم تھی۔ اس کے مچلتے ہوئے جذبات بخوبی بھانپ چکی تھی۔ اسے ذوالکفل پہلے دن سے ہی اچھا لگا تھا۔ سوبر سا سنجیدہ سا اور اس گھر کے فرد جیسا ہو گیا تھا۔ بہت جلدی اس نے اپنی اخلاقی صفات کی بدولت گھر بھر میں اپنا ایک خاص مقام بنا لیا تھا۔ اور اس کو طوبیٰ اور ذوالکفل کی آپس کی نوک جھونک بھی مزا دیتی تھی۔

مگر پچھلے چند دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ ذوالکفل اکثر و بیشتر نیچے ہی پایا جانے لگا تھا۔ سونے کے اوقات میں ہی وہ اوپر جاتا تھا۔ اور سب سے زیادہ حیران کن بات تو یہ تھی کہ اس نے طوبیٰ کو ستانا چھوڑا ہوا تھا۔

وہ طوبیٰ کے لیے فکرمند تھا۔ مگر لفظ نہیں تھے کہ اس کی خیریت دریافت کر سکتا۔ ابھی طوبیٰ کے پاس جا کر اس کی خیریت دریافت کرے۔ مگر یہاں کے مکینوں نے اسے ظرف سے اپنایا تھا۔ عزت دی تھی۔ تو وہ ان کی عزت سے یوں سر بازار کھیل نہیں سکتا تھا۔

کھانا بے حد بے رغبتی سے کھانے کے بعد وہ جا کر اپنے کمرے میں سونے کے ارادے سے لیٹا تھا جب اشعر نے دروازے پر دستک دی تھی۔

"کیا بات ہے یار آج اتنی جلدی سونے کی تیاری پکڑ لی ہے۔" اشعر حیران تھا۔

"ہاں بس آج کچھ تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔

PakiBooks.Site

آرام کرنے کا دل کر رہا تھا سو سونے کے لیے آ گیا۔"

نجانے کیوں اس کا اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ وہ خود بھی اپنے ان جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھا اور لفظوں میں اپنے ان احساسات کو کوئی نام بھی نہیں دے سکتا تھا۔

اشعر نے اسے شب بخیر کہا ابھی اشعر گیا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا تھا اس نے دیکھا نانی کی کال تھی۔

نانی نے واقعی اسے ماں بن کر پالا تھا۔ اس لیے اس کی اس اداسی کے وقت ان کی کال اس بات کی دلالت کرتی تھی کہ وہ اسے یاد کر رہی ہیں۔

"کیسے ہو بیٹا جی لگتا ہے وہاں خوب جی لگ گیا ہے۔ جھٹ پلٹ کر نانی کی خبر بھی نہ لی۔" نانی نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا۔

"جی نانی ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ میں نے ابھی چار دن پہلے ہی تو فون کیا تھا۔" وہ اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ بھی نانی تھیں۔ گھاگ تھیں۔ اپنے ہاتھوں میں پلے بچے کے مزاج کے ہر رنگ سے واقف تھیں۔

"کیا بات ہے بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" وہ تشویش زدہ لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

"جی نانی آپ چند دنوں کے لیے یہاں آ سکتی ہیں کیا میں......" لفظ گم تھے۔ نانی نے اس کے لہجہ میں پنہاں مفہوم کو پڑھ لیا تھا۔ تب ہی ان کی خوشی سے بھرپور آواز فون پیس سے چھلکی تھی۔

"اچھا اچھا آ جاتی ہوں ہم نے مینا کا رشتہ طے کر دیا ہے اور اس کا نکاح رکھ دیا ہے اگلے ہفتے اور عید کے بعد شادی۔"

مگر نانی نہ آ سکی تھیں۔ انہوں نے فون پر تمام اہل خانہ کو مدعو کر دیا تھا۔ رمضان کی بھی آمد آمد تھی۔ اس سے قبل ہی مینا کی نکاح کی تقریب منعقد کر دی گئی تھی۔

نانی نے فون پر ہی دل کا مدعا مبہم لفظوں میں بیان کیا تھا۔ اگرچہ صاف نام تو ابھی ذوالکفل نے نہیں لیا تھا۔ مگر ان کا خیال تھا کہ ان کا اپنی دیرینہ دوست کو اشارہ دے دینا ہی کافی ہوگا۔ گھر میں دو ہی بچیوں کا تذکرہ ہوتا تھا اور ہر مرتبہ یہی سننے کو ملا تھا کہ وہ دونوں ہی کنواری ہیں اب ان میں سے کون ذوالکفل کی پسند تھی یہ تو نانی ملاقات کے بعد ہی پوچھ سکتی تھیں۔ بہرحال اپنی جانب سے انہوں نے بات چھیڑ ہی دی تھی۔

"ارے اماں آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ صاف صاف پوچھنا تھا کہ کس کے لیے رشتہ ڈال رہی ہیں سارا کے لیے یا طوبیٰ کے لیے۔"

زوبی بیگم نے سارا معاملہ سن کر یہی رائے دی تھی۔ دادی بھی سوچ میں گم تھیں۔ تب ہی ساتھ بیٹھی ہوئی صفورا کے دل میں غصے کا جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ ان کی بہن کو چھوڑ کر کس طرح سے ان دونوں کو فوقیت دی جا رہی تھی اور ان کا خیال تھا کہ شاید ذوالکفل سارا کے حق میں ہی ووٹ دے گا۔ کیونکہ اس نے اکثر ہی طوبیٰ کو ذوالکفل سے منہ ماری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر صفورا کی اپنی ذاتی رائے میں طوبیٰ میں سوائے خوب صورتی کے تھا ہی کیا نہ پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ لاابالی سی تھی۔ نہ ہی سلیقہ قرینہ تھا۔ ہر بات کو ہنسی میں اڑا دینے والی طوبیٰ کو پسندیدگی کی سند شاید ان کے نزدیک ملنا بہت ہی مشکل تھا۔ جب یہ بات سارا کے کانوں تک پہنچی تھی۔ تو اس نے رو رو کر اپنی حالت بری کر لی تھی۔ مگر یہ رونا رلانا ایک کمرے میں بند دروازے کے اندر تک ہی محدود تھا۔ اس نے کبھی زبان سے اشعر کا نام نہیں لیا تھا۔ نہ ہی اشعر نے کبھی اس سے وعدے وعید کیے تھے۔ مگر دونوں کی نگاہوں نے محبت کی رہ گزر میں دور تلک ہی سفر کر ڈالا تھا۔ ہمراہی کا خواب دونوں کی ہی زندگی کا تشنہ خواب تھا۔

☆☆☆

ایک دو دن بعد طوبیٰ کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ کافی مضمحل سی ہو گئی تھی۔ ذوالکفل نے اسے دیکھا وہ کافی کمزور سی لگ رہی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کے پاس ہی لان میں کرسی پر جا بیٹھا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے اب۔" وہ لہجہ میں پنہاں

بے قراری کو چاہتے ہوئے بھی مخفی نہیں رکھ سکا تھا۔

"جی کافی بہتر ہوں میں نے سنا ہے کہ آپ جا رہے ہیں کل۔" اس نے بھی مصالحت کا انداز اپنا ہی لیا تھا۔ اب جبکہ وہ جا رہا تھا۔ تو پھر جاتے ہوئے شخص سے کیا بیر رکھنا۔ کل کو اس نے اپنے ہی کمرے میں منتقل ہو جانا تھا۔

"مجھے سارا نے بتایا کہ آپ کا یہ سارا غصہ محض ایک کمرے پر جبری حکومت کی بدولت تھا بخدا پہلے معلوم ہوتا تو میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر کہیں اور چلا جاتا۔"

وہ بے حد سبھاؤ سے ہنسی میں کہہ گیا تھا۔ مگر ندامت میں طوبیٰ گھر گئی تھی۔ اسے اب پچھتاوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اتنے دنوں تک مسلسل اس نے ذوالکفل سے ناروا سلوک روا رکھا تھا۔ اس سے ایک نا معلوم سا بیر پال رکھا تھا۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس اب آپ بھی جا رہے ہیں تو میری جانب سے دل میں کوئی بھی بدگمانی مت رکھیے گا۔ میری بھول سمجھ لیں بہرحال سلامتی سے جائیں۔" وہ مبہم سا مسکرائی تھی۔

وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"اگر زندگی کے خوب صورت سفر میں آپ کی ہمراہی کا خواب دیکھنے کی جسارت کرلوں اگر میں کہوں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے کمرے میں میرا بھی ایک حصہ ہو۔ پتا ہے اس کمرے کے ہر ہر کونے سے آپ کی مہک ملتی ہے۔ ایک کارنر میں رکھی ہوئی کتابوں کو میں بار ہا دیکھتا رہا۔ پھر وہاں فل سائز آپ کی تصویر جہاں آپ کی آنکھیں شرارت سے بھرپور مسکراہٹ لیے ہیں۔ یوں ہی جیسے آپ پہلی مرتبہ مجھ سے ملی تھیں۔

جانتی ہیں انسان کی پسند ناپسند تبدیل ہو جاتی ہے۔ ترجیحات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مگر محبت وہ واحد شے ہے۔ جو وقت کی دھول میں بھی روز اول کی طرح دمکتی رہتی ہے۔ دیر سے ہی سہی مجھے بھی اس بات کا ادراک ہوا ہے کہ مجھے آپ سے شدید محبت ہے۔" وہ نجانے کیسے ایک ہی رو میں بولتا چلا گیا تھا۔ اور وہ یک ٹک تحیر کی زد میں بیٹھی اس کی داستان محبت سنتی چلی جا رہی تھی۔

بہت دنوں سے ایک خلش جو اس کے اندر بھی سر اٹھا رہی تھی۔ وہ اسے کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔ مگر وہ مرد تھا۔ اپنے جذبات کو اپنے احساسات کو لفظوں کی زبان دینے میں مہارت رکھتا تھا۔

اس کا مخمور لہجہ دل کے آر پار اترتا چلا جا رہا تھا۔

اس کا سر از خود جھک سا گیا تھا۔

"ارے یہ کیا! قسم سے مجھے وہی کٹ کھنی بلی پسند ہے۔ جو پنجے گاڑے نوچتی ہے۔ مجھے آپ میں یہ مشرقیت تو آج پہلی بار دکھائی دی ہے۔" اچانک ہی طوبیٰ کے چہرے کے تاثرات بگڑے تھے۔

"کیا کہا میں کٹ کھنی بلی ہوں۔" وہ پاؤں پٹختی وہاں سے چل دی تھی۔ دور سے صفورا بھابھی نے اس منظر کو پوری جاذبیت سے دیکھا تھا۔

"ہونہہ تو یہ چکر چل رہا ہے۔" انہوں نے زہر خند انداز میں کہا تھا۔

اگلی صبح جانے سے قبل وہ تمام اہل خانہ سے نہ صرف مل کر گیا تھا۔ بلکہ سب کو ہی مینا کے نکاح کی تقریب میں شمولیت کی پرزور دعوت دے کر گیا تھا۔ سب اس کے اور خود طوبیٰ بھی آج اس کے جانے سے نجانے ملول سی کیوں تھی۔ ابھی تک طوبیٰ تک اس کی نانی کی طرف سے بھیجے گئے رشتے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ نہ ہی سارا نے اس سے کسی قسم کا ذکر کیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ مسلسل بیماری میں اپنے کمرے تک ہی محدود رہا کرتی تھی۔

وہ تو چلا گیا تھا۔ مگر یوں لگ رہا تھا اپنے پیچھے سارا گھر ہی سونا کر گیا ہو۔ ندا دو دن پہلے ہی جا چکی تھی۔ اسے ایک دو بار ذوالکفل نے بری طرح سے جھٹلا دیا تھا۔ اس کی بات کی نفی کی تھی۔ ندا نہایت دل برداشتہ یہاں سے روتے ہوئے گئی تھی۔ اور اس کا سارا ذمہ صفورا صرف اور صرف ذوالکفل کے سر پہ ڈالتی تھی۔ اس کی وجہ سے اس کی بہن کی دل شکنی ہوتی تھی۔

☆☆☆

"دادی جان میں سوچ رہی تھی کہ میں اور صفی

ہی چلے جاتے ہیں۔ شادی میں شرکت کے وقت بے شک سب اہل خانہ بھی شریک ہو جائیں۔'' ایک شام صفورا نے دادی کو اکیلا پا کر دل کا مدعا بیان کیا تھا۔

''ہاں کہتی تو ٹھیک ہی ہو سفر طویل ہے۔ میں کہاں جانا آنا کر سکتی ہوں۔ نمائندگی ہو جاتی تو اچھا تھا۔ مگر میری بات سنو وہاں پوچھنا کہ دراصل سارا یا طوبیٰ میں اسے کس کا نام لیا ہے ذوالکفل نے دراصل بچے سے اس طرح کے سوال کرتے اچھا تو نہیں لگتا تھا۔ میں بھی چپ کی چپ ہی رہی۔ اب سوچتی ہوں کہ جا کر پوچھتی ہوں۔ مگر اب میری ہڈیوں میں کہاں دم خم رہا ہے۔ تم ذرا اچھے طریقے سے بات کر لی آنا۔''

صفورا نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ آصفہ بیگم اسی وقت آئی تھیں۔ ہچکچاہٹ آمیز انداز ایسی بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ دادی سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہیں۔

صفورا کے جاتے ہی انہوں نے بات کر بھی لی تھی۔ اشعر کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت ہی معقول تنخواہ پر ملازمت مل گئی تھی۔ اس لیے اب اشعر نے سارا کا نام لیا تھا۔ اشعر کے کانوں تک بھی اڑتی اڑتی خبر پہنچ ہی گئی تھی۔ دراصل آصفہ بیگم اپنے بیٹے کے انداز کو بخوبی سمجھتی تھیں۔ اور اس لیے انہوں نے جب ذوالکفل کے حوالے سے رشتے کی بات سنی تو پھر انہوں نے بطور ماں اس سے دوٹوک انداز میں بات کر کے اشعر کا دل ٹٹولا تھا۔ اشعر تو یہ سن کر دم بخود سا رہ گیا تھا۔ اسے اب رہ رہ کر ذوالکفل پر غصہ آ رہا تھا۔ کس قدر گھنا تھا۔ اس نے تو کبھی بھی سارا کو نظر بھر کر اس کے سامنے نہ دیکھا تھا۔ پھر اشعر نے دیر نہ کی تھی اور اب دادی کی عدالت میں رشتہ آ گیا تھا دادی تو یہ سن کر ہی خوشی سے نہال ہو گئی تھیں۔ انہیں اشعر اور سارا دونوں ہی عزیز تھے۔ اور گھر کی بچی گھر میں ہی بیاہی جاتی تو اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ یوں شام تک پورے گھر میں سارا اور اشعر کے رشتے کے پکے ہو جانے کی خبر گردش کر چکی تھی۔ صفورا کے دل کو مزید ایک چوٹ لگی تھی۔ اشعر کے حوالے سے ندا کی دلچسپی بھی کچھ مفقود سی رہی تھی۔

بعض اوقات کچھ لوگ تقدیر پر اپنی قسمت کا لکھا چھوڑ کر رب کی رضا پر راضی رہتے ہیں۔ مگر بعض ناشکرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو خوب تر کی تلاش میں سرگرداں از خود قسمت سے برسرپیکار رہتے ہیں۔ ندا کے بہت اچھے رشتے بھی آئے تھے۔ مگر اسے مالی لحاظ سے ایک اچھے رشتے کی طلب تھی۔ معاشی اعتبار سے صفورا اور ندا ایک پسماندہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جہاں دو وقت کا کھانا بھی عزت سے کھا لیا جائے تو اسے کافی سے زیادہ شمار کیا جاتا ہے۔ باقی ماندہ خواہشات کو تو زیر لب لانا ہی ایک کٹھن ترین مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے سستے شوخ کپڑے زیب تن کر کے اونچی اڑان بھرنے کے خواب دیکھنے والی ندا کے خواب ابھی پورے نہ ہو سکے تھے۔ یکے بعد دیگرے اسے شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ خود کو شکست خوردہ تسلیم کرنا آسان نہیں ہوا کرتا تھا۔

☆☆☆

ایک لمبی سی مرسیڈیز کوٹھی کے گیٹ کے سامنے رک گئی تھی۔ ڈرائیور نے تین بار ہارن بجایا تھا۔ تب کوٹھی کا پھاٹک چوکیدار نے بھاگم بھاگ کھولا تھا۔ کار کا رخ اندرونی برآمدے کے ساتھ ملحقہ پورچ کی جانب تھا۔ کار کے رکتے ہی نہایت پروقار انداز سے فیروز صاحب کار کی عقبی نشست سے باہر نمودار ہوئے تھے۔

''معافی سرکار اندر کھانا کھا رہا تھا اس لیے دیر ہو گئی دروازہ کھولنے میں۔'' چوکیدار نے سہمے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

''کوئی بات نہیں عالم! انسان ہو تم بھی مگر ان اوقات میں اپنے بیٹے کو یہاں بٹھا دیا کرو۔ یوں لاپروائی مجھے پسند نہیں ہے۔ جب تنخواہ دینے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی جاتی ہے۔ تو پھر تم لوگوں کو بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں لاپروائی نہیں برتنی چاہیے۔'' فیروز صاحب یہ کہہ کر رکے نہیں تھے۔ اندر کی جانب قدم بڑھا رہے تھے۔

اندر عام معمول سے ہٹ کر گہما گہمی کا عالم تھا۔ انہوں

نے دیکھا بی جان کسی خاتون سے محوِ کلام تھیں۔ اور دو لڑکے جو ابھی چھوٹے ہی تھے۔ ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔

''ماشاء اللہ فیروز بیٹا آ گیا۔ فیروز یہ کل کے فنکشن کے لیے فہمیدہ کی طرف سے آئی ہے۔ صفورا اور اندر صفی بیٹا آرام کر رہا ہے۔ میں نے ہی کہا طویل سفر طے کر کے لوٹے ہو تو آرام کر لو۔''

صفورا نے ادب سے سلام کیا تھا۔ جس کا جواب فیروز نے سر کی جنبش سے دیا تھا۔ وہ شاید کل کے انتظامات کے سلسلے میں مصروف تھے اس لیے تیزی سے پلٹ گئے تھے۔ کل مینا کا نکاح تھا۔ جو گھر میں ہی وسیع العریض لان میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس کی تمام تر تیاریاں انہوں نے از خود ہی کرنا تھیں۔ اس لیے آج وہ آفس سے جلدی گھر آ گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی صفورا دوبارہ آرام سے حنا بیگم سے باتوں میں منہمک ہو گئی تھی۔

''بس دادی کا ہی پیغام تھا کہ آپ ہو سکے تو ان کو معاف کر دیں کیونکہ سارا تو اشعر سے منسوب ہے اور طوبیٰ کی بات تو انہوں نے بیرون ملک سے آئے ایک رشتے کے لیے طے بھی کر دی تھی۔ بس قسمت کے کھیل ہیں۔'' وہ مایوس سا چہرہ بنا کر بولی۔

صفورا کی یہاں آمد کا مقصد ہی اتنا تھا کہ وہ دادی کے بجائے از خود یہاں آ کر رشتے کی بات کو ہمیشہ کے لیے دبا دے۔ مگر یہاں آ کر اسے یہاں کی امارت نے ازحد متاثر کیا تھا۔

صفورا کی بات سے فہمیدہ بیگم کو شدید قلق ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے نواسے کی بے تابی دیکھی تھی۔ اس کی تڑپ دیکھی تھی۔ اس کا طوبیٰ کے لیے سنجیدہ پن بھی دیکھا تھا۔

بے کلی کہ کب طوبیٰ کے اہل خانہ آئیں اور بات کو آگے بڑھایا جا سکے۔ مگر یہاں تو بات شروع ہونے سے پہلے ہی ختم بھی ہو گئی تھی۔ شام کے قریب فہمیدہ بیگم نے ذوالکفل کو بلا کر پیار سے نرمی سے ساری بات گوش گزار کر دی تھی۔ مگر وہ بے یقینی سے اللہ یک ٹک دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر مسلط گہری سنجیدگی اس کے اندرونی خلفشار کی غماض تھی۔

وہ مضطرب سا چپ چاپ اندر بڑھ گیا تھا۔

اگلے دن مینا کا نکاح تھا۔ تمام قریبی مہمان مدعو تھے۔ لان کو مصنوعی پھولوں اور قمقموں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ گھر میں بھی فنکشن کا مقصد یہی تھا کہ اس تقریب کو یادگار بنایا جا سکے۔ مہمان جب تک چاہیں اس تقریب میں مطمئن انداز میں شریک رہیں۔ نکاح کے بعد مبارک سلامت کی صدا گونجی کھانا بے حد لذیذ تھا۔ سب مہمانوں نے کھانا کھایا۔ صفورا بھی تقریب کے بعد واپسی کی طرف گامزن تھی۔

جب وہ لوگ گھر پہنچے تو صبح کا وقت تھا۔ دادی تو بے حد شدت سے اس کی آمد کی منتظر تھیں۔ صفورا بھی ساری بات سوچ چکی تھی کہ اسے دادی کو کیا کہنا ہے اور پھر وہ موقع بھی آ گیا تھا۔ دادی نے اسے اپنے کمرے میں روک لیا تھا۔

''صفورا بیٹا آرام تو کرتی ہی رہنا۔ مگر مجھے بتا دو تم نے طوبیٰ کے حوالے سے بات کر لی تھی ناں۔'' دادی نے پرجوش آواز میں پوچھا تھا۔

''جی دادی کر لی تھی بات مگر وہ لوگ طوبیٰ کے لیے نہیں سارا کے لیے ذوالکفل کا رشتہ مانگ رہے تھے۔ ذوالکفل کو تو طوبیٰ بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ طوبیٰ اس کی پسند سے بالکل بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ نہ ہی اس کا مزاج طوبیٰ سے میل کھاتا تھا۔ اسے تو نرم خو سارا کا رشتہ درکار تھا۔ لیکن میں نے بھی بتایا کہ سارا کی بات تو گھر میں ہی طے شدہ ہے۔ میں نے ٹھیک کہا ناں دادی۔''

وہ اپنے تئیں ٹھیک نشانے پر بات کر چکی تھی۔ دادی کا سارا جوش و خروش جھاگ کی مانند بیٹھ چکا تھا۔ چہرہ اتر چکا تھا۔ دل کو جو امید سی بندھ چکی تھی وہ بھی جاتی رہی تھی اور طوبیٰ جو دادی اور صفورا بھابھی کے لیے ناشتا ٹرے میں رکھے دینے آئی تھی۔ وہ سب سن چکی تھی۔ اس کو لگ رہا تھا کہ اس وقت ہی چکرا کر گر جائے گی۔ لوگ کس قدر جھوٹے مکار ہوتے ہیں ذوالکفل کی محبت بھری باتیں وعدے اور وہ سب کیا

PakiBooks.Site

تھا۔ شاید اسے بھی زمانے کی پرکھ نہیں آئی تھی۔ وہ چپ چاپ واپس پلٹ آئی تھی۔ کمرے میں آ کر وہ ڈھیر سارا رونا چاہتی تھی۔

اپنی نارسائی پر...... اپنی جگ ہنسائی پر۔ مگر وہاں سارا بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا پھر ذوالکفل نے تمہارا نام لیا ناں سارا نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ سارا تو خود گواہ تھی کیونکہ طوبیٰ کی بیماری کے دوران ذوالکفل کی وارفتگی قابل دید تھی۔ بے چینی سے طوبیٰ کا پوچھنا اس کی فکر کرنا اسے سب کچھ اچھے طریقے سے یاد تھا۔

طوبیٰ سارا کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔ سادہ سے حلیے میں بھی سارا اس وقت اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ ٹوٹا تھا طوبیٰ کے دل میں۔ اندر ہی محبت کی کرچیاں بکھری گئی تھیں۔ کانچ کی طرح دل میں پیوست ہوتی ایک ٹیس اجاگر کر رہی تھیں۔

"تو ذوالکفل نے اسے سارا سے کم تر جانا۔ سارا واقعی بہت اچھی ہے مگر کاش ذوالکفل اسے سہانے خواب نہ دکھاتا۔" اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ مگر وہ سارا کے سامنے اپنی ذات کے ٹکڑے نہیں چاہتی تھی۔ وہ اتنی کم ہمت بھی نہ تھی کہ وہ سارا کے سامنے ٹوٹ کر بکھر جاتی۔

"پتا نہیں میں ناشتا دے کر سیدھی آ گئی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ واش روم میں چلی گئی تھی۔ سنک میں پانی کا نل کھول کر ڈھیر سارا رونے سے اس کا جی ہلکا ہو گیا تھا۔ محبت نے اس کے در دل پر جب دستک دی تو ذوالکفل نے بھی محبت سے دستبرداری اختیار کر لی۔

☆☆☆

بابرکت مہینے کی آمد کے ساتھ ہی برکتوں کا نزول زمین پر رہنے والے باسیوں پر ہونے لگا تھا۔ سارے گھر میں دادی کا حکم نامہ تھا کہ سحری و افطاری کو بے حد اہتمام سے عبادت کے ساتھ آراستہ کیا جائے۔ سحری کے وقت سب بہت جلدی جاگ جاتے تھے۔ سب مل کر سحری میں جت جاتے تھے۔ سب ہی روزہ رکھا کرتے تھے۔ اس عمر میں بھی دادی روزے کا ناغہ نہ کیا کرتی تھیں۔ ان کے دل میں طوبیٰ کے لیے دکھ سا کھل جاتا تھا۔ کیونکہ ان کے اندر کہیں یہ آرزو پنپ رہی تھی کہ طوبیٰ اور ذوالکفل کا رشتہ طے ہو جاتا۔ مگر ایسا نصیب میں نہ تھا۔

دعائیں ابھی بھی ان کی جاری و ساری تھیں۔

دوسری جانب ذوالکفل کو نجانے کیوں کچھ غلط سا لگ رہا تھا۔ وہ ایک عرصے تک وہاں رہ کر آیا تھا۔ وہاں کے سب اہل خانہ کی عادات و اطوار سے بخوبی واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ صفورا بھابھی وہ واحد ہستی تھیں۔ جو گھر میں کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی تھیں۔ پھر اس نے جب طوبیٰ سے براہ راست اظہار محبت کیا تھا۔ تو طوبیٰ کی نگاہوں میں اس نے جواباً محبت کے وہی لہر اٹھتے دیکھی تھی۔ جس سے اس کا اپنا دل منور تھا۔ اسے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا کہ طوبیٰ کسی سے منسوب تھی۔ مگر کوئی سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دل افسردگی میں گم تھا۔ کئی مرتبہ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ایک بار خود دوبارہ جائے اور جا کر دادی کے سامنے دوزانو بیٹھ کر رو دے۔ کہہ دے اسے طوبیٰ دے دیں۔ اسے طوبیٰ



کی محبت کے سامنے دنیا کی ہر خوشی ہر مسرت ہیچ لگنے لگی ہے۔ مگر وہ یہ سب فقط سوچ کر رہ جاتا تھا۔ کچھ کہتا نہیں تھا۔ نانی اس کو چپ چاپ دیکھ کر ہولنے لگتی تھیں۔ ایک دن اسے روک بھی لیا تھا۔

"ذوالکفل بیٹا ادھر آؤ میرے پاس۔" ذوالکفل نے نانی کی گود میں اپنا سر رکھ دیا تھا۔ نانی صوفے پر بیٹھی تھیں۔ اور وہ وہیں قالین پر بیٹھ کر سر نانی کی گود میں رکھے آنکھیں موند گیا تھا۔

بعض اوقات ہمارے پاس اپنے غموں کے لیے ان کے بیان کے لیے الفاظ گم ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ذوالکفل کا جی چاہتا تھا کہ وہ بس چپ رہے۔

"بیٹا تو یوں اداس ہوتا ہے۔ میں تیرے لیے چاند سی دلہن لاؤں گی۔ کیا زمانے میں لڑکیوں کی کوئی کمی ہے۔"

دلہن کے ذکر پر اس کی بند آنکھوں میں طوبیٰ کی شبیہ لہرائی تھی۔ گندمی رنگت پرکشش نقوش والی وہ

نٹ کھٹ سی طوبیٰ در دل میں دستک دیتی ہوئی کتنی اپنی اپنی لگتی ہے۔ کیا کوئی اور اس کی جگہ لے سکتا ہے۔ دل نے پرزور انداز میں نفی کی تھی۔

☆☆☆

محبت روگ ہوتی ہے
نوحے گونجتے ہیں دل میں
ماضی گم گشدہ کی تصویریں
پردہ عکس پر جھلملاتی ہیں
وہی نم آلود پلکوں کو
گداز کرتی ہیں
محبت کانچ کی کرچیاں لیے
دل میں پیوست ہو جاتی ہیں
فسوں گر لمحہ
محیط تر ہو جو زیست پر
ناتمام رہتا ہے
زندگی میں لاحاصل رہتا ہے
سراب کے تعاقب میں
مسلسل بھاگتے نفوس
محبت کو کوسنے دیتے ہیں
جو دل میں پیوست رہتی ہے
کسی کانچ کی مانند

سحری کے وقت وہ رب العزت کے سامنے سجدہ سر بسجود تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ دل کے تمام دکھ اپنے تمام غم وہ رب کے سامنے بیان کرنے کی سکت نہ رکھتی تھی تو رو لیتی تھی۔

بعض اوقات ہم رب کو بھی بتا نہیں پاتے وہ تو غفور و رحیم ہے سب جانتا ہے۔ دلوں کے ہر ہر راز سے واقف ہوتا ہے۔ اس کے لبوں کی مسکان نجانے کہاں گم ہو چکی تھی۔ اس نے محبت کی تو مسکان کا سودا کر لیا تھا۔ محبت نے کچھ انمول پل دیے تھے۔ انہیں سوچتے وہ دن گزار لیتی تھی۔

ذوالکفل کی یاد ہر لمحہ اسے کرب میں مبتلا کرتی تھی۔ اسے اطراف میں ہر طرف ذوالکفل دکھائی دیتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی تھی۔ اور اب ہر وقت ہر شے کو چھو کر محسوس کرتی تھی۔ کہاں اس بیڈ پر ذوالکفل ایک عرصے تک محو دراز رہا تھا۔ انہی سیڑھیوں پر وہ اس کو بارہا دیکھ چکی تھی۔ لان میں وہ اچانک اس کے سر کے پاس آن کھڑا ہوتا تھا۔ وہ مکیں تھا۔ کیونکہ جو دل کے مکین ہوتے ہیں وہ دل سے کہیں نہیں جاتے دل میں ہی پیوست ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ نجانے اور کتنی دیر بنا لب کشائی کے روتی چلی جاتی جب اسے باہر سے آہٹ محسوس ہوئی تھی وہ سارا تھی جو اسے سحری کے وقت کا کہنے آئی تھی۔

نیچے آؤ سب بلا رہے ہیں وقت کم رہ گیا ہے۔

سارا نے اس کی متورم نگاہوں کو گہری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر نیچے آ گئی تھی۔ بعض غم ایسے بھی ہوتے ہیں کہ آپ اپنے عزیز از جان شخص کو بھی کہتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔

سارا کے سامنے وہ ہمیشہ کھلی کتاب کی مانند رہی تھی۔ مگر اب اس سے نظریں چرانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہی تو ذوالکفل اور اس کی راہ میں حائل تھی۔ سارا کی محبت کو ذوالکفل نے اپنا لیا تھا۔ اور وہ خود ذوالکفل کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی۔

سارا اسے بہت دن سے آزردہ دیکھ رہی تھی۔ دادی سے ذوالکفل کی بابت پوچھتے ایک جھجک سی مانع تھی کہ وہ کیا سوچیں گی۔ پر اب اس نے دادی کے سامنے جا کر بات کرنے کی ٹھان ہی لی تھی۔ سحری کے بعد جب سب سونے چل دیے وہ چپکے سے دادی کے پاس آ گئی تھی۔

"کیا بات ہے سارا کوئی پریشانی ہے کیا؟" دادی اسے یوں مضطرب گہری سوچ میں گم دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی تھیں۔ تسبیح کے دانے ان کے ہاتھ میں مسلسل گردش میں تھے۔

"دادی ذوالکفل بھائی نہیں آئیں گے اب کیا۔" نجانے وہ کیا پوچھنا چاہ رہی تھی اور کیا پوچھ رہی تھی۔

"بیٹا اب وہ بھلا کیوں آئے گا۔ اس نے جو چاہا وہ ممکن نہیں ہے ناں۔" دادی نے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔

"کیا ممکن نہیں ہے دادی اس نے کیا چاہا تھا۔"

وہ متعجب تھی۔

”ارے پگلی تجھے خبر نہیں گھر بھر میں تو سب کو علم ہے۔ وہ اشعر تو باؤلا ہوا ہے غصے میں کہتا ہے سارا تو میری تھی ہمیشہ سے اس ذوالکفل کی ہمت کیسے ہوئی سارا کے خواب بھی دیکھنے کی۔“

دادی نے آرام سے کہا تھا۔ اس کو تو جیسے بدن میں کاٹو لہو نہیں۔

”دادی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ذوالکفل بھائی تو......“ لفظ جیسے اس کے منہ سے ادا ہی نہ ہو پا رہے تھے۔ اس قدر تعجب ہوا تھا اسے۔ ذوالکفل سے اسے یہ امید نہیں تھی۔ پھر ذوالکفل کی نگاہیں اور لب و لہجہ تو طوبیٰ کے لیے ہمیشہ سے محبت سے لبریز تھا۔

”نہیں کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہے۔“ اس نے پست آواز میں کہا تھا۔ جسے سرے سے دادی نے سنا ہی نہ تھا۔

”دادی ذرا ذوالکفل بھائی سے بات کریں۔“ اس نے جو سوچا تھا۔ اس پر عمل بھی کر ڈالا تھا پھر دادی نہ نہ کرتی رہ گئی تھیں اور اس نے اشعر کے فون سے جو ذوالکفل کا نمبر ڈھونڈا تھا اس کو ملا کر دادی کے کان سے لگا دیا تھا۔

”دادی ان سے پوچھیں کہ کیا وہ طوبیٰ سے محبت نہیں کرتے ہیں۔ پوچھیں دادی۔“ وہ بضد تھی۔

”ارے باولی ہوئی ہے کیا۔ یہ بھی زور زبردستی ہے جو میں پوچھوں دادی۔“ نے ناگواری سے کہا تھا اور فون کاٹ کر اس کے ہاتھ میں تھما کر رخ بدل دیا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم واپس پلٹ گئی تھی۔ ایک الجھن دور کرنے چلی تھی۔ دوسری الجھن میں گرفتار ہو چکی تھی۔

سارا کے جی میں بارہا آیا کہ صفورا بھابھی سے اصل کہانی معلوم کریں۔ مگر صفورا بھابھی کو دیکھ کر سوچ کر رہ جاتی تھی۔ صفورا بھابھی نجانے کیوں ایک دم اس کے ذہن میں جیسے کوندا سا لپکا تھا۔

”آہ تو کیا۔“ اس نے پھر دیر نہیں کی تھی۔ جلدی جلدی سے ذوالکفل کا نمبر ملا لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جاتی اس لیے کہ وہ اپنی کزن نما بہن کو دکھی اور آزردہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اسے صرف اشعر کے ساتھ اپنی خوشی بھری عید نہیں منانی تھی۔ بلکہ طوبیٰ کی روٹھتی مسکان بھی ڈھونڈنی ہی تھی۔

☆☆☆

آخری عشرہ تھا رمضان کا عبادات میں بھی شدت آ گئی تھی۔ وہ افطاری کے لیے پکوڑوں کا آمیزہ بنا رہی تھی جب دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ اس نے باؤل میز پر رکھا تھا۔ اور لپک کر مین گیٹ کی طرف بھاگی تھی۔ اس نے عمر سے کہا تھا کہ فروٹس لے آئے۔ تاکہ وہ جلدی جلدی فروٹ چاٹ بھی بنا دے۔ اس کے خیال میں اس وقت دروازے پر عمر ہی تھا اس لیے بنا پوچھے اس نے پٹ دروازہ کھول دیا تھا۔

سامنے کھڑے ہوئے مسکراتے لبوں سے بھرپور انداز سے دیکھتے ذوالکفل کو دیکھ کر اس کو لگا کہ یہ کوئی بے حد خوب صورت خواب ہے۔

وہ شپٹا سی گئی تھی۔ اس نے ذوالکفل کے عقب میں جھانکا تھا۔ پھر دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ ذوالکفل نے اپنے پاؤں کو دروازہ میں دے دیا تھا۔

”عجیب احمق لڑکی ہو مجھے دیکھ بھی رہی ہو اور دروازہ بند کر رہی ہو۔“ ذوالکفل نے ناراضی سے کہا تھا۔ ذوالکفل کی لب کشائی پر اسے احساس ہوا کہ یہ اس کا کوئی خوب صورت گمان نہیں ہے بلکہ ذوالکفل واقعی وہاں موجود ہے۔ اس نے تحیر سے اسے دیکھا تھا۔

”آپ واقعی میں ہیں۔“ لب سے نکلا بھی تو ایک بے ڈھنگا سا جملہ نکلا تھا۔

”نہیں بھوت ہے میرا۔“ ذوالکفل کے عقب میں مینا اور نانی بھی تھیں۔ وہ ایک دم ہڑبڑا سی گئی تھی اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ وہ سب لوگ ایک ساتھ آ جائیں گے۔

”سلام تو کرو۔“ ذوالکفل نے حکمیہ انداز میں کہا تھا۔ وہ بھی مودب انداز میں ذوالکفل کی نانی کو سلام کرنے لگی تھی۔

”ماشاء اللہ کتنی پیاری ہے میری ذوالکفل کی پسند۔“ نانی نے اسے زور زور سے گلے لگا کر چوما تھا اور وہ حیرت سے ذوالکفل کی پسند پر اٹکی ہوئی تھی۔ وہ اس کایا پلٹ پر حیران تھی۔ ذوالکفل کی محبت لٹاتی نگاہیں۔ مینا کا بھابھی کہہ کر پکارنا اس کو تو ڈھیر ساری شرم آ رہی تھی۔ کچھ کہہ بھی نہ سکی تھی۔

وہ شام بے حد حسین شام تھی۔ سب گھر والے اس طرح ذوالکفل کی آمد پر خوش تھے۔ ذوالکفل کے ڈرائیور نے مٹھائیوں کے بڑے سے ٹوکرے لا کر لاؤنج میں رکھ دیے تھے۔

”یہ سب کیا ہے۔“ ابھی تو فہمیدہ حنا سے مل کر ہی خوشی سے نہال تھیں۔

”ارے کیا خالی ہاتھ آتی اتنے عرصے بعد آئی ہوں۔ پھر یہ ساری مٹھائیاں شگن کی مٹھائیاں ہیں۔ ذوالکفل کے لیے مجھے طوبیٰ پسند ہے۔ تمہیں تو اعتراض نہیں ناں۔“ حنا بیگم نے ہنس کر پوچھا تھا۔ پھر دونوں سہیلیاں گلے لگ کر نمدیدہ ہو کر رو دی تھیں۔ پھر باقاعدہ ذوالکفل کی نانی نے اسے بلا کر اس کے ہاتھوں پر بہت سارے نوٹ رکھے تھے۔ یہی نہیں اس کے ہاتھ میں ڈائمنڈ کی انگوٹھی بھی پہنا دی تھی۔

”یہ سب اس لیے کہ اب تم کہیں بھاگ نہ جاؤ۔“ نانی ہنس دی تھیں۔

”مگر ذوالکفل کو تو سارا پسند تھی ناں۔“ دادی نے پوچھا تو نانی ہنس دی تھیں۔

”بالکل سارا پسند ہے اور سارا کا بھی تو احسان ہے سارا اگر فون نہ کرتی تو معلوم ہی نہ ہوتا کہ تمہاری بہو نے ہمارے گھر آ کر کیا کھچڑی پکائی ہے۔

اس نے تو کہا تھا کہ طوبیٰ کا تم نے بیرون ملک رشتہ طے کر دیا۔ میں خفا تھی پوچھا ہی نہیں کہ تم نے میرے نواسے پر پرائے کو کیوں فوقیت دی۔ اگر ایک مرتبہ انا کا جھنڈا بلند کیے بنا بچوں کی بابت سوچ لیتی تو پوچھ ہی لیتی کہ اے بہن کیوں کیا یہ۔

خیر بھلا ہو سارا اور ہاں دیکھو عید کا موقع ہے اب اس بات کو جانے دو۔ صفورا سے کچھ نہ کریدنا مگر میرے ذوالکفل کو تو طوبیٰ ہی پسند ہے۔ اس نے تو خود کو کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ یہ دیکھو کتنا سامنے نکل آیا ہے ذوالکفل کا۔“

طوبیٰ نے نانی کی بات پر ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر ذوالکفل کو دیکھا تھا جو اس وقت بھی محبت پاش نگاہوں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ واقعی اس کو وہ پہلے سے کمزور لگ رہا تھا اور وہ خود بھی تو کتنی کمزور سی ہو رہی تھی۔

ذوالکفل نہیں تھا تو زندگی کے سارے رنگ بے رنگ سے تھے۔

یہ عید اس کے لیے واقعی بے حد خوشیوں بھری عید تھی۔ تب ہی عقب سے سارا نے اونچی آواز میں لاؤنج میں آ کر گانا گنگنایا تھا۔

”تم سنگ نیناں لاگے۔“ سارا کا شرارتی انداز دیکھ کر سب ہی ہنس دیے تھے۔

”پگلی ایک بار بتاتی تو سہی کہ تم ذوالکفل بھائی کے لیے اتنے لمبے لمبے سجدے کر رہی تھی۔ میں تب ہی کوئی حل نکال لیتی۔“ یوں سر عام اس کی محبت کا تذکرہ ذوالکفل بھی طوبیٰ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ تو شرم سے سر ہی جھکا گئی تھی۔

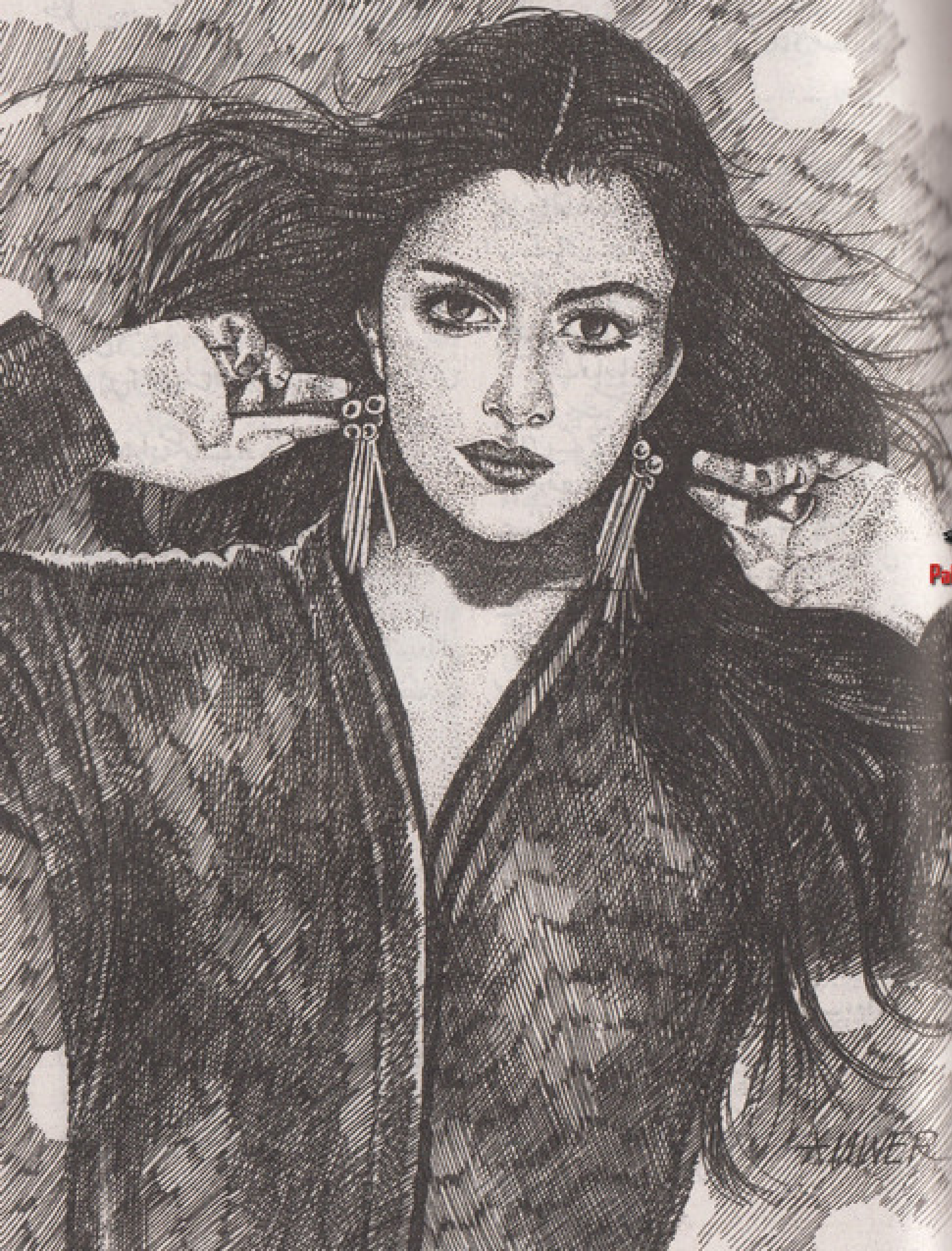
”یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ طوبیٰ بی بی کو شرماتے ہوئے دیکھنا تھا۔“ سارا نے ہنس کر کہا تھا۔

وہ واقعی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی عقب میں ذوالکفل کا زندگی خوشی سے بھرپور قہقہہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ محبت اس کے اور ذوالکفل کے دلوں پر متمکن تھی۔ یہ عید عام عید نہ تھی۔ اس میں دل ہی شاد تھے اور بچھڑے ہوئے مل گئے تھے۔

☆☆

www.PakiBooks.Site

مکمل ناول



مصباح علی سید

اسمِ یاراں

ڈوبتے سورج کے ساتھ ابھرنے والی مدھر ہوا رن وے پر مٹرگشت کر رہی تھی، خوب دور تک پھیلے رن وے پر تیار کھڑے جہازوں میں سے ایک جہاز اپنی پرواز کی تیاری کے لیے ایکسلیٹر لابی کی جانب لایا جا رہا تھا۔ وہ آفیشل ریسٹ روم سے نکلی، ٹرالی بیگ کو ڈیپارچر کی جانب تیزی سے گھسیٹتی اسکیٹنگ ایکسلیٹر پر رکھ کر لابی کی جانب بڑھ گئی۔ اس کی ساتھی ایئر ہوسٹس مقررہ وقت پر پہنچ چکی تھیں۔ صرف وہ ہی پانچ منٹ لیٹ تھی۔ اس شعبے میں پانچ منٹ لیٹ کا مطلب تھا پانچ دن لیٹ۔ کندھے پر جھکتے بیگ کی اسٹرپ درست کرتے اس نے لابی میں قدم رکھا، وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ اس کے ایچ او (ہیڈ آفیسر) مخدوم صاحب نے پیچھے سے آواز دی۔ اس نے قدرے ناگواری سے پیچھے کی جانب گردن پھیر کر دیکھا تھا۔ پچھلے پانچ منٹ بھی صرف ان کی وجہ سے برباد ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پوتے کو تحفہ بھیجنا تھا، اور رکھ کر بھول گئے، ادھر ادھر الماری بکھیر کر رکھ دی پھر یاد آیا تھا کہ وہ تو کاٹیج روم میں رکھا تھا، اسے چند منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر خود کاٹیج روم کی طرف نکلے۔ اس نے چند منٹ ان کا انتظار کیا پھر نکل آئی تھی کیوں کہ اچھی خاصی دیر ہو چکی تھی، لیکن اب پیچھے سے آتی آواز پر مرتی کیا نا کرتی کے مصداق اسے رکنا پڑا۔

''بھئی تم یہ بھول آئیں؟ کہہ کر بھی گیا تھا انتظار کرنا۔'' انہوں نے ایک چھوٹا سا سفید لیدر کا پاؤچ اس کی جانب بڑھایا۔

''اینچوئلی سر۔ آئی ایم ٹو لیٹ، اناؤنسمنٹ ہونے والی ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں، ویسے بھی آج آپ کی ڈیوٹی کچن میں نہیں بلکہ پسینجرز کے ساتھ ہے۔'' وہ اٹس اوکے کے انداز میں مسکرائی اور سفید پاؤچ لے کر اپنے ہینڈ بیگ کی زپ کھولی، اندر رکھ لیا، تین انگلیاں ہلا کر بائے کا اشارہ کرتی وہ تیز تیز لابی پار کر گئی۔

چھ فٹ سے کچھ ہی کم دراز قد، بے حد کھلی رنگت پر دھانی آنکھیں، بہترین سڈول جسم، بلو کیمرک کا خاص طرز پر سلا فیڈڈ قمیص شلوار، جس پر مختلف بجیز اور بٹن لگے تھے، گلے میں سامنے کی طرف اس کے ایئر ہوسٹس کارڈ پر اس کا نام ''منیبہ'' جگمگا رہا تھا۔ سر پر پنوں سے ٹکا باریک شیفون کا آسمانی اسکارف جس کے کناروں پر سرخ اور زرد رنگ ملی ایئر لائن کے آفیشل رنگ کی نمائندگی کر رہا تھا۔ تیز چلنے سے اسکارف کے دونوں جانب سرخ اور زرد دھاریاں ہلتے ہوئے پیچھے کو سرکنے لگیں۔ اس نے سر پر لگی پن کو انگشت کی پور سے دبا کر اسکارف جما لیا، اور جہاز میں داخل ہو گئی تھی۔

ایئر بس کا ایک چکر لگا کر تمام سیٹس کور چیک کرنے کے دوران اپنی ساتھی ایئر ہوسٹس سے معمول کی بات چیت کے بعد لپ اسٹک زدہ بھرے بھرے ہونٹ اور رخسار مسکراہٹ میں پھیلاتے استقبالیے پر آ گئی۔ اس کی پرکشش شخصیت کی وجہ سے اسے استقبالیے پر رہنے کی خاص ہدایت ہوئی تھی۔

''خوش آمدید۔ خوش آمدید..... خوش آمدید۔''

نئے داخل ہونے والے ہر مسافر کو مترنم آواز اور دھانی آنکھوں میں نرمی کا تاثر لیے خوش آمدید کہتے اس کی نگاہ قطار میں کھڑے آخری مسافر پر گئی۔ بلیک

پینٹ، فان کالر شرٹ پر بلیک فیٹڈ ویسٹ کوٹ پہنے، گھنی بھوؤں کو استہزائیہ جوڑے آگے کی سمت وہ بڑھنے لگا۔ اسے بڑھتا دیکھ کر پل بھر کے لیے منیبہ کی آنکھوں میں سرد تاثر لہرایا۔ مگر چہرے پر صرف مسکراہٹ تھی۔ ”کتنا مشکل ہے اندر کے ابھرتے تلاطم کو بیرونی سطح پر ظاہر نا ہونے دینا“ وہ ان مراحل سے ایئر ہوسٹس دن میں کتنی بار گزرتی ہیں، یہ ان کا مجبور دل ہی جانتا ہے۔

”خوش آمدید۔“ سن کر وہ شناسائی کا تاثر دیتا اس کے پاس آکر ذو معنی کھنکارا تھا۔

”شکریہ۔“ اس نے ذرا سی گردن پھیر کر پیچھے خالی لابی کو دیکھتے استہزا میں کہا تھا۔

”آئی تھنک، آئی ایم دی لاسٹ......ول یو پلیز گائڈ می؟“

(میں آخری مسافر ہوں، کیا میری رہنمائی کریں گی)

پیشہ وارانہ مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”آف کورس۔“ (جی ضرور)

اس سے پہلے وہ اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتی اس نے ہاتھ سے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا

”چلیے“

وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ جہاز کے اندر داخل ہوئی۔ حسب معمول درمیان کی نشست اس کے لیے مختص تھی۔ نشاندہی پر وہ شکریہ ادا کرتا بیٹھ گیا۔

”اوہ میم!“

اس کے مڑتے ہی وہ عقب سے پکارا تھا۔

”مجھے ٹائم بتاتی رہے گا، اکچولی......“

اس کے ذو معنی رکنے پر وہ ٹھٹکی نہیں البتہ آنکھوں میں متاسف چمک ابھری تھی۔

”سو یہ طے ہے، یہ شخص بہت ڈھیٹ ہے، کبھی نہیں بخشے گا۔ زندگی میں کبھی میرے پاس ملین ڈالرز ہوئے اس کے منہ پر دے ماروں گی۔“ پھر خود پر مسکرائی۔ ”جو اس زندگی میں کبھی نہیں ہوں گے، سو۔“ سوچتے ہوئے اس نے ہلکے سے شانے اچکائے، وہ اس کی بھوری آنکھوں میں دھانی آنکھیں ڈالے ذرا سا اس کی جانب جھکی اور مدھم سرگوشی کی تھی۔

”سر میں یہاں سب کو سب بتانے کی پابند ہوں۔ اکس مائی جاب، سو بے فکر رہیں۔“ ریشمی رخسار پھیلاتے ہوئے سیدھی ہوئی۔ ہموار لہجے میں کہا تھا۔

”شیور سر!“ وہ نرمی سے کہہ کر اناؤنسمنٹ کے لیے بڑھی تھی۔

☆☆☆

جہاز اپنے نیچے سینے میں سمیٹ کر زمین کی سطح چھوڑ چکا تھا۔ دوران پرواز وہ کئی بار اناؤنسمنٹ کرنے اس کے پاس سے گزری، ہر بار وہ وقت پوچھنا نہیں بھولتا تھا، ایک بار منیبہ نے اپنی رسٹ واچ اتار کر اس کی سیٹ کے سامنے لٹکا دی۔

”آپ کو بار بار پوچھنے کی زحمت نہیں ہوگی۔“

”یہ تو بہت سستی ہے؟“

اس کے چڑا دینے والے مزاح پر وہ جتا کر بولی۔

”وقت کبھی سستا نہیں ہوتا۔ ہاں سستا کر دیتا ہے۔“ وہ جانے لگی تو اس نے آہستگی سے پکارا۔

”لیکن میم! مجھے کون بتائے گا' یہ وقت صحیح بتا رہا ہے؟“

”بے جان چیزیں جھوٹ نہیں بولتیں۔ سو یہ نہیں بولے گی، سر یلماز حسین صاحب!“ اس سے پہلے کہ وہ مڑتی، وہ کہہ اٹھا۔

”لیکن یہ جان دار ہے، یہ چل رہی ہے، آواز بھی آرہی ہے۔“ وہ اسے زچ کرنے کے پورے موڈ میں تھا۔ مگر سامنے بھی منیبہ تھی، اپنے پیشے کے تحمل کو برقرار رکھے۔

”اس کی جان آپ کی پوروں میں ہے' گھمائیں نکال دیں۔“ مسکراتے لب، نگاہوں میں نرمی کا تاثر لیے اب وہاں مزید نہیں رکی۔ مگر جب جب وہ وہاں سے گزری ہر بار وہ اس سے ایک بات پوچھتا۔

”کیا اب یہ وقت صحیح بتا رہی ہے؟“ وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیتی۔ اسے اس کے اس انداز کی عادت بہت پہلے سے ہو گئی تھی۔

☆☆☆

پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کے تین سالہ دورانیہ میں اس کے استہزائیہ انداز میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا۔ پہلی ملاقات گو کہ اچانک تھی مگر اس کے بعد کی ہر ملاقات باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تھی یا کم از کم منیبہ کو تو ایسے ہی لگتا تھا۔ کمپنی کی طرف سے دیے جانے والے سالانہ ڈنر میں سارے عملے کی حاضری یقینی ہوتی تھی، مگر یلماز نے اسے بلانے کے لیے خود چار فون کیے تھے۔

”سر میں ضرور شرکت کروں گی۔“ منیبہ کے جواب پر اس نے قہقہہ لگایا۔

”آپ کو کرنی بھی چاہیے، اٹس مائی آرڈر۔“

اسی جملے سے منیبہ کو چڑ تھی، شرکت تو اسے کرنا تھی مگر اپنا تمام وقار ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے۔

گلے پر سلور نگوں کے کام والی لمبی گھیر دار سیاہ قمیص، سلور چوڑی دار پاجامہ، نیٹ کا لمبا سا سیاہ دوپٹا جس پر جگنو کی طرح کہیں کہیں نگ پر ہلاتے تھے وہ اسے آگے کو پھیلائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اس طرح سے بیٹھی تھی اس کی ایک کہنی ٹیبل کے کنارے پر ٹکی تھی۔ رخ مہمانوں کی جانب اور نگاہ اندھیرے سے سیاہ پڑتے درختوں کو بے چین کرتی برقی روشنی پر، وہ جانے کب چپکے سے ادھر آبیٹھا تھا۔ ڈارک براؤن ڈنر سوٹ میں ملبوس، مہنگے ترین کلون کی خوشبو بکھیرتا، ایک اعلا خاندان کا قیمتی ترین فرد۔

”کہاں کھوئی ہوئی ہیں آپ؟“ وہ اس کے بولنے پر ہلکا سا چونکی۔ قدرے درست ہو کر بیٹھتے ہوئے نگاہ اس کی سمت پھیری، اداس چہرے پر معمولی سی لپ اسٹک میں مسکراتے ہونٹ، نرمی کے تاثر سے بھری دھانی آنکھیں وہ ان آنکھوں کی چمک میں بہت پہلے الجھ گیا تھا، ویسے تو اس پیشے کی اہم ڈیمانڈ کے حساب ان کی تمام ایمپلائز ایئر ہوسٹس بہت خوب صورت تھیں اور اس کے آگے پیچھے رہنے کو فوقیت دیتی تھیں۔ اس کی وجہ صرف اس کی وجیہہ سراپا ہی نہیں تھا بلکہ مشہور ایئر لائن کے مالکان میں سے ہونا بھی تھا اس کی نظر التفات ترقی کے چانسز بڑھا سکتی تھی اور ساتھ مل جانے سے وقار، اس سب کے باوجود منیبہ کا لیا دیا انداز، یلماز میں اک خودسری سی بھرتا کھینچ کر اس کے قریب لے آتا۔

”کہیں نہیں سر! یہاں ہی آپ کے سامنے ہوں۔“

”لیکن محسوس نہیں ہو رہیں، شاید کچھ سوچ رہی تھیں؟“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے اپنی نرم آنکھیں دھانی آنکھوں میں جما دیں۔

”صحیح کہا آپ نے۔“ اس نے شیشے کے گلاس میں پانی انڈیل کر، اطمینان سے گھونٹ بھرے، گلاس واپس رکھتے ہوئے مسکرائی اور سرد آواز میں بولی تھی۔

”میں یہ سوچ رہی تھی سر! دوران پرواز، یہ درخت، محل، زمین کس قدر معمولی دکھائی دیتے ہیں چونکہ استقامت فرش بخشتا ہے، اسے معمولی سمجھنا نہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سوچ نگر کی رانی



رضیہ جمیل

قیمت -/350 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر:
32735021

چاہیے۔" یلماز کی نگاہ میں گہرا تاثر ابھر کر معدوم ہوا اس نے بات فوراً بدل دی۔

"ایکچوئلی میں آپ کو اپنی فیملی سے ملوانا چاہتا تھا۔ آئیں۔"

وہ اٹھا تھا مگر اس کے قطعیت سے کہنے پر "میں مل چکی ہوں۔" کچھ سوچتے ہوئے واپس بیٹھ گیا۔

"یقیناً میرے گرینڈ پا سے نہیں ملیں ہوں گی۔" اس کے احتراز سے اندر کی زور آوری نے سر اٹھایا وہ جتا کر بولا۔ "وہی جنہوں نے مجھے واچ گفٹ کی تھی۔ آئیں ان سے اس کی قیمت پوچھتے ہیں۔" اب کے منیبہ نے کھل کر مسکراتے ہوئے بیک سے پشت ٹکائی چڑا دینے کی حد تک طمانیت چھلک رہی تھی۔

"میں سب سے پہلے ان ہی سے ملی تھی۔"

"قیمت تو پوچھی ہوگی؟" کان کی لوح کھینچتے ہوئے کہا گیا۔ مقصداً اسے الجھا دینا تھا مگر وہ منیبہ تھی۔ حسن اور جسم کی اٹھان اسے اللہ نے دی تھی، خود اعتمادی سے جاذبیت اس نے خود بھری تھی۔ اور اس سب کی اہم وجہ اس کے پیشے کی ڈیمانڈ بھی تھی۔ کنفیوژ ہونا اس نے اپنی سرشت سے نکال پھینکا تھا۔

"بالکل اور انہوں نے بتایا بہت جلد میری سیلری اتنی بڑھا دیں گے۔ دس سال کی پے جمع کرنے سے میں ایک اچھی گھڑی خریدنے کے قابل ہو سکتی ہوں۔"

اسے خاموش دیکھ کر وہ "ایکسکیوزمی" کرتے جھٹکے سے اٹھی، کچھ فاصلے پر کھڑی اپنی ہیڈ ائیر ہوسٹس کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"کیا چیز ہو تم منیبہ بی بی؟ یلماز حسین اتنا کنگال نہیں ہے کہ دل کی قیمت نہ دے سکے۔" وہ دیر تلک سوچتا رہا۔

یہ گھڑی کی یاددہانی کوئی پہلی یا آخری بار نہیں تھی۔ اس کے برفیلے انداز کو وہ محظوظ کرتے ایسے موقعوں کی تلاش میں رہنے لگا تھا۔

☆☆☆

جگہ جگہ سے پھٹے کھیس دریاں گزرتی برسات کی سیلن دور کرنے کے لیے چھت کی دیوار پر پھیلائی گئی تھیں۔ اترتا سورج دیکھ کر وہ انہیں اتارنے کے لیے اوپر آئی تھی۔ ایک ایک کر کے اتار کرتہ لگاتے نیچے نظر مار گئی۔ صحن میں حسب معمول امجد بلقیس کو گالیاں بک رہا تھا۔ وہ چھناچیخ کر اٹھی۔

"بیس سال ہو گئے تیرے ساتھ ذلیل ہوتے ہوئے۔ جوان بیٹی کی بھی تجھے غیرت نہیں۔ خدا کے واسطے چھوڑ دے جوا۔"

"بکواس نہ کر، دے اتار کے۔"

"کیوں دوں، یہ میں نے اس کی شادی کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔ تیرے جوئے کے لیے نہیں۔"

"دیتی ہے یا دوں کا غذ۔"

"نہیں دیتی کیا کرلے گا، مار لے، پیٹ لے اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے تو......" کندھے سے سرکتی چادر جھٹکے سے اوپر کرتی بلقیس اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

"اے" امجد کا ہاتھ اپنے کندھے کی جانب گیا اور تیزی سے پلٹ کر الٹا بلقیس کے منہ تک آنے لگا تھا راستے میں ہی بلقیس نے اس کی سوکھی کلائی کو پکڑ کر جھٹکے سے پرے کی۔ وہ دانت جمائے تنفر سے پھنکاری تھی۔

"سمجھتا کیا ہے تو خود کو...... نشے نے تیرے اندر کچھ چھوڑا ہے جو مجھ پر ہاتھ اٹھا......"

جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ بلقیس کو کھانسی کا شدید دورہ اٹھا تھا، اس کی حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امجد تیزی سے آگے بڑھا تاکہ اس کی بالیاں اتار سکے۔ اس نے پھر اسے پرے دھکیلا وہ چلا پڑا۔

"اے ذلیل عورت! تیرا خون پی جاؤں گا۔" مغلظات بکتے اس کے جسم کی تمام ہڈیاں کھڑی ہو گئی تھیں، رنگت بالکل سیاہ۔ اس کے کروفر سے لگتا تھا اگر آج بلقیس نے اپنی واحد جمع پونجی وہ بالیاں نہ دیں تو اسے قتل کر دے گا جس طرح وہ اس پر چڑھ چڑھ جا رہا تھا۔ بلقیس ایک بار پھر جھٹکے سے پیچھے ہوئی۔

"خدا کا واسطہ تجھے۔"

اس نے آگے دونوں ہاتھ جوڑ لیے میلی چادر کندھے سے پھسلی اور کلائیوں پر آرکی۔ دونوں کو ...ملی کے فرش کو چھونے لگے، سوکھی گھاس جیسی چٹیا لٹکے بال، بجھی بھوری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے میلی چادر پر آنسو......اور دم توڑتی کھانسی۔ وہ اسے واسطے دے رہی تھی۔

"چلا جا یہاں سے، رحم کر مجھ پر اپنی بیٹی پر۔ جا چلا جا۔"

"چلا جاؤں گا۔" اس نے ناک سے مکھی اڑا کر گلے میں پڑا چار خانوں والا زرد مفلر کھول کر زور سے لپیٹا۔ "دے بالیاں ابھی چلا جاتا ہوں۔"

"نہیں نہیں......" بلقیس دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتی آہستہ آہستہ پیچھے ہو رہی تھی۔ نشے میں لڑکھڑاتے آگے بڑھتے امجد کے پیروں میں اس کی میلی چادر رگیدی گئی۔

"تو کیسے نہیں دیتی۔ تیری تو ماں بھی دے گی۔"

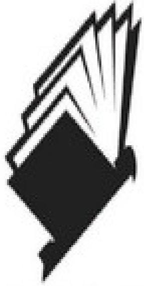
کانپتی کھانستی بلقیس کو اس نے زور کا دھکا دیا۔ وہ ٹوٹے بان کی چارپائی پر جا گری۔ سر کے پچھلے حصے پر شدید چوٹ آئی تھی پھٹے بان کی ساری نوکیں بدن میں پیوست ہو گئیں۔ کھانسنے میں تیزی آ گئی تھی۔

"کھڑے کھڑے تجھے چوک میں بیچ آؤں گا۔ ہونہہ!"

وہ قحط زدہ آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہا تھا۔ آخری جملے پر منیبہ کی برداشت جواب دے گئی تھی زمین پر پیچ، گولی کی طرح تنگ زینہ اترتی نیچے آئی۔ امجد کے روبرو تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ابا اس موٹی بھدی بیمار عورت کی تجھے کیا قیمت ملے گی۔ کتنے عرصہ چلے گی وہ رقم...... ادھر میری طرف دیکھ۔"

اس نے باپ کو اپنی جانب موڑتے ہوئے گردن اٹھالی۔ "خوب صورت ہوں، جوان ہوں، مجھے بیچ...... کم از کم اتنی رقم تو ملے گی جو تیرا ساری زندگی کا نشہ پورا کر سکے۔" وہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑھے اگلے دانت جما کر چلا رہی تھی۔ "چل مجھے چوک لے جا اور اپنے یاروں سے بولی لگوا میری۔ چل نا۔ چل۔ ابا چل دیر کیوں کر رہا ہے۔"

Free Download
and
Read Online
From :

PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

اس کے ہذیانی کیفیت میں چلانے پر امجد کی غصے سے پھیلی آنکھیں سکڑیں پھر بھنچنے لگیں۔ وہ اسے ایک ہی بات کہتے بے طرح چلاتی دروازے کی سمت بڑھتی رہی بلقیس نقاہت سے اٹھی منیبہ کو پیچھے سے پکڑنے کی کوشش کی مگر اس نے جھٹکے سے خود کو چھڑوایا۔

”مت روک اماں! آج ابے کو شوق پورا کرنے دے۔ اپنی بیٹی کو بیچ کر نشہ پورا ہو جائے گا اس کا۔ روز روز کی کل کل ختم ہو۔“

”تو پاگل تو نہیں ہوگئی۔“ بلقیس اسے روکنے میں ناکام تھی اور امجد اس کے جوان ہاتھوں میں بے بس لڑکھڑاتا تنفر سے اسے گھورے جا رہا تھا۔

”ہاں پاگل ہوگئی ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر باپ کو پھنکار کر دیکھا۔ ”پہلے تو نے اماں کا چھلا بیچا، جو سنار ن نے اپنے بچے کے صدقے میں دیا تھا، پھر وہ نقلی جتنا لاکٹ بیچا جو ڈوری میں اماں کے گلے میں لٹکا رہتا تھا، پھر گھر کی ایک ایک چیز بیچی۔ اب تجھے بالیاں چاہئیں۔ ان تاروں کا کیا ملے گا تجھے۔ آٹھ ہزار، دس ہزار۔ بس۔“ اس نے حقارت سے گردن جھٹکی۔

”ہونہہ......“

ہرنی جیسی بڑی بڑی دھانی آنکھیں گرم پانی سے لبالب بھر گئی تھیں۔ ”کتنا بھولا ہے تو ابا! تیرے گھر میں ہیرا پڑا ہے تجھے نظر نہیں آتا۔ چل آج اس ہیرے کی قیمت لگوا۔“

امجد نے خود کو چھڑوانا چاہا مگر جوان گرفت مضبوط تھی۔ بس اسے گھورے جا رہا تھا منیبہ نے تعفن زدہ سانس کھینچی، آواز بھیگ کر نکلی۔

”ویسے بھی تو تیرے دوست باہر آتے جاتے، مجھ پر ٹھٹھے مارتے ہیں، راستہ روکتے ہیں...... تو خود کیوں نہیں میری بولی لگا دیتا۔ ان کا اور تیرا سب کا نشہ پورا ہو جائے گا۔“

امجد نے جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا تھا، ماں بیٹی کو متنفر انداز میں دیکھتے اپنا چار خانوں والا زرد مفلر اتارا اور جھٹکتا تیزی سے باہر نکل گیا، وہ گھٹنوں کے بل زمین پر دھم سے بیٹھی، پھر زور زور سے ایسے چلا رہی تھی جیسے آج کسی کی میت ہوئی ہو۔

”چلا کیوں گیا...... لے کر جا مجھے، دوسرے کی بیٹی کو بیچنے کی ہمت ہے تو اپنی کو بیچنے کا حوصلہ بھی پیدا کر۔“ بلقیس نے اسے اپنے ساتھ لگاتے پیار کیا تھا

”پاگل تو نہیں ہوگئی تو...... کیوں کر رہی ہے اس طرح۔“

”پاگل نہیں عقل آگئی ہے۔ باپ کو تو رحم نہیں آتا مجھ پر، جب بکوں تو ہو سکتا ہے وقت کو آجائے۔“

بلقیس اس کے چہرے کو دیکھتے استہزائیہ ہنسی تھی۔

”وقت کو اور رحم؟ بے وقوف۔“ اس نے ٹھٹھے کے انداز میں قہقہہ لگایا پھر لگاتی چلی گئی۔۔ یہاں تک کے منیبہ رونا بھول کر اماں کو ایسے دیکھنے لگی جیسے وہ پاگل ہوگئی ہو۔ پھر بلقیس نے لمبی سی ہچکی لے کر ٹھٹھوں کو ایسے بریک لگائی جیسے کوئی اسپیڈ بریکر کا جھٹکا لگا ہو اور گہرے انداز میں بولی تھی۔

”وقت اور مرد ایک سے ہوتے ہیں۔ بے رحم، سفاک...... دونوں چاہتے ہیں ان کے آگے سر جھکا لیا جائے، ان سے ہار مانی جائے۔ انہیں سجدہ کیا جائے۔ یہ جیسا مرضی سلوک کریں، پاؤں میں رگڑ دیں، مگر ان کے آگے جھکا سر نہ اٹھے، ان کی حکمرانی قائم رہے۔“ اس نے اماں کو بھی جھٹکے سے پیچھے کیا۔ بپھری ناگن کی طرح آنکھیں کلائیوں کی پشت سے بے دردی سے رگڑ ڈالیں۔

”میں نہیں ماننے والی ہار۔ میں رب کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرنے والی۔ نہ وقت کو نہ ہی کسی مرد کو۔“

☆☆☆

شارجہ میں برج خلیفہ کے پاس بنے کانفرنس ہال میں تمام ملٹی نیشنل ایئر لائنز کا سیمنار تھا۔ سب کو اپنی کارکردگی کے بارے میں بہترین بریفنگ دینا تھی۔ پریزنٹیشن کے لیے سب کمپنیز نے اپنے بہترین پائلٹس اور پرکشش ایئر ہوسٹس تیار کی تھیں۔ یلمی کمپنی کی طرف سے منیبہ اور اس کی دو ساتھی تیار کی گئیں۔ اچھی پریزنٹیشن دینے کے لیے انہیں پہلے سے ریہرسل کروائی گئی تھی، جس میں ان کی آواز اور لباس کا خیال رکھا گیا تھا۔

سیمینار ہال نامور وزراء، مشیر، کمپنیز کے مالکان، عہدہ داران سے بھرا پڑا تھا۔ مختلف موضوعات پر ہال میں ہوتا شور ایک دم سمٹ گیا۔ یلمی ایئر لائن کی جانب سے جب منیبہ اسٹیج پر بڑھنے لگی۔ سرخ سلکی نیٹ کی لمبی میکسی، لمبی ہیل کا نگوں سے جھلکتا سینڈل، سرخ ڈائیڈ بال آگے سے کچھ اٹھا کر نگوں کی پن میں دبائے، تراشیدہ سرے پتلی لمبی گردن اور شانوں کو چھوتے، سلیقے سے کیا گیا میک اپ، گلے اور کانوں میں باریک نگوں کی چمکتی جیولری اور اس بھرپور اہتمام کے ساتھ نرم مسکراہٹ میں پھیلے ریشمی لب و رخسار۔ روسٹرم کے پیچھے کھڑے ہوئے سیدھے شانوں اور اٹھی گردن والی کی مترنم آواز

”ہیلو“......

میں حیرت انگیز دلکشی بھر چکی تھی، اس لڑکی کا اسٹیج پر آتا ہی یلمی کی ریٹنگ یک دم بڑھا گیا۔ یلماز تیسری رو میں بیٹھا تھا، اسے اس پری وش کے صرف ملتے ہونٹ، ہیرے کی طرح چمکتی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی کمپنی کی کارکردگی اور خصوصیات کے بارے میں کیا کہہ رہی ہے، کتنا کہہ رہی ہے، اس سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا، اس کا آخری لفظ۔

”تھینک یو۔“

اس کے اندر گھنٹیاں سی بجا گیا تھا، تالیوں کی گونج میں جیسے ہی وہ روسٹرم سے ہٹی وہ غیر محسوس طریقے سے اٹھا، اسٹیج سے ملحقہ کمرے کی جانب جدھر وہ بڑھی تھی وہ پچھلے دروازے سے ادھر ہی آگیا تھا، ان کی کمپنی کے علاوہ ادھر اور بھی کمپنیز کی ایئر ہوسٹس اور پائلٹ آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ جیسے ہی منیبہ ادھر سے گزری وہ اسے تالیوں سے سراہتا قریب ہوا، نگاہ استہزائیہ، چہرا عام تاثر لیے، دیکھنے والوں کو بات چیت کا انداز عام مالک، ملازم کا سا لگتا تھا۔

”واہ۔ کمال کر دیا مس منیبہ آپ نے۔“

وہ مسکرائی۔

”تھینک یو سر۔“

”بہت خوب صورت لگ رہی ہیں آپ۔“

اس کے مدھم سے کہنے پر وہ ہموار آواز میں بولتی آگے چلنے لگی۔

”سر! میں سیلری لینے کے لیے خوب صورت لگنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”مگر آپ خوب صورت ہیں۔“

”جی بالکل! آج مجھے کئی لڑکیوں نے کہا ہے۔ لیکن؟“

وہ بھی ساتھ چلتا لحہ بھر کو رکا۔ ”اگر میں آپ سے کہوں یہ جاب چھوڑ دیں۔“

”مطلب......؟“ مطلب اب وہ کیا بتاتا، منیبہ کو دیکھ کر اپنی سانسیں رکنا تو سمجھ آتا تھا لیکن، جو اور بہت سوئی رگی تھیں۔ ہال میں بیٹھے یلماز کا جی چاہا تھا، ان کی حقیقت میں ہی روک دے یا پھر منیبہ پر طلسمی چادر ڈال کر اپنے تک محدود کرلے، اس وقت اس کے ادھورے جملے پر منیبہ کو اچنبھا ہوا بھنویں سمٹ گئیں۔

”جاب میری ضرورت ہے، یو نو سر!“

”میں آپ کی ہر ضرورت پوری کروں گا۔“

وہ تندی سے دیکھتے چونکی، وہ سنبھلا اور تنگ کرنے کو پرانی جون میں لوٹا۔

”آئی مین، مجھے اپنا وقت لینے کے لیے، آپ کی ضرورت تو پوری کرنی پڑے گی۔“ اس کا استہزائیہ انداز منیبہ کو کسی انگارے کی مانند لگا تھا۔ نگاہ کی تندی بمشکل روکی اس کا شدت سے دل چاہا نتیجے کی پروا کیے بغیر اس کے منہ پر رکھ کر تھپڑ مارے۔ اس وقت اس میں، امجد کے نشئی دوستوں اور کنول کے ابا میں قطعاً فرق نہیں لگا تھا۔ اس نے جبڑے جماتے اپنے تاثرات کو قابو میں رکھا تھا۔ اپنی عزت نفس پر ضرب کھا کر بھی ہنسنا کتنا مشکل ہے نا اور وہ دن میں کتنی بار ان لمحوں سے گزرتی تھی۔ شاید اب تک تو یاد بھی نہ ہو۔ وہ محظوظ ہوتے ہوئے مسکرائے جا رہا تھا۔ پھر سنبھلنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''اوہ آئی ایم سوری، رئیلی سوری آپ کچھ غلط سمجھیں۔ میرے کہنے کا مطلب ہرگز وہ نہیں تھا، جو آپ سمجھ رہی ہیں۔''

وہ اس کی خاموشی سے حظ اٹھاتے اپنی خالی کلائی دکھانے لگا تھا۔ ''ایکچوئلی! میرے پاس وقت نہیں ہے، یعنی گھڑی، مجھے اپنی گھڑی واپس چاہیے، مس منیبہ! پہلے ہی آپ نے بہت دیر کردی ہے۔ آپ تو کنفیوژ ہی ہوگئیں۔''

وہ منیبہ تھی خود کو قابو میں رکھ کر طمانیت سے طنز کرنے والی۔

''نو نو، نو سر آپ غلط سمجھ رہے ہیں، میں ہرگز ویسا نہیں سمجھی، جو آپ کی سوچ ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں، آپ کی واچ یہاں شارجہ سے خریدی جائے یا پٹنا گون سے؟ ہماری اگلی فلائٹ امریکہ کی ہے ناں۔''

اس کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ یلماز کو چبھا تھا وہ جاتے ہوئے مزید کہہ گئی تھی۔ ''انفیکیٹ سر میں بھی کنفیوژ نہیں ہوتی۔ سو بے کار کی کوششیں چھوڑ دیں۔''

وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ یلماز کی نگاہیں اٹھی گردن والی کی سرخ میکسی کی فال سے ٹکرا نیچے گر گئیں یا ربل کے چمکتے فرش کی چمک آنکھوں میں کھپ سی گئی تھی۔ اس کے دانت آپس میں پیوست تھے سارا غصہ گھونسے کی صورت دیوار پر نکلا تھا۔

☆☆☆

برآمدے میں بچھی چارپائیوں پر وہ دونوں لیٹی تھیں۔ بلقیس نے منہ پر دوپٹا ڈال رکھا تھا تاکہ چاند کی سنہری کرنیں آنکھوں میں نہ چبھیں، پورے چاند کی روشنی بھی سب کے لیے رومانوی نہیں ہوتی۔ بہت سوں سے تو وہ پرسکون اندھیرا بھی چھین لیتی ہے جس میں اپنے حال سے نگاہ بچا کر کچھ دیر خوابوں کی ٹھنڈی وادی میں جا سوئیں۔ ہوا، درخت، مٹی اور چاند کی روشنی رات کو بھگونے میں پوری طرح ناکام تھیں اگر کچھ کامیاب تھا تو صرف دھانی آنکھیں، وہ دونوں ہاتھ توبہ کے انداز میں جوڑے رخسار کے نیچے دبائے گھر کے کونے میں جلتے زرد بلب کو مسلسل تک رہی تھی۔

برساتی پتنگوں کا بلب کے گرد ہجوم تھا وہ گرم بلب سے ٹکرا کر جلتے، گرتے، مرتے پھر نئے آجاتے۔ پتنگوں سے نگاہ ہٹا کر بلقیس کو دیکھا، وہ بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ منیبہ کے رخسار پر پھیکی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی بلقیس تب ہی پرسکون نیند سوتی تھی جب اس گھر کا واحد سربراہ گھر سے باہر ہوتا تھا۔ اگر وہ گھر پر ہوتا اول تو لڑائی جھگڑا ہی رہتا، نہیں تو اپنے جیسے اوباش دوستوں کو چار گز کی چھوٹی سی بیٹھک میں لیے بیٹھا رہتا۔ بیٹھک کی پھٹی درزوں سے ساری رات بدبودار دھوئیں، فحش قہقہے ابلتے۔ بلقیس کمرے کے دیمک زدہ دروازے کو چٹخنی چڑھا کر ساتھ چارپائی کی رکاوٹ لگادیتی۔

''ہونہہ دیمک زدہ دروازہ بھی کبھی طوفان کا مقابلہ کرسکا ہے بھلا پھر بھی کمزور عورت اس کے آگے رکاوٹ لگا کر خود کو محفوظ سمجھتی ہے۔'' البتہ بلقیس کی تسلی کے لیے اتنا سامان ہی کافی تھا، ضروری کام سے بھی منیبہ کو باہر نکلنے نہیں دیتی تھی، ساری رات آنکھیں گزرتی، اور جب وہ باہر ہوتا تو دونوں ماں بیٹی سکون سے ہوتیں کہ اس جیسے بھی وہاں ہی پڑے ہوں گے جہاں کہ وہ خود، اس وقت بلقیس مدہم خراٹوں میں گم تھی۔ منیبہ نے دوسری جانب کروٹ بدل لی۔ پہلے ایک آنکھ کا پانی دوسری میں ٹپک رہا تھا اب دوسری والی پہلی کا قرض لوٹا رہی تھی۔

☆☆☆

شام ہونے والی لڑائی اس گھر کی پہلی یا آخری لڑائی نہیں تھی۔ صبح شام ایسی لڑائیاں دم توڑتی تھیں۔ امجد بلقیس کو گالیاں دیتا، بازو سے پکڑ کر کاغذ کی دھمکی دیتا دروازے تک لے جاتا تھا، کبھی بلقیس اس کی منتیں کرتی کبھی منیبہ۔ منیبہ نے اُسے کم ہی خوش دیکھا تھا، اکثر تو جوا ہار جاتا۔ اگر کبھی قسمت سے جیت جاتا اپنی خوشی خود مناتا تھا اسے آج بھی یاد تھا جب وہ بمشکل پانچ چھ برس کی ہوگی ابا صحن کے بیچ و بیچ بھونی ہوئی مرغی کھا رہا تھا۔ وہ جا کر پاس کھڑی ہوگئی، کبھی ابا کے منہ کو کبھی بوٹی کو تکتی، کافی دیر بعد اس نے ٹانگ کی ہڈی اسے تھمادی، شاید کہیں گوشت کا پھوس اڑا ہوگا۔ منیبہ خوش ہو کر اسے چوسنے لگی، بلقیس تپ کر اٹھی تب تک وہ پانی پی کر ڈکار بھی لے چکا تھا، اس نے بچی کے ہاتھ سے ہڈی لے کر فرش پر ماری۔

''تیرے حلق سے اتر کیسے جاتا ہے، جب تیری اپنی اولاد تیرا منہ تک رہی ہو۔''

''چل چل لعنتی۔'' وہ نخوت سے بولا۔ ''میں نے پیدا کی تھی؟ تو نے کی تھی تو کھلا۔''

''میں بھی کہیں کوڑے سے اٹھا کر نہیں لائی تھی۔'' وہ منیبہ کو لے کر چولہے کے پاس بیٹھ گئی چنگیر میں رکھی باسی روٹی کے ٹکڑے شوربے میں بھگو کر اس کے منہ میں ڈالتی رہی۔ ''تجھ جیسے منحوس کے گھر اللہ نے پھول سی بچی دے دی نا، اس لیے ناشکرا بنا ہے۔''

امجد کی جانے بلا وہ منہ پر مفلر ڈالے خراٹے مارتا سو رہا تھا، اور منیبہ بے دلی سے پھیکی روٹی کھاتی ماں کو خفگی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی جان تو بچی کچھی مسالا لگی ہڈی میں تھی، تب اماں بہت بری لگی تھی۔

''اماں کو نہیں ملی تو میری بھی چھین کر پھینک دی۔'' لیکن اس وقت بان کی ٹوٹی چارپائی پر لیٹے ہوئے بھی اس نوالے کی تراوٹ اپنے حلق میں محسوس ہوئی، بے ساختہ نگاہ پورے چاند کی حکمرانی میں دب دب کر جھانکتے تاروں پر گئی، کتنے لمحے اس روشنی میں ابھر آئے۔

☆☆☆

کھلی رنگت چمکتے رخساروں والی گیارہ بارہ سالہ منیبہ تھڑوں پر کھیلتی اچانک کنول کے گھر چلی گئی، کوئی پہلی بار نہیں گئی تھی۔ پرانی سہیلی تھی بلقیس کے ساتھ تو اکثر ہی چلی جاتی تھی بلقیس نے اکیلے جانے سے منع کر رکھا تھا، اس کا کیا تھا وہ تو ہر جگہ ہی جانے سے روکتی تھی۔ کنول کے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑے اس کی چمکتی دھانی آنکھیں پھیل گئیں، غلافی پپوٹے پلکوں کی باڑ سے ڈھک گئے۔ عید، بقرہ عید، شب رات کچھ بھی نہیں تھا، کنول کا ابا نیاز اس کے ہاتھ میں چمکیلی چوڑیاں ڈال رہا تھا، اس سے نظر ملتے ہی کنول چہکی اور چوڑیاں بجاتے اس کے قریب آئی۔

''ابا لے کے آیا ہے، اچھی ہیں ناں؟'' اثبات میں سر ہلاتے وہ سوچ رہی تھی۔ ''اُس کا ابا سنار، لوہار، کمہار کچھ بھی نہیں تھا۔ بڑی سڑک کے پٹرول پمپ پر گاڑیاں صاف کرتا تھا اور چوڑیاں لے آیا۔ ابا بھی کچھ لاتا ہے۔ اس نے اپنے ابا کی صرف ڈانٹ پھٹکار ہی سنی تھی۔ چیزیں تو اماں لاتی ہے۔''

☆☆☆

بلقیس سناروں کے گھر کام کرتی تھی، جھاڑ پونچھ، برتن، کپڑے دھونے کے ساتھ چھوٹے موٹے کئی کام بھگتا دیتی جس کا اتنا معاوضہ مل جاتا گھر کا خرچ چل جاتا تھا، ان کے بچوں کے ٹوٹے کھلونوں کی ٹوکری دے کر چھوٹی سی منیبہ کو ایک کونے میں بیٹھا دیتی، کھیلتے کھیلتے اس کی آنکھ لگ جاتی وہ وہاں ہی سو جاتی، چیونٹیاں مکھیاں چڑھنے لگتیں، بلقیس اسے جھاڑ کسی چارپائی کی پائنتی پر لٹا دیتی، بے فکر زندگی تھی، جیسے جیسے بڑی ہوئی مس ثمینہ کے کہنے پر سرکاری اسکول میں بٹھا دیا، مس اپنے ساتھ لاتی لے جاتی۔

سناروں کے گھر کے بچے ہوئے کھانے ماں بیٹی کے کھانے کے بعد بھی بچ جاتے، پھر اس بچے کھچے پر لڑائی ہوتی، منیبہ کو یاد نہیں تھا لڑائی کس چیز پر تھی، لیموں کے اچار یا پھپھوندی لگے دیسی گھی پر، امجد مانگ رہا تھا، لکڑیاں جلاتی بلقیس گہرے سانس لیتی اٹھی۔ درخت کے نیچے لگے ہینڈ پمپ کی کائی زدہ زمین پر یک دم جھکتی چلی گئی، بلقیس کو ابکائی پر ابکائی آرہی تھی، امجد چونکا۔ اپنے سوکھے بدن کو کڑکڑاتا اٹھا۔ منیبہ کا خیال تھا ابا اماں کو تھامے گا، چکر کھا رہی ہے، گر نا جائے۔ لیکن اس نے اس کی چٹیا کھینچی۔ بلقیس بے دم سی ہو کر لڑکھڑائی، امجد اپنی مخصوص گالیاں بک رہا تھا۔

''میں بھی کہوں سناروں کے گھر سے روز روز چیزیں کیوں آرہی ہیں اور وہ چھلا۔''

PakiBooks.Site

بلقیس کے ”چھوڑ چھوڑ“ کہنے کے بیچ وہ نخوت سے چلا رہا تھا۔ ”تو کہہ رہی تھی بچے کا صدقہ دیا سنارن نے۔ یوں کیوں نہیں بتاتی سنار کی مہربانی ہے“

”الزام لگاتے شرم نہیں آتی تجھے۔“ بلقیس تڑپ گئی۔

”گند تو گھولے شرم میں کروں۔ واہیات عورت۔“ اس کی دھاڑ پر کانپتی ہوئی منیبہ نظر جلتی لکڑیوں پر گئی وہ غصے میں اکثر چولہے کی طرف بڑھتا تھا جلتی لکڑی نکال کر مار پیٹ شروع کر دیتا۔ منیبہ نے پاس رکھا پانی کا جگ لکڑیوں پر انڈیل دیا، پانی آگ کی تپش کم کر دیتا ہے۔ اس نے عقل استعمال کی۔

”اللہ سے ڈر، خدا کا واسطے چھوڑ دے“ وہ تکلیف سے بلبلا رہی تھی۔

”حرام کاری تو کرے، اللہ سے میں ڈروں۔ ہیں۔“

”تو مر گیا ہے کیا...... جو یوں الزام لگا رہا ہے۔“ بلقیس کے کہنے پر اسے مزید تاؤ آیا۔ ”اے“ کہتے اسے چولہے کے پاس اتنی زور کا دھکا دیا تھا، بھاری بدن کے گرنے سے زیادہ بلقیس کے حلق کی آواز تھی۔ وہ نخوت سے اسے اور ڈری سہمی منیبہ کو گھورتا جا چکا تھا اور بلقیس بہت دیر کراہتی رہی۔

☆☆☆

جانے کون، کہاں سے کب اس برقعے والی خالہ کو بلا لایا تھا۔ منیبہ نے اسے چھوٹا سا صندوق تھامے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ جس گھر میں جاتی تھی اگلے دن اس گھر کے بچے بہت خوش ہوتے۔ مٹھائی کھلاتے، ٹکے بانٹتے اور ایک ہی بات کہتے تھے۔

”خالہ صندوق میں کا کالائی تھی، اچھے بچوں کو دیتی ہے لڑنے والوں کو نہیں دیتی۔“

”میں نے تو کبھی کسی سے لڑائی کی تھی نہ پٹائی، پھر میرے گھر کیوں نہیں دے کر گئی، شاید ابا کے ڈر سے وہ مار پیٹ کرتا ہے نا۔“ دروازے کے تھڑے پر بیٹھی منیبہ خالہ کو صندوق اٹھائے واپس جاتے دیکھ کر سوچتی رہی۔

اس واقعے سے بھی امجد پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ ویسے کا ویسا ہی تھا، البتہ بلقیس بہت بدل گئی تھی، امجد سے لڑنا تو کیا بات کا جواب دینا بھی چھوڑ دیا تھا، منیبہ کو ساتھ دبکائے روتی رہتی، کھانا پکا کر، منیبہ کو تھماتی کے ابا کو دے آئے۔ تب وہ اتنی چھوٹی تھی ناراضی کی سمجھ نہیں آتی تھی مگر آج رات کے سناٹے کو چیرتی جھنگروں کی آوازوں میں اماں کے پرانے آنسو قینچیوں کی طرح چیرتے محسوس ہوئے۔

”ابا کتنا ظالم ہے تو، ظلم کا دوسرا مطلب مردانگی ہے کیا؟“ تنفر سے دانت بھینچے نفی میں سر ہلاتی رہی۔ لبالب بھری دھان سے قطرے امڈے، رخساروں سے ہو کر مخروطی انگلیوں پر ٹپ ٹپ گرتے رہے۔

☆☆☆

جہاز کے خلیج کی حدود میں داخل ہونے کی معلومات دینے کے بعد وہ کچن کی جانب آ گئی تھی، جہاں شنزا اور سارہ مسافروں کی بچائی جانے والی خوراک کو تلف کرنے اور بچ جانے والی کو محفوظ کرنے میں سرگرداں تھی۔ دروازہ کھولتے ہی، اس نے خود کو نارمل کرتے گہرا سانس لیا مسکراہٹ میں پھیلا[illegible] کر دکھتے جبڑوں کو دوبارہ سکون محسوس کرتے بولی۔

PakiBooks.Site

”مجھے لگتا ہے ہم انسان نہیں، ربڑ کی گڑیاں ہیں۔“ صبح سے مسکرا مسکرا کر اس کے جبڑے دکھنے لگے تھے، سارہ نے گندے ڈسپوزایبل برتن بن میں پھینکتے اُسے اچنبھے سے دیکھا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کی ہو۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں۔“ اپنی ہیڈ کے ایسے دیکھنے پر اسے خفت ہوئی تھی۔

”تمہیں ابھی تک نہیں پتا چلا ہم انسان نہیں۔ ایئر ہوسٹس، نرس، گائیڈ، اٹینڈنٹ۔ ہم سب عورتیں خدمت گزار ہوتی ہیں اور خدمت گزار انسان کب سے ہوئے؟ جو ٹکٹ خرید کر جہاز میں سوار ہو گیا، سو ہمیں خرید لیا۔ جتنا سفر، اتنی دیر کی باندی۔“

اس نے نروٹھے پن سے انہیں ایسے دیکھا جیسے وہ اتفاق نہیں کرتی اور مصنوعی کرسٹل کی سلیب سے

[illegible] انڈیلنے لگی۔ کچھ توقف کے بعد موضوع بدلتے کہا تھا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا آپ پسنجر میں چلی جائیں، میں دیکھ لیتی ہوں۔“

”خیریت، کوئی پسنجر تنگ کر رہا ہے؟“ اس سے پہلے منیبہ جواب دیتی شنزا نے اسے مشکوک نگاہ سے دیکھا۔

”آج تو یلماز حسین ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ پھر بھی؟“

”پھر بھی سے کیا مراد ہے؟“ منیبہ کے لہجے میں یک لخت تلخی ابھری۔

سارہ نے شنزا کو تنبیہی آمیز گھرکا تو وہ کندھے اچکاتے۔ ”مذاق کر رہی تھی۔“ کہتی رخ پھیر گئی۔ مگر اس کا انداز اسے اندر تک چیر گیا تھا جتنا وہ اس موضوع سے بچنا چاہتی تھی اتنا ہی زبان زد عام ہو رہا تھا۔ وہ جب بھی جہاز میں سفر کرتا پسنجرز رو میں منیبہ کی ڈیوٹی ہوتی اور وہ بار بار اسے بلاتا سب کو واضح محسوس ہوتا تھا، جس کانفرنس یا سیمینار میں ایمپلائیز کی جانب سے منیبہ سلیکٹ ہوتی، ممکن نہیں تھا وہاں یلماز حسین نا ہو۔ برج خلیفہ کے سیمینار کے بعد یلمی نے اپنے ذاتی جہاز کے لیے منیبہ کو بطور ایئر ہوسٹس آفر کی تھی، یلماز کی جانب سے خاصا پریشر بھی تھا، مگر منیبہ نے یہ کہہ کر معذرت کر لی۔

”سوری سر! مجھے پبلک فلائٹ میں جاب کی اجازت ہے، پرسنل میں نہیں۔“ سارہ نے اسے بہترین پیکیج کی اس آفر پر بہت قائل کیا۔

”بے وقوف! لڑکیاں تو اس آفر کے لیے مر رہی ہیں اور تم نے انکار کر دیا۔ دو ڈھائی سو لوگوں کی خدمت کی جگہ صرف دو چار لوگ۔ کیوں؟“

”دو ڈھائی سو لوگوں کی خدمت دو چار مردوں کی باندی بننے سے کہیں بہتر ہے، سارہ!“

اسے اپنا وقار بہت عزیز تھا اس کی یہی محتاط انداز یلماز کو مقناطیس کی طرح کھینچتا رہا تھا، وہ اس کھنچاؤ کو غیر محسوس طریقے سے رد کرتی رہی۔ شنزا کا رخ دوسری جانب تھا تب اس نے ملتجی نگاہوں سے سارہ کو دیکھا، اس نے جواباً ہاں میں سر ہلایا۔ سارہ نے المونیم کے دروازے کے ساتھ لگے قد آور آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنا اسکارف درست کیا ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلاتے ہوئے باہر نکلنے لگی تھی کہ وہ فوراً اندر داخل ہوا تھا۔ جہاز کے کچن کیبن میں کسی مسافر کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی لیکن وہ عام مسافر نہیں تھا وہ یلمی کے آنر کا سب سے چھوٹا بیٹا یلماز حسین تھا۔ سارہ اور شنزا اسے دیکھ کر اچھی خاصی چونک گئی تھیں۔ منیبہ ٹپٹائی ضرور تھی مگر ظاہر ہونے نہیں دیا نرم تاثر لیے گردن اٹھی رہی، کانچ جیسے نرم تاثر کے آگے وہ واچ لہراتے ہوئے تنبیہ کر رہا تھا۔

”یقیناً یہ آپ کی واچ ہے، راستے میں گری ہوئی تھی۔ بہت لاپروا ہیں آپ منیبہ! چیزوں کے بارے میں احتیاط کیا کریں۔ سمجھیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جتلایا۔

”ایکچوئلی سر ایک پسنجر کو ٹائم فوبیا ہے۔ ان کے خوف سے اتاری شاید تب گر گئی۔“ اس کے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے سپاٹ سا کہا تھا۔

”آئندہ احتیاط کروں گی۔“

وہ کہنے تو کچھ اور آیا تھا مگر سارہ شنزا کو دیکھ کر بات بدلی اب اس کے جواب کا غصہ مشترکہ کہتے ہوئے اتارا۔

”اور آپ سب یہاں کیوں اکٹھی ہیں۔ باہر پسنجرز کو کون اٹینڈ کرے گا، ڈیوٹی سے اتنی غفلت۔ میں صرف مینجمنٹ کو دیکھنے کے لیے یہاں سفر کرتا ہوں، ورنہ کوئی شوق نہیں خواری کا؟“ سارہ فوراً سے باہر نکل گئی وہ دانت جمائے اسے تکتا جیسے آیا تھا ویسے چلا گیا۔

☆☆☆

اس رات کے آنسو امڈتے جاتے تھے ہر قطرے میں چاندنی جذب ہو کر پرانے منظر واضح کر دیتی۔ اور وہ منظر تو رہ گیا تھا جب وہ کنول کے دروازے پر کھڑی تھی، اس کی حسرت بھری نگاہ پر نیاز کا پان سے

Free Download

and

Read Online

From :



PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

رنگا منہ کراہت آمیز پھیلا، اس نے کنول کے ہاتھ سے چند چوڑیاں اتاری اور منیبہ کو اشارے سے اپنے پاس بلایا تھا، نیاز کے دیکھنے میں عجیب سا تاثر تھا وہ سہمی ہوئی اس کی جانب بڑھی، چوڑیاں اترنے پر کنول کا منہ بن گیا تھا، نیاز نے اسے خوش کرنے کے لیے دس کا نوٹ پکڑا کر کہا۔

''جا چوک سے اپنے اور منیبہ کے لیے اچھی سی چیز لے کر آ۔'' وہ خوش ہو کر باہر کو بھاگی نیاز نے منیبہ کی کلائی پکڑ کر مسکراتے ہوئے اپنی گود میں بٹھایا اور وہ چوڑیاں اس کے ہاتھ میں ڈالیں۔

''تجھے اچھی لگ رہی ہیں۔''

کہتے ہی رنگے منہ کی بدبو اسے کان کی پشت پر محسوس ہوئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ہاں میں سر ہلایا، نیاز کے چہرے پر کمینگی رینگی۔

''دفع کر اپنے ابے کو، تو نے جو جو لینا ہے میں لا کر دوں گا، مجھے بتایا کر۔''

حلاوت بھرے لہجے سے کہتے اس کی ہتھیلی پر ہاتھ پھیرا اس کے ہاتھوں کی کھردراہٹ پر وہ کسمسائی۔ اس سے پہلے وہ مزید کچھ کہتا، باہر صحن میں کوئی آہٹ ابھری، نیاز کی بیوی پڑوس میں گئی ہوئی تھی اس کی آمد کے خوف سے یک لخت منیبہ کو گود سے اتارا۔

''اچھا یہ لے جا۔ کل آنا۔ نئی لاؤں گا۔''

وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا جانے کیسی آہٹ تھی۔ بے آسرا کے لیے اللہ کی مدد شیطان کو بھگانے کے لیے غیر مرئی آہٹیں بھی ضرور کرتی ہے۔

بلقیس کو جیسے ہی اس نے معصومیت سے ساری بات بتائی، اس نے چوڑیاں اتار کر پھینکتے غصے سے کہا تھا۔

''اگر کسی بندے سے کوئی چیز لی ہاتھ کاٹ دوں گی تیرے۔ کنول کے گھر کا رخ بھی کیا تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ لوگوں کو سب پتا ہے تو کس کی بیٹی ہے، توڑ مروڑ کے کھا جائیں گے۔''

تب اماں کی بات ذرا پلے نہیں پڑی تھی مگر اب سمجھ میں آتے ہی جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، آنسو تھم گئے، سانس تیز چل رہی تھی نگاہ آسمان پر اٹھی۔

''اللہ جب گھر کا محافظ کمزور تھا، مجھے پیدا کیوں کیا۔''

اکڑوں بیٹھے دونوں بازوں گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر تکلیف کے وجد میں ہلتی اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش میں تھی، چارپائی کی چرچراہٹ پر بلقیس کی نیند ٹوٹی منہ سے دوپٹا ہٹا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ گم صم سی بیٹھی عجیب طرح سے ہل رہی تھی۔

''تو سوئی نہیں۔ کیا ہوا؟'' اتنا سا بولتے ہی اسے شدید کھانسی کا دورہ پڑا وہ سر اونچا کرتے ہوئے سانس بحال کر رہی تھی۔ اس کی آواز سے ہلتی منیبہ کی حرکت تھمی، چونک کر اماں کو دیکھا تھا، گھٹنوں سے بازو کھولتے ہوئے جھٹکے سے اٹھی۔

''تو نے رات پھر دوائی نہیں پی؟'' کھانسی روکنے کی ناکام کوشش کرتے نفی میں سر ہلاتی بلقیس اٹھ بیٹھی۔

''اماں تو یہ بالیاں بیچ کر اپنا علاج کیوں نہیں کروالیتی۔ میری خاطر ہی سہی۔'' وہ خفگی سے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی، تاکہ اس کا سیرپ اٹھا لائے، بلقیس نے اسے اشارہ کرتے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں روکا تھا۔

''دوائی رہنے دے، تھوڑی سی چینی دے دے۔ منہ میں رکھ لیتی ہوں۔''

''دوائی تو نے سر میں مارنی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، دن میں تین بار پینی ہے تو ایک بار بھی نہیں پیتی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اندر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''صبح پی لوں گی اب رہنے دے، چینی دے دے۔''

بلقیس کی پکار کے باوجود گردن جھٹکتی، طاقچے سے سیرپ کی بوتل اٹھا کر ہلاتی ہوئی باہر آئی، اسے محسوس ہوا جیسے بوتل خالی ہو، ہلا جلا کر دیکھتی یقین دہانی کے لیے چلتی زرد بلب کے قریب گئی، بوتل اونچی کر کے روشنی میں دیکھی، معمولی سے چند قطرے بہہ رہے تھے، وہ حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے پلٹی۔

''یہ کب پی لی تو نے۔ کل تو آئی تھی، اتنی جلدی ختم؟''

بلقیس کیا بتاتی۔ وہ گردن جھکائے دہری ہوتی کھانس رہی تھی منہ پر دوپٹا رکھ لیا، منیبہ ابھی سنا ہی نہیں، قریب آکر پھر سے پوچھا۔ ''اماں یہ تو خالی ہے۔ دوائی کہاں گئی؟'' کھانسی کے وقفے میں وہ بولی تھی۔

''کہاں جانی...... تیرا باپ پی گیا...... مجھے چینی دے دے۔''

امجد کو جب کہیں سے نشہ نہیں ملتا تھا گھر میں رکھے کھانسی، زکام کے سیرپ چڑھا جاتا تھا، کل بھی چڑھا گیا یہ سوچے بغیر بلقیس کی کتنی اہم دوائی ہے۔ سنتے ہی دھانی آنکھوں میں غضب ناکی جھلکی بدن کی ساری رگیں تن گئیں، ماں کی حالت دیکھ کر اس کا بس نہیں چل رہا تھا امجد کو آج قتل ہی کر دے۔

''تبھی تو کہہ رہی ہے چینی دے دے۔'' غصے سے کانپتے جبڑے روکتے ہوئے بولی تھی۔

''اس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر دے دے۔ غصہ نا کھا۔'' بلقیس منمنائی۔

تمکین ہوتے جبڑے جما کر اس نے پوری قوت سے بوتل دیوار پر ماری، اور بلقیس کی پٹی سے لگ کر پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔

''ابا تو مر کیوں نہیں جاتا، روز کتنے لوگ مرتے ہیں۔ کوئی بددعا، کوئی دوا اس پر اثر کیوں نہیں کرتی۔ اماں وہ مرتا کیوں نہیں۔''

چارپائی کی پٹی پر سر مار مار کر وہ روئے گئی۔ بہت سا کھانس لینے کے بعد بلقیس کی کھانسی کو آرام آہی گیا تھا وہ اس کا سر آہستہ آہستہ تھپکتی رہی۔

''تو کیوں رو رہی ہے پاگل! چل اٹھ شاباش۔''

پھر سے کھانسی اٹھنے لگی، آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر کو اٹھا، وہ اٹھ کر چمچ میں چینی لے آئی اور بلقیس کی ہتھیلی پر رکھی، ہتھیلی منہ کی جانب پھانکتے ہوئے وہ نقاہت سے بولی۔

''ابھی تو میں زندہ ہوں، کیوں روتی ہے تو۔''

اپنے رونے کا کون کون سا سبب بیمار ماں کو بتاتی چارپائی پر بیٹھی اور اس کے ساتھ لپٹ کر لیٹ گئی اس کی وہ ساری رات اللہ سے شکوے شکایتیں کرتے گزری تھی، ان ہی شکایتوں میں مس ثمینہ کی آواز تواتر سے آتی رہی۔

''بے وقوف، اللہ ہمارا مالک ہے، مالک سے شکوے شکایتیں نہیں چلتیں۔'' اور وہ ہمیشہ کی طرح اڑ کر بولی۔

''مالک ہی کہتا ہے اس کا دل ستر ماؤں سے زیادہ نرم ہے، ماں سے تو بچے شکوے بھی کرتے ہیں شکایتیں بھی۔ ضد کرکے، اپنی بات پوری کروا ہی لیتے ہیں، پھر میں کیوں نا اپنے مسئلے اسے بتاؤں۔''

''اس سے مدد مانگ، جیسے ماں کی گود مانگتے ہیں۔ وہ عالم غیب ہے، مسئلے نا بتا، اسے پہلے ہی پتا ہیں۔''

☆☆☆

رات کے اس پہر مس ثمینہ کی آواز صبح کی نرم ہوا جیسی لگی تھی، صبح ہوتے ہی کاموں سے فارغ ہو کر ان کی طرف چلی گئی مس ثمینہ بے اولاد مگر ممتا بھری خاتون تھیں، منیبہ کیا محلے کا کوئی بھی شخص دل ہلکا کرنے کو انہیں ڈھونڈتا تھا، ان کے گھر کا پرسکون، صاف ستھرا ماحول دل میں طمانیت بھر دیتا، وہ بھی اس طمانیت کو ڈھونڈتی ان کے پاس جا کر اپنا دل ہلکا کر آتی۔ اسکول تک انہوں نے ہی منیبہ کو پڑھایا تھا اپنے ساتھ لے جاتیں اپنے ساتھ لے آتیں، دسویں اچھے نمبروں سے پاس ہوئی، ان ہی کے اصرار پر بلقیس اُسے آگے پڑھانے پر راضی ہوئی تھی۔ فیس کاپی کتاب کا خرچ انہوں نے اپنے ذمے لیا اور اس کا داخلہ کروا دیا۔ انٹر کالج اسکول سے کچھ فاصلے پر تھا، اسکول سے آگے اسکول کی ماسی کی ڈیوٹی لگا دی تھی اسے کالج تک لے جانے لانے کے عوض مس ثمینہ اسے چپکے سے کچھ دے دیتیں۔ ماسی لالچ میں پہلے ہی اسکول کے گیٹ پر کھڑی انتظار میں ہوتی۔ مشکل سے سہی مگر یوں منیبہ کا ایف اے قدرے بہتر

...میں ہو گیا تھا۔

...ڑی کا فیروزی پھولوں والا پردہ ہٹتے ہی سرخ ...وں سے بنا چھوٹا سا مستطیل صحن تھا، جس کے ایک ...نیم کے درخت کے نیچے کھرا بنا کر چھوٹی سی ...ی رکھی تھی، ساتھ ہی دیوار میں لگی چھتی کے ...پانی کی سبز موٹر نصب تھی۔ چھتی پر سرخ صابن، ...ک، جھاواں، نہانے کی جالی، نیل کی بوتل رکھی ...دوسری جانب سیمنٹ کا چبوترا بنا کر مٹی کے تیل ...لہا رکھا ہوا تھا۔ شوکیس کے ساتھ دیگر برتن رکھ کر ...چی خانے کی شکل دی گئی تھی۔ سامنے برآمدے ...ٹیوشن کے لیے آئے آٹھ دس بچے چٹائی پر بیٹھے ...ل ...ل کر سبق یاد کر رہے تھے۔ تیل کے چولہے کے آگے مس ثمینہ بیٹھیں کچھ بنانے میں مصروف تھیں، اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر مسکرائیں سلام کا جواب سر ...ہاتھ پھیر کر دیا تھا۔

''خیریت سے آئیں؟''

''جہاں ابا ہو وہاں خیریت ہو سکتی ہے بھلا؟'' ...کے زخمی لہجے پر ان کا دل بھر آیا، مگر ہنس کر ٹال ...

''جیسے اولاد اللہ کی طرف سے آزمائش ہے بعض ...قات ماں باپ بھی بن جاتے ہیں۔ آزمائشوں میں ...ت سے کام لیا جاتا ہے، بے ہمتی سے نہیں۔''

''لیکن مس میرا باپ آزمائش نہیں، سزا ہے۔'' وہ مایوسی سے کہتے چوکی کھینچ کر ان کے پاس بیٹھ ...ی ''میری ماں کے، میرے ناکردہ گناہ کی سزا۔ ...مجھ میں نہیں آتا اس سزا سے کیسے چھٹکارا پائیں۔ ...ئی دعا۔ کوئی اسم، کوئی وظیفہ، جادو، ٹونہ کچھ تو ہو جو ...بے حس پر اثر کرے۔'' وہ روندھی آواز میں سارا ...سنا کر ان کا چہرا تکنے لگی، مس ثمینہ کے پاس ...لانہ ہنکارا تھا، کچھ سوچ کر نرمی سے بولی تھیں۔

''امجد ان لوگوں سے ہے منیبہ، جو کبھی ٹھیک نہیں ...سکتے، جن کے دلوں پر قفل پڑ جاتے ہیں۔ جب پتا ...ایک چیز ٹھیک نہیں ہو سکتی، تو ضروری ہے ہر چیز ...ٹھیک کرنے میں گھسا دو۔''

''تو کیا کریں، کہاں جائیں ہم ماں بیٹی۔ اماں کی طبیعت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ کھانسی میں فرق کیسے پڑے دوا تک نہیں چھوڑتا۔''

''ہک ہا۔'' مس نے گہری سانس لی۔ ''چلو یہاں سے اٹھو۔'' انہوں نے اسے پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا اور برآمدے میں ٹیوشن کے لیے آئے بچوں کی جانب اشارہ کیا۔ ''چائے بنا رہی ہوں وہاں بیٹھ کر آرام سے پیتے ہیں۔''

''آپ جائیں میں لاتی ہوں۔'' منیبہ شکل صورت کی ہی نہیں دل کی بھی خوب صورت تھی۔ مس کو بھیج کر پھیلے دو چار برتن دھوئے، چائے کپوں میں انڈیلی، لا کر چھوٹی سی تپائی پر رکھی۔ ٹیوشن کے بچوں کو چھٹی دے کر انہوں نے کارنس پر رکھے بسکٹوں کی جانب اشارہ کیا۔

''وہ اٹھا لاؤ۔'' اس نے پیکٹ اٹھا کھول کر سامنے رکھ لیا، کتنا سکون تھا اس گھر میں نیم کے درخت پر پرندوں کی بے فکر چہکار، صاف ستھرا گھر، خاموشی میں موتیوں کی طرح پروئی مس ثمینہ کی آواز، نا مار دھاڑ گالی گلوچ، نا برتن ٹوٹنے کی چھنکار پھٹکار، نہ اماں کی خوف ناک کھانسی، ماحول نے چائے کی لذت کو بڑھا دیا تھا۔

''میرا دل کرتا ہے مس! آپ کے گھر ہی رہ جاؤں۔''

''گھر اپنا ہی نعمت ہوتا ہے پگلی!''

''کیا کریں اس نعمت کا، جو کاٹ کاٹ کھائے۔''

مس نے چائے کا گھونٹ بھر کر کپ نیچے رکھا۔

''بلقیس کو شہر لے جاؤ وہاں ٹی بی کا علاج ہوتا ہے، کب تک کھانسی کے سیرپ پیتی رہے گی۔''

''پیسے؟'' یک لفظی جملہ سکتے کی مانند تھا۔ ''اماں سے اب کام نہیں ہوتا، مجھے کسی گھر کا کام اٹھانے نہیں دیتی، کہ کہیں سے دو چار پیسے آجائیں، اگر کوئی دے دے تو ابا چھین کے لے جاتا ہے، ایسے علاج ہو سکتا ہے بھلا؟'' لمحے لگے تھے مس کو بولنے میں۔

''تو کچھ اور کیوں نہیں کرتی۔''

''کیا کروں آپ بتا دو۔ ایف اے پاس کو کون

فنسٹر لگائے گا۔'' اس کا استہزا افسردہ کر دینے کے لیے بہت تھا۔

مگر وہ مس ثمینہ تھیں حل ڈھونڈنے والیں۔

''میں تمہارے پاس کچھ بچوں کو بھیجوں گی، انہیں ٹیوشن پڑھاؤ، اپنی تعلیم بھی جاری کرو۔ اللہ برکت دے گا۔'' اس کا تو سنتے ہی ایسے قہقہہ چھوٹا جیسے مس نے انتہائی احمقانہ بات کی ہو۔

''میرے پاس......'' گلابی ہونٹ دانت سے جکڑ کر بمشکل ہنسی روکتے ہوئے اپنی جانب انگشت سے اشارہ کیا ایک بار پھر ہنسی چھوٹ گئی۔ مس بھنویں جوڑے اسے خفگی سے دیکھتی رہیں۔

''اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات، لطیفہ تھوڑا سنایا ہے۔''

''مس۔'' اس نے سر ہلاتے ہنسی قابو کی۔ ''یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے، ایک نشئی کی بیٹی کو کوئی سڑک پر راستہ نہ دے۔ اپنے بچے بھیجے گا، وہ بھی پڑھانے کے لیے؟'' اس کی گردن مسلسل نفی میں ہل رہی تھی۔

''خود اپنا مذاق اڑاؤ تو دنیا اس سے زیادہ اڑاتی ہے، بے وقوف۔'' مس نے کچھ توقف سے کہا۔

''میری طرف آجایا کرو، کل سے سب بچوں کو تم پڑھانا۔''

یہ بات منیبہ کی سمجھ میں آگئی تھی، نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہی تھا

وہ روز تین بجے مس ثمینہ کے آنے لگی، چھوٹے بچوں کو وہ، بڑے بچوں کو مس پڑھا دیتیں، پڑھانا آسان مگر پڑھانے آنا خاصا مشکل تھا کوئی بہت دور نہیں ایک محلہ چھوڑ کر مس کا گھر تھا اور روز وقت مقررہ پر محلے کی چند گلیاں پار کرنی عذاب ہو جاتیں۔ کوئی امجد کا قرض خواہ آنکھوں میں ہوس لیے سامنے آکھڑا ہوتا، کوئی دوست امجد کا پوچھنے کے بہانے اشارے کنارے کرتا، اسے لانے لے جانے کی ذمہ داری بلقیس نے لے لی، یوں وقت میں پھر سے روانی آگئی۔

☆☆☆

جہاز اپنی منزل کی طرف تیزی سے محو پرواز تھا۔ زمین پر ٹمٹماتے تاروں کی بکھری کہکشاں سے اندازہ ہوتا تھا، سمندر کا سیاہ راج ختم ہوا چاہتا ہے، لینڈنگ کے حفاظتی اقدامات کی اناؤنسمنٹ کے کچھ ہی دیر بعد سینے میں سمٹے پہیوں نے زمین کی سطح سے رگڑ کھانی شروع کر دی۔ جہاز کے رکتے ہی سب مسافر ترتیب سے باہر نکلنے لگے تھے، سوائے یلماز کے، اس کے جم کے بیٹھنے کا انداز دیدنی تھا، ایک جہاز میں کم و بیش پانچ چھ ایئر ہوسٹس ہوتی ہیں دو خارجی دروازے پر کھڑی ''خدا حافظ'' کہہ رہی تھیں کچھ کچن کیبن میں سامان چیک کرتیں اور منیبہ پینجرز رو میں ان کی رہنمائی کرتی، خالی ہوتے جہاز کو دیکھ کر کچن سے برآمد ہوتی شنزا نے تحیر سے کہا تھا۔

''سر آپ؟''

''آپ چلیے میں آتا ہوں۔'' اس کے کہتے ہی ساری ایئر ہوسٹس باہر نکلنے لگیں سب سے پیچھے منیبہ تھی۔ وہ اسی سے مخاطب تھا۔

''آپ نے کہا تھا، آپ سب کو سب بتانے کی پابند ہیں تو میں آپ سے پوچھتا ہوں، آپ کمیٹڈ ہیں؟'' تندی کو نرمی میں بدلتے وہ آن واحد میں بولی۔

''پہلی بات میں نے دوران پرواز کہی تھی سر! اب ڈیوٹی آورز ختم ہو چکے ہیں سو......'' وہ کہہ کر بڑھنے لگی وہ تیزی سے آگے آگیا۔

''بٹ آئی وانٹ کمٹمنٹ۔''

''سر! آپ چاہتے ہیں میں یہ جاب چھوڑ دوں تو چھوڑ دوں گی۔ میں دوسری ایئر لائن میں اپلائی کر رہی ہوں۔''

''سوچ لو، ابھی بھی وقت ہے۔''

''سوچ سمجھ کر کہا ہے، سر!'' وہ کہہ کر رکی نہیں تھی تیزی سے بڑھی خارجی دروازے سے سر باہر نکالا۔ نیلے اسکارف کے سرخ، زرد ربن لگے باریک کنارے ہوا سے پھڑپھڑائے تھے۔ بے ریا چہرے کے ساتھ باہر نکلی تب پیچھے سے آواز آئی تھی۔

''ارے بات سنیے۔ آپ کا چھ سالہ کانٹریکٹ ہے۔ تین سال رہتے ہیں، آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔'' اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا خارجی دروازے سے جڑی لابی میں قدم رکھتے ہوئے وہ پھیکا سا مسکرائی اور تیز تیز لابی پار کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

جاتی گرمیوں کا عام سا دن تھا صبح سے ہوا بند اور گہرے بادلوں کی موٹی تہ کی پھیلائی گھٹن اور سے واپڈا کی مہربانی سے لائٹ بہت دیر سے بند تھی، گرمی سے گھبرائے بچوں کو پڑھا کر وہ جلد فارغ ہو گئی۔ بلقیس کے آنے میں کچھ دیر تھی، اسکول سے بچوں کی کاپیوں کا ڈھیر لائی مس ثمینہ ایک ایک کاپی کو بہت دھیان سے چیک کر رہی تھیں، اس نے فارغ بیٹھ کر اونگھنے کے بجائے کاپیاں دیکھنی شروع کر دیں۔ ایک بچے کی کاپی پر اخبار کا نیا کور تھا اس پر نظر دوڑاتے ایک اشتہار نے ساری توجہ کھینچ لی۔ انٹرنیشنل ایئر لائن یلمی کی جانب سے ایئر ہوسٹس کی ضرورت تھی، انگریزی میں چھپے اس اشتہار کو اس نے کئی بار غور سے پڑھا۔

''کیا پڑھ رہی ہو؟'' مس نے عینک کے اوپر سے دیکھا تھا اس نے کاپی ان کے سامنے کر دی۔

''کیا خیال ہے مس! میں اپلائی کروں؟ کوالیفیکیشن ایف اے مانگی ہے۔''

''بہت مشکل جاب ہے یہ۔ ہوس میں بھیگی نگاہیں کھا جاتی ہیں انہیں۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ میں تو پلی ہی ہوس بھری نگاہوں میں ہوں۔ بھلا ختم ہوئی ہوں اب تک؟''

سیلری پیکیج بہت پرکشش تھا بظاہر وہ ساری ایمانڈ پر اتر رہی تھی ایک انگریزی زبان کا مسئلہ تھا، تھوڑی کوشش سے حل ہو سکتا تھا، قسمت بار بار کب دستک دیتی ہے مس کو قائل کر کے اس نے ساری تفصیل اتاری۔ مشکل آن لائن فارم نکلوانے کی تھی، مس کی منتیں کیں اور انہوں نے کسی اسٹوڈنٹ سے نکلوا دینے کا کہا تھا۔

وقت تھا جو گزر نہیں رہا تھا کس طرح یہ خبر اماں کو سنائے، آج ہی ٹیسٹ، انٹرویو دے اور سلیکٹ ہو جائے، تنخواہ ملے سارے مسئلے ختم ہو جائیں اور بلقیس تھی، جو آج آکر ہی نا دے رہی تھی، بہت دیر انتظار کے بعد اس نے کاغذ تہ لگا کر مٹھی میں دبایا، خود ہی گھر کے لیے نکلی، پرسکون زندگی کے خواب، امید، رنگ کسی شبنم کی طرح اس کی بند مٹھی بھگو رہے تھے۔ اپنی گلی کا کونا مڑا ہی تھا گھر کے کھلے دروازے سے عورتوں کو اندر باہر آتے جاتے دیکھ کر کسی انہونی نے بھیگی شبنم کو اوس کی طرح گرا دیا۔ دھڑکن کی تیزی کے ساتھ قدم خود بخود گھر کی جانب اٹھے تھے ان چند قدموں میں صبح کا سارا منظر سامنے تھا۔

آدھی رات کو گھر آئے امجد کے ساتھ کانوں کی بالیاں بھی غائب تھیں چادر چارپائی ہر چیز جھاڑی جب امجد کی خالی چارپائی کو دیکھا بلقیس تنفر سے بولی تھی۔

''تیرا ککھ نا رہے امجد! تجھے بچی نصیب نا ہوں۔ میں اپنی دوائی نہ لائی کہ بچی کے کان ڈھکوں گی، تو نے سوئی کی اتار لیں۔''

''اماں! میرے کان نہ ڈھک، سر ڈھک۔ مجھے ڈھکنے کے لیے تیری ضرورت ہے۔''

روتے ہوئے کھانستی ماں کی پشت سہلائی، ناشتا کروایا مگر صدمے سے بار بار شدید کھانسی اٹھتی رہی تھی، عورتوں کو دیکھ کر دھواں دھار کھانسی نے کان کے پردے ہلا دیے ان چند پل میں ہزار دعائیں مانگی تھیں۔

''اماں ٹھیک ہو۔ صبح سے بہت کھانس رہی تھی، پہلی تنخواہ سے اماں کا علاج کرواؤں گی، اپنے ساتھ رکھوں گی۔ ابا کی مار سے تو جان چھٹے گی۔ ہاں ابا سے جان چھٹ جائے بس، اللہ کسی طرح چھٹ جائے۔'' دہلیز پار کرتے ہی نگاہ جم سی گئی۔

''ابا سے جان چھٹ جائے۔ ابا سے جان چھٹ جائے۔'' بنا زبان ہلائے کوئی اندر کہتا رہا تھا۔ اور واقعی بلقیس کی جان امجد سے چھٹ گئی تھی۔

☆☆☆

لابی میں چلتے چلتے اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے

پانی کی چھوٹی سی بوتل نکال کر پانی پیا، بوتل واپس رکھ کر زپ بند کر دی، باقی تمام ائیر ہوسٹس کی نسبت اس کا سامان نا ہونے کے برابر ہوتا تھا، صرف گنتی کے سوٹ رکھ کر ٹرالی بیگ بک کروا دیا تھا۔ ہینڈ بیگ میں صرف میک اپ، موبائل، پانی ہی ہوتا تھا، آج شارجہ میں ایچ او نے ایک پاؤچ امانتاً دیا تھا، جو ان کے پوتے کا گفٹ تھا اور جاننے والے نے ویٹنگ لاؤنج میں ریسیو کرنا تھا۔ کولیگز آپس میں اکثر ہی کسی کی چیز لاتے لے جاتے تھے کوئی نئی بات نہیں تھی، لابی کے اختتام پر مسافر ضروری کارروائی کے بعد ویٹنگ لاؤنج کی جانب بڑھ رہے تھے، سب کے عملے کے افراد لابی کے اختتام پر مخالف جانب مڑتے رابطی برآمدوں کی سمت جاتے ہیں سو چل دیے، منیبہ نے چلتے ہوئے گھڑی پر وقت دیکھا تھا۔ پاؤچ ریسیو کرنے والے شخص کے آنے میں دیر تھی وہ بھی سب کے پیچھے برآمدوں کی جانب بڑھنے لگی، تب کسٹم کاؤنٹر سے ایک آفیسر اس کے پیچھے آیا۔

''آر یو مس منیبہ؟'' اس نے گردن پھیر کر دیکھا۔

گلے میں لٹکتا ائیر ہوسٹس کارڈ پر درج نام منیبہ پڑھ کر اس نے اسے اپنے پیچھے آنے کا کہا تھا، وہ لمحہ بھر الجھی تھی، مگر یہ معمول تھا عملے کو ایک دوسرے سے کام پڑتا رہتا تھا شنزا اور سارہ نے دور سے اسے کسٹم کاؤنٹر کی جانب بڑھتے دیکھا پھر ''کوئی کام ہو گا'' سوچ کر آگے بڑھ گئیں۔

ائیر پورٹ پر جس طرح لینے چھوڑنے والے بوکھلائی شکلوں کے ساتھ پھر رہے ہوتے ہیں اس کے برعکس عملے کی چال ڈھال ایسے ہوتی ہے جیسے ان کا اپنا گھر ہو، منیبہ بھی معمول کا تاثر لیے اس کے پیچھے کاؤنٹر کے ساتھ بنے المونیم کے دروازے تک آئی، اس دروازے کے پیچھے انویسٹی گیشن روم تھا، آفیسر نے اس کے کونے میں لگی چھوٹی سی چمکتی اسکرین پر درج کچھ ہندسے پنچ کیے، دروازہ درمیان سے کھل کر دیوار میں گھس گیا۔

''کم ان۔'' آفیسر نے کہا تو منیبہ نے دونوں ہونٹ آپس میں ملاتے ہوئے تعجب سے اسے دیکھا پھر اندر قدم بڑھا دیے۔

تب ہی وہاں سے گزرتے یلماز کی نگاہ اس کی پشت پر گئی، آنکھوں میں گہرا تاثر ابھرا، کان کھجاتے اپنا رخ ادھر ہی موڑا۔ بے شک ائیر پورٹ اس کی ذاتی ملکیت نہیں تھا لیکن ایک نامور ائیر لائن کے مالکان سے ہونے پر اسے اتنے تحفظات تھے، وہ اپنی ائیر ہوسٹس پر ہونے والی تفتیش کے ابتدائی مراحل میں مدخل ہو سکے، کاؤنٹر پر کھڑے آفیسر کو اپنا وزٹنگ کارڈ چیک کروا کر اندر جانے کی اجازت لی۔

☆☆☆

چھوٹے سے صحن کے بیچ و بیچ چارپائی بچھی تھی، چند عورتوں کے گھیرے میں اماں بیٹھی بین ڈال رہی تھی، منیبہ کے پاؤں زمین سے چپکے تھے، منہ قدرے کھلا۔ آنکھیں پتھرائی وہ پاؤں گھسیٹتے تھکے مسافر کی طرح چلتی آگے بڑھی چارپائی پر امجد کا بے جان وجود اکڑا پڑا تھا، دکھی دل سے نکلی دعا یا بددعا پل نہیں لگتا قبول ہونے میں، امجد کو بلقیس کی لگی بددعا قبول ہو گئی۔ گھر سے نکلتے ہی ایک سگریٹ کے پیچھے امجد کا اپنے دوست سے جھگڑا ہو گیا، اس نے صرف اسے دھکا دیا تھا کسی گھر کی پکی تھڑی سے سر ٹکرایا اور خون کا فوارا ابل پڑا، بدن میں خون کی مقدار نشے نے پہلے ہی جلا رکھی تھی، جو تھوڑا بہت تھا ہسپتال پہنچتے پہنچتے بہہ کر ختم ہو گیا اور اب بلقیس اس ختم وجود پر بیٹھی بین ڈال رہی تھی۔ منیبہ پر نظر جاتے ہی کھانستے ہوئے سینہ پیٹنے لگی۔

''ہائے منیبہ! ہم لٹ گئے برباد ہو گئے۔ ہماری چھت گر گئی۔ بے سائباں ہو گئے۔ ہائے اللہ جی۔'' ماں کو یک ٹک دیکھتے وہ دھپ سے گھٹنوں کے بل بیٹھی، سرد لہجے میں ایک جملہ بولی تھی۔

''ہمارے سر پر چھت تھی کب جو گر گئی؟'' پھر نگاہیں امجد کی جانب موڑ لیں۔ وہ بین کرے، شکر کرے، خوشی منائے یا ماتم۔ کسی احساس کا جذبہ اس

میں ابھرتا ہی نہ تھا۔ بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھے گئی یہاں تک کے مرد اندر آئے چارپائی اٹھا کر لے گئے۔ وہ گھس بیٹھی سوچتی رہی انٹرویو کی تاریخ کیا ہے کیسے جائے گی اماں تو اب عدت میں باہر نکلنے سے رہی۔

''ابا تو جاتے ہوئے بھی ایک اور پریشانی دے گیا۔''

اس کی چارپائی گھر سے باہر نکلتے آخری سوچ یہی آئی تھی۔ پھر وہ بے تحاشا روئی۔ روتی کھانستی ماں کو دیکھ کر، لوگوں سے خالی ہوتے گھر کو دیکھ کر اور کونے میں باپ کے اترے میلے کپڑے دیکھ دیکھ کر دہری ہوتے ہوئے روئی۔

☆☆☆

وہ اس کے انٹرویو کا روشن سا دن تھا معمولی قیمت کے اچھی تراش خراش سے سلے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔ مس ثمینہ نے خاص طور پر اسے انٹرویو کے طور طریقے سمجھاتے ہوئے مزید کہہ رہی تھیں۔

''درود شریف اور لوحِ قرآنی کا ورد کر کے، مٹھی میں پھونک لینا۔ مٹھی باس کے سامنے ہی کھولنا۔ پھر دیکھ کیسے سلیکٹ نہیں ہوتی۔''

اور جانے کیا کیا سمجھایا۔ البتہ بلقیس کو ایک ہی پریشانی تھی۔

''اتنی دور اکیلی کیسے جائے گی، مولوی سے پوچھ کے میں چلوں ساتھ۔''

''اماں اگر سلیکٹ ہو گئی، تو ملکوں پھروں گی۔ کیا تو ہر جگہ ساتھ جائے گی۔'' مس نے یہ کہہ کر تسلی کروائی۔

''فکر نہ کر میں رکشے میں بٹھا آتی ہوں، باقی اب بچی تو ہے نہیں، جو رستے بھولے۔ ویسے بھی کچھ پانے کی تڑپ بھول، بھوک سب مٹا دیتی ہے۔''

☆☆☆

کالے جنگلے کے پار کھلے سے احاطے میں نیلے کانچ کے بڑے بڑے دروازں والی گول، اونچی سی جدید عمارت کھڑی تھی۔ جس کی پارکنگ میں ہر طرز کی گاڑیاں کھڑی چمچما رہی تھیں۔ وہ گیٹ سے کچھ فاصلے پر اتری چوکیدار کو اپنا انٹرویو سیریل دکھا کر اندر داخل ہو گئی۔ بہت سی لڑکیاں انٹرویو کے لیے عمارت کی جانب بڑھ رہی تھیں، ان کا تعلق جس بھی درجے سے تھا مگر ان کے لباس، انداز وقت سے ہم قدم تھے، منیبہ ایسی جگہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی تھی، دل میں کتنی ہی مرعوب اور خوف زدہ ہو مگر اٹھی گردن جمے قدموں سے قطعاً ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

آراستہ ویٹنگ لاؤنج میں نیلی پوشش کی صوفے نما کرسیوں پر ہر لڑکی اپنی فائل پکڑے باری کی منتظر تھی، انٹرویو شروع ہو چکا تھا، جس طرح کی امیدوار لڑکیاں بیٹھی تھیں منیبہ کو اپنے کامیاب ہونے کا ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا، انتظار پھن پھیلائے ڈس رہا تھا، اس کی نظر ویٹنگ لاؤنج سے ملحقہ لابی کی جانب گئی، جہاں دیوار پر کیلی گرافی میں لوحِ قرآنی فریم میں لگی تھی، مس کی بات یاد آتے ہی اپنی فائل کرسی پر رکھ کر اس جانب چلی، سات بار پڑھ کر اپنی مٹھی میں پھونک بند کر لی اور اب مٹھی کو منہ کے ساتھ جوڑے آنکھیں بند کیے ہلکی آواز میں دعا مانگنے لگی۔

''اللہ جی آپ کو تو سب پتا ہے۔ پلیز اللہ جی! بس کسی طرح، کسی بھی طرح میں سلیکٹ ہو جاؤں۔ اللہ جی، اماں کا علاج...... میری ماں کا علاج، اللہ جی!''

بمشکل تیئس چوبیس سالہ قد آور نوجوان ایش کلر کا قیمتی پینٹ کوٹ، اٹلین سول بوٹ، مہنگے ہیر کٹ کو جیل سے اٹھائے، لابی کے دوسرے سرے سے تیز چلتا آ رہا تھا، اس کا سر جھکا ہوا تھا، ہاتھ میں کوئی گھڑی چمک رہی تھی دیکھنے میں لگتا تھا وہ چلتے ہوئے گھڑی کا ٹائم سیٹ کر رہا ہے، وہ جیسے ہی منیبہ کے پاس سے گزرا، اس کی بڑبڑاہٹ پر واپس دو قدم مڑا، رکا، کان لگا کر سننے لگا، گرد و پیش سے لاتعلق وجد اس کے لیے اچنبھا کا باعث تھا، عین اسی وقت اس کی دعا ختم ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ مڑی اس کی کہنی اس کی گھڑی پر

PakiBooks.Site

جا لگی۔
''چھن......'' گھڑی کے گرنے کی نازک سی آواز پر یلماز کی بڑی بڑی آنکھیں تحیر سے ناقابلِ یقین حد تک پھیل گئی تھیں۔ وہ ایک نظر اپنی قیمتی ترین گھڑی کا ٹوٹا شیشہ اور ایک نظر منیبہ کو دیکھ رہا تھا وہ کھا جانے کے انداز سے بولا۔
''یہ...... یہ کیا' کیا تم نے۔''
''میں نے کیا' کیا ہے؟'' اس کی شخصیت و قیمتی لباس کو یکسر نظر انداز کرتی وہ اسی کے انداز میں بگڑ کر بولی تھی۔ ''نظر نہیں آ رہا تھا میں کھڑی ہوں، چڑ کر کیوں چل رہے تھے۔'' غصے سے کہتے اس کی مٹھی کھل گئی۔ کتنی دیر لگا کر اس نے آیت پڑھی، دعا مانگی، باس کے سامنے کھولنے والی مٹھی اس جاہل کی وجہ سے کھل گئی۔ اس کا جی چاہا رکھ کے ایک لگائے اس کے منہ پر۔ تندی سے اسے دیکھتے چبا کے بولی تھی۔
''میری مٹھی بھی کھلوا دی۔ خبیث۔''
''خبیث کسے کہا ہے؟''
''تمہیں۔'' یلماز کو خود کو کنٹرول کرنے میں وقت محسوس ہوئی۔
''تمہاری مٹھی میں خزانہ تھا؟''
''تمہاری گھڑی میں ہیرے جڑے تھے؟'' اس کا تو باتو لہجہ اسے دہکا گیا، شدتِ غصہ سے آنکھیں سکیڑتے ہوئے گمبھیر آواز نکلی تھی۔
''قیمت جانتی ہو اس کی۔ کروڑوں ڈالرز۔ یو نو، کبھی دیکھے ہیں۔''
''اوہ!'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''اس بلڈنگ کا نشہ تو نہیں چڑھ گیا۔ کروڑوں ڈالرز!''
اس کا خیال تھا جس طرح قیمتی کپڑے چڑھائے گٹ پٹ بہت سی لڑکیاں یہاں نوکری کے لیے آئی ہیں یقیناً یہ بھی ان جیسا بھیس بدلا ہوگا۔ پائلٹ یا ہوسکتا ہے سوپر کے لیے ہی انٹرویو دینے آیا ہو۔ یہ کون اسے بتاتا ملک کے وفاقی وزیرِ پیٹرولیم اور یلمی ائیر لائنز کے مالکان کا چھوٹا سپوت ہے جسے وہ معمولی جانتے ہوئے گردن استہزائیہ جھٹک کر جانے لگی،
اس نے منیبہ کی کلائی سختی سے پکڑ کر قریب کرتے کٹیلی آواز میں کہا تھا۔
''میں چھوڑوں گا نہیں تمہیں۔''
''پکڑ کر دکھاؤ۔ ہونہہ بڑا آیا...... کروڑوں۔''
ایک جھٹکے سے کہنی چھڑوائی یہ جا وہ جا۔ اس کی جرأت پر یلماز کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

☆☆☆

منیبہ امجد باری آنے پر اعتماد سے چلتی اندر کمرے میں داخل ہوئی تھی، اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا جب انٹرویو پینل بورڈ کی پاور سیٹ کے برابر والی کرسی پر وہ ایستادہ تھا۔ منیبہ کو اس نے چبھتی نگاہ سے دیکھا تھا وہ خاصی الجھی ضرور تھی مگر ظاہر ہونے نہیں دیا اعتماد سے چلتی دھڑکتے دل اور اس دعا کے ساتھ۔
''اے اللہ اسے آج کے لیے گونگا کر دے۔''
امیدوار کی کرسی پر بیٹھ گئی۔
''منیبہ امجد ہیں آپ؟'' پاور سیٹ پر اُس کا بڑا بھائی بیٹھا تھا ادھر سے سوال آیا اس نے مسکرا کے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
''جی۔''
''آپ جاب کیوں کرنا چاہتی ہیں، شوق یا فائنشل اسپورٹ؟'' پاور سیٹ کے دوسرے سوال پر یلماز نے لقمہ لگایا تھا۔
''یا قرض سے نجات؟''
اس کے بے تکے سوال پر بھائی نے نرم سرزنش سے گھر کا۔
''فائنشل اسپورٹ۔'' منیبہ نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا۔
''خاصی مشکل جاب ہے یہ۔ آپ کی فٹنس، بیوٹی، لب و لہجہ، ہر ہر چیز آن ڈیوٹی مکمل چاہیے۔ طبعی یا حادثاتی کسی بھی صورت میں منتشر تاثر نہیں چلتا۔''
وہ لب پھیلائے پاور سیٹ والے کی بات سنتی رہی۔
''راستے کی تھکاوٹ، پیسنجرز کا رویہ، جائز ڈیمانڈ۔'' وہ ابھی کہہ ہی رہے تھے کہ یلماز نے پھر لقمہ دیا۔

''ادھار یا نقصان...... سب پورا کرنا ہوگا۔'' پاور سیٹ سے اسے ایک بار پھر متنبہ کیا گیا اور منیبہ نے رو...
''میں سب کروں گی سر!''
''ویری گڈ...... پہلے نقصان۔''
ٹیبل کی سطح پر دونوں ہاتھ جما کر یلماز خاصا آگے کو جھکتے جتا کر بولا۔ اب کے پاور سیٹ پر بیٹھے بڑے بھائی نے کرختگی سے گھر کا تھا۔ خوب صورت لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی شوخ فطرت سے بھائی خوب واقف تھا اور عموماً ائیر ہوسٹس کے انٹرویو میں اسے دور رکھا جاتا تھا لیکن آج ٹوٹی گھڑی زمین سے اٹھاتے ہوئے منیبہ کو امیدواران کی لائن میں دیکھ کر وہ بن بلائے پینل میں آ بیٹھا۔
''اب دیکھتا ہوں کیسے نقصان پورا نہیں کرتی۔''
اس کے آنے پر بھائی نے بھی منع نہیں کیا مگر یوں لقمہ کاری پر اب جو تند تنبیہ کی گئی وہ سنبھل کر پیچھے ہوا اور سیٹ سے کمر جوڑ کر بیٹھ گیا۔ باقی پینل سے دو چار اور سوال کیے گئے وہ اسے بوکھلانے کے لیے مسلسل گھورتا رہا مگر وہ اعتماد سے جواب دیتی رہی۔
اس کا انٹرویو ہو چکا تھا۔ پینل سے ایک شخص نے کمپیوٹر پرنٹ کی ایک سلیپ اس کی جانب بڑھائی۔ جس میں اس کی فٹنس ٹیسٹ کی جگہ کی تفصیل اور تاریخ درج تھی۔

☆☆☆

اسے یہ ایک خوب صورت شام لگی جب مس ثمینہ مٹھائی کا ڈبا لے کر خود اس کی طرف آئیں، جن اسٹوڈنٹ کے ذمہ انہوں نے نیٹ سے رزلٹ کی معلومات لگا رکھی تھیں۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی بتا کر گیا تھا۔ ''لسٹ میں منیبہ باجی کا نام سب سے پہلے ہے۔'' منیبہ نے لسٹ کے پرنٹ کو کوئی پانچویں بار دیکھا تھا، فٹنس، بیوٹی، ہائٹ، ایج، ویٹ سب میں وہ پرفیکٹ تھی، پانچ دن بعد اسے چار ماہ کی ٹریننگ پر جانا تھا۔ شدتِ جذبات کو قابو کرتے ہونٹ اندر کی جانب بھینچے اور زور سے مس کے گلے لگ گئی چہرے پی لالی سی میں کھل گئی بجیس اور مس ثمینہ نے اسے بہت سی دعاوں اور نصیحتوں میں رخصت کیا تھا۔
اس کی ٹریننگ بہت نیا تجربہ تھا، لنگویج، نرسنگ اور ہوسٹنگ کے کورسز کے ساتھ جسمانی تاثرات کے ایسے انداز سکھائے گئے اکثر لڑکیاں تو بوکھلا کر چھوڑ گئی تھیں، لیکن منیبہ نے خود کو بے جان پتھر تصور کر لیا تھا جو ٹھڈا مارنے والے کو درد کا احساس بھی ضرور چھڑواتے ہیں۔ یلماز نے خود ٹریننگ سنٹر کے کئی چکر لگائے۔ ہر چکر میں وہ اس سے گھڑی کا تقاضا کرتا، دھمکیاں دیتا۔
''کب دو گی۔''
''کبھی بھی نہیں۔'' پوری ڈھٹائی سے کہا گیا۔
''کیا مطلب؟'' گھور کر پوچھا گیا۔
''مطلب صاف ہے سر! میں نے نہیں کہا تھا مجھ سے جڑ کر گھڑی ٹھیک کریں۔'' کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔
''مجھے بھی نہیں پتا تھا تم اندھا بیل بن کر ٹکر مارو گی۔''
''مجھے جاب چاہیے تھی۔''
''جاب مل گئی اور اب مجھے تائم چاہیے۔'' وہ روزانہ کی بنیادوں پر اس کی ایسی باتوں سے تنگ آ چکی تھی۔
وہ گھڑی بھی تو کوئی عام لاکھ دو لاکھ کی گھڑی نہیں تھی، ناسا سے خریدی گئی گھڑی تھی جس میں شہاب ... لگے تھے۔ یلماز کا بی ایس مکمل ہونے پر دادا نے گفٹ کی تھی، اس نے دادا سے چھپ کر گھڑی ناسا ٹھیک ہونے بھجوا تو دی تھی مگر منیبہ کو تنگ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

یہ یلمی کی آفیشل بلڈنگ کی بات تھی، منیبہ کو باقاعدہ فلائٹس جوائن کیے کئی ماہ ہو گئے تھے، اس دن عملے سے میٹنگ کے بعد لنچ کا اہتمام تھا، ڈائننگ روم کے باہر لگے واش بیسن پر وہ ہاتھ دھو رہی تھی، جب اس کی نگاہ تیز چلنے کے دوران یلماز کے ہلتے بازو پر گئی۔ وہ اپنے بھائی کے آفس سے نکل کر کانفیکٹ روم

PakiBooks.Site

کی جانب بڑھ رہا تھا، منیبہ کی جانب اس کی پشت تھی، وہ ہاتھ ڈرایئر ٹپ کے نیچے کیے بنا تیزی سے اس کی جانب بھاگی اور گیلے ہاتھوں سے اس کی آستین پکڑ کر بولی۔

''سر! ٹائم کیا ہوا ہے؟''

اس نے گردن پھیرتے ناگواری سے اس کے گیلے ہاتھ محسوس کیے، انگشت سے ہاتھ پیچھے کرنے کو کہا تھا اس نے فوراً ہاتھ سمیٹ لیے۔

اور وہ سمجھ گیا کہ وہ گھڑی دیکھ چکی ہے، اسے اندازہ نہیں تھا وہ آج یہاں ہوگی اور اتنی چالاک اور بولڈ بھی کہ اپنے باس کے بیٹے سے تفتیش بھی کرلے گی، بھوری آنکھیں سمیٹتے ہوئے اس نے وثوق سے جھوٹ گھڑا تھا۔

''آنکھیں کھول کر دیکھو۔ یہ وہ نہیں، میرے بھائی کی ہے۔ اس میں میٹرائٹ (شہابیے) لگے تھے۔''

اس نے یہ لفظ میٹرائٹ پہلی بار سنا تھا، اس کی جانے بلا میٹرائٹ لگا ہے یا بجری اور پھر جس کلاس سے وہ تھا میٹرائٹ کیا پوری دنیا اٹھا کے اس گھڑی میں رکھ لے تو کم۔ اس کی کون سا خون پسینے کی کمائی تھی ابا وزیر، بھائی ایئرلائن کا مالک یعنی کے ٹھگ کے ٹھگ۔ اور منیبہ نے کون سا غور سے دیکھی تھی، کیا بلا تھی وہ، اگر دیکھ بھی لیتی تب بھی فرق پتا نا چلتا، یہ اندازہ یلماز کو بھی تھا، تبھی جتا جتا کر بولا اور منیبہ نے تجاہل عارفانہ سے کندھے اچکائے۔

''سوری سر! مجھے علم نہیں تھا آپ دوسروں کے ٹائم سے بندھے ہیں۔''

کہہ کر اس کے چلے جانے پر وہ تلملا گیا، جی چاہا ابھی کہ ابھی اسے نوکری سے فارغ کروادے، مگر پھر اس دل کا کیا کرے جو اسے تنگ کرنے کا عجب سا لطف اٹھاتا ہے، اُس دن کے بعد سے اُس نے وہ گھڑی پہنی نہیں بلکہ لاکر میں رکھ دی تاکہ اسے جتاتا رہے، ان تین سالوں میں منیبہ کو بھی اس کے ایسے جملوں کی عادت ہوگئی تھی، اسی کے انداز میں جواب دے کر آرام سے سامنے سے ہٹ جاتی۔

☆☆☆

المونیم کے دروازے کے اندر دس پندرہ گز جتنی لابی نما راہداری سی تھی، جس کے اختتام پر نیلے چمڑے کی چار چار انچ چوڑی پٹیوں کو لٹکا کر پردہ بنا رکھا تھا۔ آفیسر پٹیاں ہاتھ سے ہٹاتا اسے اندر کمرے میں لے گیا۔ وہاں کئی میزیں لگی تھیں، جن پر بہت سے ڈبے رکھے تھے کچھ کھلے جن سے چیزیں جھانک رہی تھیں، کچھ سیل بند۔ پاس ہی تین چار جدید میٹل ڈیٹکٹر پڑے تھے۔ اس نے میز کے پیچھے جاتے ہوئے منیبہ کے بیگ کی جانب ہاتھ بڑھاتے کرختگی سے کہا تھا۔

''اِدھر دیں یہ۔'' بیگ پکڑاتے منیبہ کی آنکھوں میں تحیر ابھر کر معدوم ہوا۔ اس نے زپ کھولی اور سفید لیدر پاؤچ باہر نکال کر بے دردی سے بلیڈ سے کاٹا، اور ٹیبل پر الٹ دیا، اس شخص سے زیادہ منیبہ حیران ہوگئی تھی، اس نے تو جوں کا توں بیگ میں رکھ دیا تھا دیکھنے تک کی زحمت نہیں کی تھی، اور اب یہ......!

چھوٹے چھوٹے کچھ ٹکڑے ٹیبل پر چمک رہے تھے۔

''کیا ہے یہ سب۔''

وہ پہلے سے زیادہ کرختگی سے بولا تب تک یلماز اندر داخل ہوچکا تھا، اس کی بھی آنکھیں ناقابلِ یقین حد پھٹی تھیں، آفیسر اسے جانتا تھا تب ہی اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''دیکھیں یہ آپ کی ایئرہوسٹس کیا اسمگل کررہی ہے۔'' میز پر پڑے میٹرائٹ دیکھتے ہی یلماز متحیر سا چہرا لیے سوچ سوچ کر قدم بڑھاتا آگے آیا منیبہ نے بھی گردن موڑ کر عقب میں اسے دیکھا، قدرے حوصلہ ہوا۔

''سر...... سر! یہ میرا نہیں ہے...... میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ بیک وقت دونوں سے مخاطب تھی۔ آفیسر جھڑکنے کے انداز میں بولا۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں، یہ آپ کے بیگ سے

نہیں نکلے؟''

''آرام سے بات کریں۔'' یلماز کے آفیسر کو ٹوکنے پر اسے مزید حوصلہ ہوا تھا۔ وہ اب اس سے مخاطب ہوا۔

''مس منیبہ! یہ سب کیا ہے؟''

آئی سوئیر سر! یہ میرا نہیں ہے، مجھے مخدوم صاحب نے دیا تھا۔ ان کے کسی ملنے والے نے یہ لینے آنا ہے، پوتے کا گفٹ بتایا تھا۔'' وہ جلد جلد بول رہی تھی۔

''آپ نے دیکھا تو ہوگا۔''

نہیں سر! میں نے نہیں دیکھا۔ جلدی میں تھی، غلطی ہوگئی۔'' بھنویں اچکائے بھوری آنکھیں اس کی دھانی آنکھوں میں جمی تھیں، وہ منمنائی۔

''آپ انہیں کال کریں سر! وہ بتادیں گے۔''

آفیسر بات کاٹ کر بولا تھا۔

''پکڑے جانے پر سب ایسے ہی شور ڈالتی ہیں۔ ابھی میں......'' اسے مزید کچھ کہنے سے یلماز نے ہاتھ اٹھا کر روکا اور اسپیکر آن کرتے ہوئے مخدوم صاحب کو کال ملائی۔ کال دوسری بیل پر ریسیو ہوئی تھی۔

''مخدوم صاحب! مس منیبہ کو آپ نے کیا دے کر بھیجا ہے۔''

''جی......!'' اسپیکر سے تحیر ابھرا۔ ''کیا مطلب یلماز صاحب! میں سمجھا نہیں؟''

''مطلب، جو آپ نے گفٹ بھیجا ہے پوتے کے لیے۔ کتنا بڑا ہے آپ کا پوتا؟''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں یلماز صاحب! کیسا گفٹ...... میں تو آج منیبہ سے ملا ہے نہیں۔ کہاں ہیں وہ۔ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''نو نو...... نو سر! وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' وہ زور سے چلائی۔

''میں کیوں جھوٹ بولوں گا منیبہ! کب اور کہاں دیا میں نے؟'' وہ مسلسل تحیر بھری آواز میں جھوٹ بولتے رہے۔

''کیوں کررہے ہیں سر! آپ ایسا...... آپ نے لابی میں مجھے پکڑایا تھا۔ یاد کریں سفید پاؤچ میں۔ پلیز سر!'' وہ رو دینے کو ہوگئی۔ بار بار آفیسر اور یلماز سے کہہ رہی تھی۔ ''میری بات کا اعتبار کریں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یہ انہوں نے ہی دیا تھا، وہ اب جھوٹ بول رہے ہیں۔'' اُدھر وہ مسلسل انکار کررہے تھے۔

''ہوش میں آئیں منیبہ! میرا نام مت لیں۔ میں تو آج آپ سے ملا تک نہیں اور لابی...... میں سی سی ٹی وی کی ساری فوٹیج ابھی بھجواتا ہوں۔ حد ہوگئی مجھے خواہ مخواہ پھنسا رہی ہیں۔''

بھلا سی سی ٹی وی ملزم خود نکلوائے جسے اپنے جرم کا پتا بھی ہو۔ کیا اُسے یہ نہیں پتا کیمرہ روک کر ریوائنڈ کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ منجھے ہوئے ہاتھ پکڑنے کے لیے اتنی باریکی میں غیر متعلقہ کیوں جائیں۔ آفیسر بار بار اسے پولیس کیس کی دھمکی دے رہا تھا اس کی گھبرائی صورت پر یلماز کو بہت ترس آیا، دل شدت سے دھڑکا اور اسے کرسی پر بیٹھ جانے کا کہا تھا، پریشانی سے اس کا سرخ سفید رنگ پسینے میں ڈوب گیا تھا نارنجی ہونٹ کچلتے بار بار ٹشو سے ماتھا پونچھتی۔

''آپ کو گھڑی واپس کرنے کے لیے یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں تھی میم منیبہ! مجھے بتادیا ہوتا، میں کبھی نہ مانگتا۔''

اس کی جانب جھکتے ہوئے مدھم سرگوشی پر منیبہ نے چونک کر الجھی نگاہ سے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا تھا۔

''بلیوی سر! میں سچ کہہ رہی ہوں۔''

روندھی آواز کے ساتھ آنسو بھی ٹپک پڑے۔

''میرا اِن سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ یہ انہیں دے دیں یا باہر پھینک دیں۔ مجھے کچھ لینا دینا نہیں۔ میری بات کا یقین کریں، میں بے قصور ہوں۔''

''واٹ...... آپ مجھے رشوت دے رہی ہیں۔ ایک جرم کے بعد دوسرا جرم۔'' آفیسر ہنوز غصے میں تھا۔ ''آپ کو شرم آنی چاہیے۔ ایئرہوسٹس کے ہینڈ بیگ کی چیکنگ اس لیے نہیں کی جاتی آپ کا حلف

Free Download

and

Read Online

From :



PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

ہوتا ہے ادارے کے ساتھ اور آپ اسی چیز کا ناجائز فائدہ اٹھاتی رہیں۔ اسمگلنگ کرتے ضمیر ملامت نہیں کیا آپ کا، اگر جہاز کا اکیٹر آپ کا بیگ اسکین نا کرتا آپ تو یہ لے کر نکل گئی تھیں۔ بلین کی اسمگلنگ۔'' وہ منہ پہ ہاتھ رکھے پھپک پھپک کر رو دی۔

''اب یہ کیس پولیس میں جائے گا۔''

اس کے قطعیت سے کہنے پر منیبہ نے منہ سے ہاتھ ہٹا کر اس کے سامنے جوڑ دیے خوف سے اس کے پسینے بہہ رہے تھے۔

''پلیز سر! پلیز......'' اب جڑے ہاتھ یلماز کی جانب کرتے اس کی آواز بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ یلماز نے جڑے ہاتھ نرمی سے پکڑ کر اپنے سامنے سے ہٹائے، کمینے سے دل کو کوئی کچوکا سا لگا اور آفیسر سے بولا تھا۔

''اتنا ظلم مت کریں، ہماری بہت قابل ایمپلائز ہیں یہ۔ اس طرح تو ہماری ریپو خراب ہو جائے گی۔ میں بابا سے بات کرتا ہوں۔'' پھر منیبہ کو پاس رکھا پانی کا گلاس تھمایا۔ ''اور پلیز آپ بھی چپ کریں، یہ پئیں۔'' خوف سے وہ لرزنے لگی، گلاس پکڑنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔

''دیکھیں میری آپ سے عاجزانہ ریکویسٹ ہے۔'' اس نے آفیسر کو تحمل رکھنے کا اشارہ کیا وہ قدرے ٹھنڈا ہوا تھا۔ ''ہماری ایمپلائز کو جانے دیں۔ ہم بیٹھ کر سلوشن نکالتے ہیں اور یہ کون سا بھاگی جا رہی ہیں، یہیں جاب کر رہی ہیں لیکن پلیز کوئی راستہ نکالیں۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے لمحاتی فیصلہ کیا تھا

''صرف آپ کے کہنے پر، وقتی طور پر انہیں جانے دے رہا ہوں۔ آپ جا سکتی ہیں......'' لمحے میں ہی اس کی آنکھوں میں یلماز کے لیے بہت سا احسان تشکر بن کر ابھرا، جھٹکے سے اٹھی۔ آفیسر کہہ رہا تھا۔

''مگر آپ انڈر آبزرویشن ہیں جب تک تحقیقات ہوں گی۔''

جتنی کرپشن کسٹم آفس میں چلتی ہے شاید سیاست میں بھی نا چلتی ہو۔ اپنے مفاد کے لیے جس طرح خدا بن جاتے ہیں ہر اصول، قانون ضوابط اپنی مرضی سے توڑ موڑ لیتے ہیں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا اگر یہ پکڑنا چاہیں تو منی لانڈرنگ، اسمگلنگ کسی کی جرأت نہیں بے چاری ایئر ہوسٹس کے ذریعے کروائی جا سکے۔ مگر روکے کون یہ تو صرف اسے پھنسانے کے لیے سب کیا گیا تھا ورنہ تو زبردستی کروایا جاتا ہے۔

وہ سنتے ہی سر ہلاتے ہوئے ایسے باہر کی جانب لپکی جیسے نئی زندگی ملی ہو۔ ان چند لمحوں میں یلماز کی ہمدردی پہلی بار دل پر محبت کی دستک بن کر بجتی محسوس ہوئی تھی، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی، جو شخص اس سے وقت وقت مانگنے کی رٹ لگائے رکھتا ہے، وہ محبت کا وقت بھی تو ہو سکتا ہے، جس میں عزت، احترام، وقار شامل ہو، کمرے سے سلائڈنگ بار والی راہداری تک جاتے دل اس کی محبت سے لبالب بھر گیا تھا اگر آج وہ نہ ہوتا تو یقیناً وہ بری طرح پھنس گئی ہوتی۔ ان چند قدموں میں وہ فیصلہ کر چکی تھی باہر کھڑی ہو کر اس کے نکلنے کا انتظار کرے گی اور اس کی مدد کا بے حد شکریہ ادا کرے گی اور جو گھڑی کا نقصان کیا تھا اس کی بہت بہت معافی مانگے گی، چند پل میں اتنا کچھ سوچتے لفظ بھی ترتیب دے چکی تھی۔ دل کی دھڑکن اس وقت کچھ اور ہی طرز پر بجیں، وہ المونیم ڈور سے باہر نکلنے ہی لگی تھی، جب یاد آیا اندر وہ اپنا بیگ بھول آئی ہے۔ بیگ شاید وہ چھوڑ کر چلی جاتی، مگر اس میں ایک ان ہیلر تھا، جو بلقیس کے لیے شارجہ سے خاصا مہنگا خریدا تھا، اس کی خوبی یہ تھی بغیر زور کے دبائے صرف ٹچ کرنے پر دب کر ان ہیل کر دیتا تھا، ان تین سالوں میں اس نے اپنی زیادہ تر کمائی بلقیس کے علاج پر لگائی تھی، کمپنی کی جانب سے اچھا فلیٹ مل جانے پر پرانے گھر کو تالا لگا دیا اور کل وقتی ملازمہ بلقیس کے لیے رکھی تھی۔ مہنگے علاج اور دیکھ بھال نے اچھا اثر ڈالا تو تھا مگر پرانی ٹی بی ہونے کے سبب ان ہیلر کی ضرورت پڑتی رہتی، وہ ان ہیلر لینے ڈرتی جھجکتے کو پلٹی۔ یلماز کی موجودگی فی الوقت دنیا کا سب سے قیمتی واحد سہارا لگ رہی تھی، چھوٹی سی راہداری

دھڑکتے دل سے عبور کرتے وہ ابھی نیلے سلائیڈنگ بار تک پہنچی تھی، جب دو قہقہوں میں یلماز کا قہقہہ بہت اونچا تھا۔

"ہاہاہا...... بس اتنی سی ہوتی ہے عورت...... لمحہ لگا اُسے زیر کرنے میں۔"

سنتے ہی منیبہ کو لگا اس کے بدن کے سارے بال سلاخوں کی طرح کھڑے ہوگئے ہوں۔ "بااعتماد، نڈر، بڑی آئی گردن اٹھا کر چلنے والی۔ کیسے ہاتھ جوڑے آنسو بہاتی یقین دلا رہی تھی۔ یہ اس کے نہیں ہیں۔" کچھ توقف سے بولا۔ "لیکن قسم سے یار! اپنی اس کمینی حرکت پر، دل کو کچھ ہو ضرور رہا ہے۔" اس نے ٹیبل پر رکھے شہابیے ہاتھ میں اچھال کر واپس رکھ دیے دونوں نے کروفر بھرے قہقہے لگائے۔

"دل کو چھوڑو یار! انجوائے کرو اس کا ٹوٹا غرور۔" دو قہقہے پھر ابھرے۔ "پھر کیا دے رہے ہیں مجھے، پلان کو پرفیکٹ رنگ دینے کا۔" آفیسر کے لہجے سے لالچ ٹپکا۔

"بولو کہاں ٹریٹ چاہیے...... ناروے، سویٹزر لینڈ؟"

"نہیں یہ شہابیے۔"

اُس کی صاف گوئی پر وہ پل بھر کے لیے رکا ایک نگاہ تحیر سے دیکھتے سوچا تھا۔

"واہ یعنی کہ اس پاگل کو بھی نہیں پتا بھلے یہ لاکھوں کی مالیت کے ہیں مگر اصل تو نہیں۔"

اُس نے پر سوچ انداز میں اثبات میں گردن ہلائی۔

"چلو تم بھی کیا یاد کرو گے، کس سخی کو خوش کیا ہے تم نے۔"

اس نے شہابیے انگلی کی پور سے چھیڑتے فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا۔ یلماز کی آواز منیبہ کے کان پر گرم سیال کی طرح گری تھی۔ بدن کا سارا خون دھانی آنکھوں کے کناروں پر اتر آیا جبڑے ریڑھ کی ہڈی کی طرح اکڑ کر بوجھل ہوگئے۔ آکسیجن اتنی کم محسوس ہوئی اکڑے جبڑے، ناک کے نتھنے پھیلنے پر بھی سانس بحال نہ ہوتی تھی۔ پاؤں گھسیٹتی بمشکل آگے بڑھی بے یقین آواز نمی سے لڑ بھڑ کر جیت کر نکلی تھی۔

"آج پہلی بار دیکھا ہے، کسی کو کھڑے قد سے گرتے۔"

اُن دونوں نے میکانکی انداز میں گردنیں پلٹ کر دیکھا، پیچھے کوئی آسیب زدہ سفید مورتی کھڑی تھی۔ چہرے پر سنسناتا سرخ خون، دھانی آنکھوں میں آگ کے شرارے دوڑ رہے تھے۔

"میری ان پڑھ ماں نے صحیح کہا تھا وقت اور مرد ایک سے ہوتے ہیں۔ حاکم بنے ہر چیز کو پاؤں میں روندتے۔ خدا بننے کی خواہش کو پالتے۔ ان... سامنے جھک جاؤ، گڑگڑاؤ، ناک رگڑو، معافیاں مانگو، تاکہ ان کی انا کی تسکین ہو۔" آنکھیں یلماز پر گاڑھے وہ چبا چبا کر کہہ رہی تھی۔ وہ تحیر سے اسے دیکھتا کرسی کھینچ کر کھڑا ہوگیا تھا، اس سے پہلے وہ کوئی بات بناتا منیبہ نے گلے میں لٹکتا ایئر ہوسٹس کارڈ زور سے کھینچا ربن کا سرا اچٹ کر اس کے ہاتھ میں آگیا تھا اس نے کارڈ یلماز کے منہ پر مارا۔

"میں سمجھتی تھی یہ جملے صرف نشئی مرد کے لیے ہیں۔ میں غلطی تھی سر!" اب وہ بیجز نوچ نوچ کر اس پر اچھال رہی تھی۔ "یہاں تو نشہ اور منشا ایک ہیں۔" پنوں سے جمایا اسکارف جھٹکے سے اتارا، کتنے بال پنوں کے ساتھ جڑ سے اکھڑ گئے مگر اس تکلیف کا اب احساس تک نہیں تھا۔

"ایک نشئی کی بیٹی اس سے زیادہ ڈیزرو کرتی تھی سر یلماز حسین! سجدہ، ہاتھ، ناک، ماتھا، اکیلے میں کیوں...... سب کے بیچ ویٹنگ لاؤنج میں رگڑواتے، مجھ سے تاکہ آپ کی حاکمیت کو چار چاند تو لگتے۔" نمی سے بوجھل آواز پھٹ رہی تھی وہ قدم قدم آگے بڑھی اور جھپٹ کر وہ شہابیے اٹھائے اور پوری قوت سے یلماز کے منہ پر دے مارے۔ "ہاں یہ میں ہی اسمگل کر رہی تھی۔" یلماز کو لگا جیسے دہکتا کوہ طور اس پر گرا ہو آفیسر بھی دم سادھے کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چلائی تھی۔ "اور یہ کیا میں تو ہر چکر میں ہیروئن، منی لانڈرنگ، چھوٹے اسمگلنگ کرتی رہی ہوں۔"

چمکتے دھان سے پانی کی دھاریں بہہ کر گلابی گال دھونے لگا۔ "بلائیں پولیس...... مجھے گرفتار کروائیں۔ اپنے اندر کے وقت کو تسکین پہنچائیں۔ ملائیں کال۔" اس نے ٹیبل سے موبائل اٹھا کر زور سے اس کے آگے پھینکا۔ "بتائیں مخدوم صاحب کو۔ میں ان پر الزام لگا رہی تھی۔ وہ سچے تھے۔"

وہ ہذیانی انداز میں چلاتی ایک ایک چیز اٹھا کر اسے مار رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا ساری دنیا اٹھا کر اس پر الٹ دے اس کے روتے بلکتے چہرے کو دیکھتے یلماز بت کی طرح جم گیا تھا، بس ایک سانس کا رشتہ تھا جو غیر محسوس طریقے سے تیر رہا تھا، آفیسر نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی مگر وہ بپھری ہرنی کی طرح چھپٹ جھپٹ جاتی شرمندگی سے یلماز نے ایک قدم اس کی جانب بڑھایا تو منیبہ نے اسے زور سے دھکا دیا۔ "تم وقت ہو تم مرد ہو، تم عورت سے صرف سجدہ چاہتے ہو۔"

چلاتے ہوئے اپنے آنسو کلائیوں سے پونچھے، تیزی سے باہر کی جانب بھاگی تھی، کچھ دیر پہلے اس چند گز کی راہداری میں دل میں الوہی محبت پھوٹی تھی بس چند پل کی خوشی لکھی تھی اس کی تقدیر میں۔

"وقت، مرد" کی گردان کرتے روتی جاتی اور پھر بھاگنے کے انداز میں چلتی جاتی تھی تراشیدہ بھورے بال پیچھے کی جانب اڑتے اور وہ آگے کو بڑھتی۔۔ کتنوں نے اسے حیرت سے دیکھا عملے کا حصہ ہونے کی وجہ سے کوئی خاص پوچھ تفتیش نہیں تھی۔ یہاں تک کے وہ بھاگتے ہوئے ایگزیکٹ سے نکل گئی اس کے ایک پاؤں کی سینڈل جانے کہاں اتر گئی تھی دوسری ایئر پورٹ سے باہر فٹ پاتھ پر اتری، تلووں میں کیا کیا چبھ رہا تھا کچھ احساس نہیں تھا گرد و پیش سے بے خبر سڑک پر آگئی۔ سامنے سے تیز رفتار وین آرہی تھی بریک لگتے لگتے وہ اس سے ٹکرا گئی۔

☆☆☆

وہ کمرے میں پتھر کی مانند کھڑا دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ آفیسر منیبہ کے خلاف کارروائی کی جانے کون کون سی کیا باتیں کر رہا تھا یلماز کو کچھ سنائی نا دیتا تھا۔ صرف شہابیوں کی سنگ باری ہوتی محسوس ہو رہی تھی بالکل دوزخ کے گولے جیسی، جو سرکش شیطان کی شرارتوں پر اللہ کی طرف سے پھینکے جاتے ہیں، آفیسر نے پانی کا گلاس اس کی جانب بڑھایا اس نے گلاس منہ کو لگا رکھا تھا اور دونوں کناروں سے پانی نیچے گر رہا تھا۔ آفیسر کا موبائل گونجا۔ منیبہ کا ایکسیڈنٹ دونوں کو حواس باختہ کر گیا تھا۔ وہ اسی انداز میں باہر کی جانب لپکا تھا خون میں لت پت ایک مورتی کو ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا جب تک وہ قریب پہنچا ایمبولینس جا چکی تھی، پھر جانے وہ کتنی دور اس کے پیچھے پیدل بھاگا تھا۔

☆☆☆

ہاسپٹل کے کوریڈور سے آگے ایمرجنسی کی دیوار سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا، اسے یقین تھا وہ مر جائے گی اور پھر وہ بھی مر جائے گا۔ وہ اپنی روح کو اس کی روح کے آگے ہاتھ جوڑتے پاتا تھا، اسے خون کی اشد ضرورت تھی، یلماز چاہنے کے باجود اسے اپنے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں دے سکا تھا۔ کیوں کہ منیبہ کا خون اس کے خون کا قطرہ بھی اپنے اندر برداشت نہیں کر سکتا تھا ان کے گروپ الگ تھے، بہت سے کولیگ اس کی عیادت کو آتے رہے، یلماز کے گھر والوں نے سرسری حال پوچھا حیرت تو انہیں تب ہوئی جب پتا چلا یلماز مسلسل کئی گھنٹے سے وہاں کھڑا ہے، اسے پیار پھر سختی سب طرح سے بلایا، مگر وہ ٹس سے مس نا ہوا، بڑے بھائی نے خبر چلا کر بزنس کی ریٹنگ بڑھائی۔ "یلمی اپنے معمولی ایمپلائیر کا بھی بہت خیال رکھتی ہے۔ مالک کئی گھنٹے سے ملازم کے ہوش میں آنے کے انتظار میں کھڑا ہے۔"

چند گھنٹے بعد اسے ہوش آچکا تھا۔ بلقیس اس کی پٹی سے لگی تھی اور یلماز بہت دور کوریڈور کی سیڑھی پر

بیٹھا ٹکٹکی لگائے دروازہ تکتا تھا اس کی ہمت نہیں تھی کہ اندر جائے اسے بتائے مرد اور وقت ہر لمحے اک سے نہیں ہوتے، خواہشوں کی غلطیاں دل کے ہاتھوں مردوں سے زیادہ غلط ہو جاتی ہیں۔

رات کا کوئی پہر تھا بلقیس اٹینڈنٹ بینچ پر بیٹھے اونگھنے لگی، وہ شام سے ہاتھوں میں بکے پکڑے بیٹھا تھا، باسی پھولوں کی خوشبو بکھر گئی تھی، وہ دبے قدموں اندر آیا خاموشی سے پھول اس کے پاس رکھ کر مڑنے کو تھا، جب اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، بے پناہ نفرت یک دم آنکھوں میں اتر آئی، ڈرپ کی سوئیوں، پائپوں سے جکڑے ہاتھ نے پوری قوت سے اس کے پھول بہت دور گرے، پھول تو گرے سو گرے ڈرپ اسٹینڈ بھی نیچے گر گیا۔ بلقیس ہڑبڑا کر اٹھیں۔

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' یلماز کی آواز کو جانے کیا کھا گیا تھا۔

''چلے جاؤ یہاں سے۔''

''معافی کے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' جیسے کوئی قبر کے دھانے پر ہو۔

''مجھے تم سے کراہیت آتی ہے، جاؤ۔''

''وقت اور مرد ہر وقت بے رحم نہیں ہوتے۔'' جیسے قبر کا منہ کھل گیا ہو۔

''میں دونوں پر تھوکتی ہوں۔''

وہ پھر سے ہیجان میں آنے لگی۔ ''نفرت ہے مجھے مردانگی سے، جو وقت کی طرح ظالم ہو۔ جاؤ جاؤ۔'' پھر جیسے کوئی قبر میں اتر گیا۔

بلقیس آگے بڑھی بھنچی نگاہ سے یلماز کو دیکھتے ہاتھ جوڑے، یلماز کی بے بس نگاہ پھٹی رہ گئی جیسے قبر پر مٹی بھی آ گئی ہو۔

☆☆☆

پھر لوگوں نے اک شخص دیکھا تھا جو قیس تھا نہ مجنوں تھا، اُس نے پہاڑ کھود کر چشمہ نہیں نکالا، نہ جنگلوں میں بانسری بجاتے محبت کے مرثیے پڑھتا تھا اور نہ ہی کسی دریا سے مقابلہ لگا کر آنسو بہائے۔ گھسی پینٹ عام سی شرٹ میں پھرتا نظر آتا اک جوان۔ جو لوگ وقت سے روندے جاتے انہیں اٹھاتا ان کے سائبان تک پہنچاتا، تو کسی کو اس کے مسیحا تک، وقت کے لگائے نشتر کو دھوتا، تو کسی کو سفید کپڑے میں لپیٹ کر آخری آرام گاہ میں اتار آتا، گھنٹوں گم صم قبروں کو دیکھتا۔

گھر والے حیران تھے شوخ چلبلے یلماز کو آخر ہوا کیا ہے، ہاسپٹل میں اس کے ساتھ مسلسل دو ملازم ہاتھ باندھے ساتھ تھے، جب وہ ٹوٹا پھوٹا ان کے ساتھ گھر آ گیا، بہت دن تو خاموشی کی نظر گزرے پھر گھر سے نکل کر سڑکوں پر پھرتا اُسے ہر وقت اپنے چہرے پر مارے جانے والے شہابیوں سے ہتک محسوس ہوتی۔ نرم گلابی چہرے کے حقارت لیے آنسو اس کی سانسیں کھینچ لیتے۔ ملک بیرونِ ملک بہترین سائیکاٹرسٹ سے علاج کروایا گیا سب کی مشترکہ رائے تھی اُسے ذہنی عارضہ ہے ٹھیک ہونے کے لیے وہ خود تعاون نہیں کرتا۔

شادی کی کوشش بے سود تھی خاندان کی جو لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتی تھیں اب اسے دیکھ کر یہی کہہ سکتی تھیں۔

''ہمارے لیے یہ پاگل ہی رہ گیا۔'' دوسرے شادی کے نام پر وہ خود غائب ہو جاتا، ڈھونڈنے سے نہ ملتا، بہترین اور مستقل علاج سے اتنا سا فرق پڑا تھا، بے کار بیٹھنے سے خدمت خلق میں لگ گیا، سیاسی شخص کو ہر چیز میں اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے، ملک حسین کو جب اس کے ٹھیک ہونے کا کوئی امکان نہ رہا، اس نے بیٹے کو یلمی نام سے ٹرسٹ بنا دیا، ایمبولینسیز، شیلٹر ہوم، ہاسپٹل بنانے سے ایک طرف ان کی کرپشن مکمل چھپ گئی، دوسری طرف بیٹے کی خدا ترسی نے عوام کے دلوں میں گھر کر کے باپ کی وزارت ہمیشہ کے لیے پکی کر دی۔

☆☆☆

وہ بالکل گم صم ہو گئی تھی، ٹھیک ہونے کے بعد یلمی کی طرف کیا کسی بھی ایئر لائن کی جانب پلٹ کر نا دیکھا، یلماز کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے ملک

PakiBooks.Site

حسین نے منیبہ کے کانٹریکٹ کو نظر انداز کیا اور اپنی کمپنی کی ریپو بچائی تھی، منیبہ کمپنی کا فلیٹ چھوڑ کر واپس اپنے پرانے محلے میں آباد ہو گئی، بلقیس نے اسے کہیں اور جاب کرنے کا بہت سمجھایا مگر منیبہ کسی طور نا مانی جو کچھ جمع پونجی تھی اپنے علاقے میں ہی چھوٹا سا ٹیوشن سنٹر کھول لیا اور گزارا چلنے لگا ہاں البتہ دس پندرہ گز کی اس نیلی راہداری میں پنپ کر دم توڑتی محبت ہتک کی طرح ساتھ تیرتی، لمحہ بھر کو سانس رک سی جاتی، اپنے پھسل جانے پر خود سے گھن آتی، زندگی کے چار سال مزید بھیگ گئے، بلقیس کی کھانسی اچھے علاج اور خوراک سے پہلے خاصی بہتر ہو گئی تھی، لیکن ان چار سالوں میں بتدریج بڑھتے ہوئے پھر پرانی نہج پر آنے لگی، منیبہ ٹیوشن سے فارغ ہوئی تھی جب بلقیس یہ کہہ کر گھر سے نکلی۔

''نکڑ والے کی طرف جا رہی ہوں۔ دوا لے آؤں۔''

ڈسپنسر کی دکان بند تھی اور کھانسی کی تکلیف زیادہ وہ رکشا لے کر بڑے اسپتال کے لیے نکل گئی، شام ڈھلنے کو آ رہی تھی بلقیس گھر نہیں آئی منیبہ کو فکر ہونے لگی تھی، محلے کے بچے کو بھیج کر پتا بھی کروایا مگر بلقیس کا کچھ آتا پتا نہیں تھا، وہ اس کا نمبر ملانے لگی مسلسل ٹون کے بعد کسی نے اٹھایا تھا، اور سننے کے بعد منیبہ کو پاؤں میں زمین لرزتی محسوس ہوئی، دراصل آدھے راستے میں ہی رکشے کا سلنڈر پھٹنے سے بلقیس سمیت رکشا بہت دور جا گرا اسی سڑک پر ایک بھاگتی ایمبولینس آ رہی تھی وہ آج قدرتی طور پر اس ایمبولینس میں خود موجود تھا نازک حالت میں مریضہ کو ہسپتال پہنچا دیا تھا اور جب تک وارث نہیں پہنچے وہ وہاں موجود تھا۔

اسپتال پہنچتے تک منیبہ کی آنکھیں سرخ ہو کر سوج چکی تھیں، اس نے جیسے ہی قدم کوریڈور سے ایمرجنسی کی جانب اٹھائے بینچ پر اسے بیٹھے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ گلے پر ہلکی سی دھاگے کی کڑھائی والا سیاہ کاٹن کا کرتہ شلوار، سیاہ لیدر کی چپل، چھوٹے کٹے بال، کھلی رنگت پر نورانیت۔۔۔ وہ کہیں سے بھی، پرانا اپ کلاس رہنے والا یلماز نہیں لگ رہا تھا۔

منیبہ کے سادہ بے رعنا چہرے کو دیکھ کر آنکھیں یلماز کی بھی پھیل گئی تھیں، اسے لگا تھا اس کی زندگی کی چند ساعتیں اور سانسیں دونوں بے یقینی سے رکی ہیں، گرد و پیش سے بیگانہ وجود، احساس تھا تو صرف ان چیزوں کا جو چہرے پر ٹھا ٹھا گر رہی تھیں، اسکارف، بیجز، کارڈ اور شہابیے...... شہابیے وہ آگ کے بجھے گولے جو اللہ سرکش شیطان کو بھگانے کے لیے مارتا ہے۔ ایک، دو، تین...... باری باری اور بار بار مسلسل پڑ رہے تھے کان اُن لفظوں کی گونج سے پھٹنے کو تھے اس کی سوجی آنکھیں دیکھ کر لمحے میں وہ وقت یاد آیا جب وہ مخدوم صاحب کو فون پر کہہ رہا تھا۔

''پاؤچ آپ نے لابی میں ذرا دیر سے دینا ہے اور پلیز سی سی ٹی وی بند رکھنا۔ پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگیں۔''

پھر اسی کے کہنے پر آفیسر منیبہ کو انویسٹی گیشن روم میں لے گیا تھا۔ گزرا وقت تکلیف دہ پچھتاوا تھا۔ وہ آہستگی سے اس کی جانب بڑھنے لگا جب نرس نے آ کر کہا تھا۔

''سر بی پازیٹو گروپ ہے ان کے خون کا، انتظام ہوا ہے؟'' یلماز نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا بی پازیٹو ہے۔''

نظریں منیبہ پر جمی تھیں ''میں دوں گا۔''

بھنوں کی ناگوار جنبش سے منیبہ نے رخ پھیر لیا۔

☆☆☆

وہ خون دینے کے بعد اس کے پاس کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے آ بیٹھا، منیبہ نے پہلو بدل لیا، کچھ دیر کی خاموش تنی گھمبیر کو یلماز کی ٹھہر ٹھہر کر ابھرتی سرگوشیوں نے پھاڑا۔

''میں نہیں جانتا وہ سب میں کیوں کرتا رہا، حالانکہ میری گھڑی تب ہی ٹھیک ہو گئی تھی، مگر تمہیں زچ کرنے میں مزا آنے لگا۔ تمہارا ایٹی ٹیوٹ میری کمزوری بن گیا۔ میں تمہیں اپنے آس

پاس دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر دل میں ایک کمینی سی خواہش ابھری، یہ لڑکی کسی کام، کسی سفارش کے لیے مجھے کیوں نہیں کہتی، جیسے باقی کہتی ہیں۔ کاش یہ میری منتیں کرے اور میں اس کا کام کر بھی دوں۔''

اس نے توقف کے ساتھ تھکی ہوئی سانس کھینچی منیبہ بالکل خاموش سامنے دیکھتی رہی۔

''مگر تمہارے اپنے اصول تھے، جو میں توڑنے کے چکر میں خود ٹوٹ گیا۔ وقت اور مرد کو تم نے توڑ دیا۔ تمہارے وہ لفظ، آنسو اور وہ شہابیے۔'' اس نے آہ بھری ''جیسے شیطان کو باندھ کر انسان کنکر مارتا ہے، جیسے اللہ کی طرف سے اس پر جہنم کا گولا پھینکا جاتا ہے، مجھے ہر پل تمہارے مارے کنکر کی نوکیں، گولوں کی تپش جھلسا رہی ہے۔ شیطان ہی ہوں میری شیطانیت سرکشی پر اتر آئی تھی تب ہی تو وہ چیزیں مجھ پر برسیں۔''

یلماز کے آہستگی سے روندھے لہجے پر منیبہ نے گردن پھیر کر اس کی جانب دیکھا تھا اس کی آنکھیں سرخ اور ہلکی سی نم تھیں ایک شکست خوردہ انسان کی طرح سامنے دیوار کے نچلے کونے کو دیکھ رہا تھا جیسے مکوڑا بار بار گرنے کے بعد چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ منیبہ کے دیکھنے پر اس نے نظروں کا رخ پھیرا اور ملتجی انداز میں دیکھا تھا۔

''مرد اور وقت ہر لمحے ظالم نہیں ہوتے، یہ مہربان بھی ہوتے ہیں، مرہم بھی رکھتے ہیں۔ اعزاز بھی بخشتے ہیں، سراہتے بھی ہیں۔'' منیبہ نے دوسری جانب نگاہ پھیر لی۔

''مجھے چار سال ہو گئے لوگوں کے گھاؤ سیتے ہوئے، مگر اپنا آج بھی ادھڑا ہوا ہے۔'' منیبہ نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا اس نے فوراً اس کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

''مجھے معاف کر دو منیبہ! یہ تو مجھے تمہارے جانے کے بعد پتا چلا، میں تمھیں زچ نہیں بلکہ محبت کرتا تھا۔ میں بہت تکلیف میں ہوں پلیز معاف کر دو۔ تم کہو تو ہر اس شخص کے سامنے تم سے معافی مانگنے کو تیار ہوں، جن کے سامنے تمہیں تنگ کیا۔''

اسے دیکھتے ہوئے منیبہ نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لی تھیں چہرا ایسے تھا جیسے شدت سے آتے رونے کو روکنے میں ناکام ہوتا جا رہا ہو پلکوں کی نوکوں سے کئی آنسو ٹوٹ کے چمکتے گلابی گالوں پر بہے، یلماز کو حق نہیں تھا اس کے آنسو کو چھونے کا اس نے فوراً اپنی بے بسی پر نظروں کا زاویہ پھیر لیا۔ دوسری جانب سے آتی نرس نے چلتے چلتے کہا تھا۔

''یلمی صاحب! آپ ایم ایس کے پاس آرام سے بیٹھ جائیں، یہاں تنگ ہوں گے۔'' اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں، اٹس اوکے۔'' ایمرجنسی کا دروازہ کھلتے ہی وہ جلدی سے اٹھا، منیبہ بھی ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔

''الحمدللہ، آپ کی پیشنٹ خطرے سے باہر ہے۔'' ڈاکٹرز کہہ کر تیزی سے گزر گئے تھے۔

منیبہ کی اٹکی سانسیں ایک دم سے خارج ہوئیں بہت دیر سے روکی ہچکیاں یک دم باہر نکلی تھیں اس لمحے اسے یہ بھی یاد نہیں رہا اس کے قریب کون ہے، ایک بے بس سا ماتھا یلماز کے کندھے کی پشت پر زور سے ٹکا تھا، دھیرے دھیرے کندھا بھیگنے لگا، بلقیس اور اپنے کھوئے وقار کے بچ جانے کے آنسو سب باہر آ گئے یلماز نے ہتھیلی سے اس کے سر کو تھپکا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک خوب صورت شام کا منظر تھا شہر کی عمارتوں سے سورج بچ کر نکلتا جھیل کی لہروں سے ملنے کو بے قرار تھا، اچھے خاصے لوگ تھے کچھ فیملی کے ساتھ، کچھ اکیلے، کہیں اونٹ کی سواری کا مزا لیا جا رہا تھا، تو کہیں بیٹری سے بھاگتی کاروں کا اور کئی تو آئے ہی کھانے پینے کے ذائقوں سے لطف اندوز ہونے تھے۔ اسی ہجوم میں یلماز اور منیبہ بھی شامل تھے۔ وہ جما کر قدم رکھتا اسے جھیل کے اس کنارے کی جانب لے آیا تھا جہاں ہجوم قدرے کم تھا، لکڑی کے تنے کو کاٹ کر میز اور کرسیوں کی شکل میں ایک جگہ سجی تھی، ٹیبل کے کناروں پر سرخ گلاب کا بارڈر تھا اور درمیان میں

PakiBooks.Site

موتیے کی کلیوں سے ''آئی ایکسٹریملی سوری'' لکھا تھا جس پر موم بتیاں ٹمٹما رہی تھیں یلماز وہاں آ کر ٹھہر گیا، منیبہ کی آنکھیں تحیر سے پھیلی جا رہی تھیں۔

ہاسپٹل کے واقعے کے بعد وہ مسلسل رابطے میں تھے اور وہ بار بار اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر رہا تھا، آج بلقیس کی سفارش پر وہ طے شدہ جگہ آ گئی تھی، مگر اس سب کا اندازہ نہیں تھا، اس نے سوالیہ نگاہ اٹھائی وہ مسکرا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگا تھا وہ ادا سے ٹانگ پر ٹانگ جمائے ایسے بیٹھی تھی گردن اٹھی ہوئی تھی، کمر سیدھی، اور نگاہ اس پر جمائے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

''اگر معصوم پھول روشنی کے ہمراہ سفارشی بن کر آئیں تو معاف کر دینا چاہیے۔''

اس کے ذومعنی انداز پر اس نے استہزا میں کہا تھا۔

''اپنی خطاؤں پر معصوموں کو سفارشی بنانا، کچھ اچھی بات نہیں، سر!''

''سر نہیں، یلماز...... یلماز حسین نام ہے میرا۔''

منیبہ نے مٹھی بھر کر موتیے کے پھول اٹھائے، آنکھیں بند کرتے ہوئے ان کی خوشبو اپنے اندر اتاری تھی، جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں وہ کانوں کی لوؤں چٹکی میں پکڑے کہہ رہا تھا۔

''اور پلیز اب یلماز حسین کو معاف کر دو۔''

اس نے پھول اس کی جانب رکھتے ہوئے احسان جتلاتے کہا تھا۔ ''جاؤ معاف کیا۔''

یلماز نے اپنی جیب سے ایک ڈبیا نکالی کھول کر اس کے سامنے رکھ دی نازک سی بریسلٹ اس میں جگمگا رہی تھی، جس میں چھوٹے چھوٹے سے چند شہابیے لگے تھے۔

''یہ کیا'' منیبہ کو حیرانی ہوئی۔

''معاف کر دینے پر تحفہ، قبول کر کے مجھے اعزاز بھی بخش دو۔''

''بہت خوب۔''

اس نے بریسلیٹ نکالی ہتھیلی پر پھیلاتے ہوئے استہزائیہ کہا تھا۔

''معافی کے بدلے، مجھے آگ کے گولے دے رہے ہو۔'' اس نے آگے جھک کر بریسلیٹ اس کی ہتھیلی سے اٹھائی بنا اجازت اس کی نازک کلائی پر باندھتے کہا تھا۔

''آگ کی تپش تو شیطان کو بھگا کر بجھ چکی ہے، اب یہ قیمتی پتھر محبت کے تحفوں میں استعمال ہوتا ہے۔''

بریسلیٹ اس کی سفید کلائی میں جگمگا گئی۔ یلماز کو اب شرارت سوجھی تھی کرسی کے بیک سے پشت ٹکاتے اپنے پرانے انداز میں لوٹ آیا۔

''اب مجھے ٹائم کب دے رہی ہیں آپ، مس منیبہ؟'' وہ لمحہ بھر ٹھٹکی وہ مہارت تاثرات بدل کر بولا۔

''اوہ...... مس، آپ غلط سمجھیں۔ میں اپنی گھڑی کی......'' وہ پہلے کی طرح قطعیت سے بات کاٹ کر بولی تھی۔

''نو نو نو مسٹر یلماز حسین...... آپ غلط سمجھے ہیں۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں آپ کو ٹائم اسکاٹ لینڈ میں دیا جائے یا اپنے کاغان میں۔ دونوں جگہ بہت خوب صورت ٹائم ملتے ہیں، میرا مطلب ہے خوب صورت گھڑیاں۔'' اب دونوں کا مشترکہ قہقہہ جھیل میں اترتے سورج نے سنا تھا اور ہر منظر اس قہقہے کا گواہ بن گیا۔

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... صائمہ انصار
میک اپ ... روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ..... موسیٰ رضا

رابعہ افتخار

دستِ صبا مہرباں

رمضان المبارک کی آمد آمد تھی۔ اس نے سودے کی لسٹ بنا کر صبح ہی اکرام کو دے دی تھی۔

اس سال تو فریج بھی نیا اور بڑا تھا۔ وہ آرام سے گوشت سبزیاں اور بقایا سامان محفوظ کر سکتی تھی۔ عید کے لیے اپنی، اکرام کی اور بچوں کی شاپنگ پہلے ہی کرلی تھی۔ بس گھر کی آرائش کی کچھ چیزیں رہ گئی تھیں۔ جب سے وہ الگ ہوئی تھی یہ پہلا رمضان تھا۔ جوش اور خوشی بھی زیادہ تھی، سارے گھر کی صفائی بھی وہ بہت دل سے کر رہی تھی۔ نئے پردے لگا کر بھی دل بہت خوش تھا۔ ابھی پچھلے سال ہی اس کی ساس نے دونوں بہوؤں کو الگ الگ کر دیا تھا خوش دلی سے اور خود جب جس کے پاس جی چاہتا رہ لیتیں۔ نندوں کا بھی یہ ہی حال تھا جب بھی آتیں دونوں بھابھیوں کے پاس ملنے جاتیں۔ کھانا کھاتیں، دونوں کے بچوں کے ساتھ ایک جیسا پیار کرتیں۔ زندگی یوں تو بہت پر سکون اور خوش گوار ہوگئی تھی مگر اسلام بھائی کا کام جمتا ہی نہیں تھا۔ وہ بے چارے جب کوئی کام شروع کرتے، نقصان ہی نقصان...... گھاٹا ہی گھاٹا...... حالات بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہی ہو رہے تھے۔ اس کی ساس بھی بڑی زمانہ شناس خاتون تھیں۔ ایک ہی گھر میں دونوں بیٹوں کے معاشی فرق کو دیکھتے ہوئے انہوں نے الگ کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ دونوں طرف کا پردہ قائم رہے، رات کو اکرام سودا سلف لے کر آئے تو سامان دیتے وقت کہا۔

"کچھ چیزیں رہ گئی ہیں، وہ کل لے آؤں گا۔"

"یاد سے لے آیے گا اور ہاں، اماں جن دنوں اُدھر رہتی ہیں، اماں کے دلیے کا ڈبا اور شوگر فری جوس کا کھلا ڈبا ساتھ جاتا ہے۔ وہ بھی یاد سے لے آیے گا۔" اس نے یاد دہانی کروائی۔

تحریم کی ایک بات اچھی تھی، وہ اس کی امی اور بہنوں کے معاملے میں بھی چھوٹی بڑی ہر چیز کا خیال رکھتی تھی۔

"ہاں وہ بھی یاد ہے، یہ اسلام اماں کی ایسی چیزوں کا بھی خیال نہیں رکھ سکتا۔" وہ بڑبڑاہٹ انداز میں بولے تھے تحریم کو اچھا نہیں لگا۔

"بری بات ہے اکرام! ماں کے معاملے میں میرا تیرا نہ کیا کریں آپ لوگ! آپ نے کیا یا اسلام بھائی نے کیا، ایک ہی بات ہے۔ آپ نے کبھی اماں کے پاؤں دبائے، اسلام بھائی روزانہ اماں کے پاؤں دبا کر سوتے ہیں۔ کچھ خدمت ان کے حصے میں آرہی ہے، کچھ آپ کے حصے میں۔" تحریم ڈانٹ کے انداز میں بولتی سارا سامان سمیٹنے لگی۔ ساتھ ساتھ اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی، کبھی اسے جیم کی بوتل چھوٹی لگ رہی تھی اور کبھی گرم مسالا ضرورت سے زیادہ لگ رہا تھا۔ اکرام کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆❀☆

رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوگیا تھا، آج پہلا روزہ تھا۔ افطاری کا وقت بس ہوا ہی چاہتا تھا، افطاری میں پکوڑے، دہی بڑے اور شامی کباب بنائے تھے تحریم نے۔ وہ شروع سے ہی میانہ روی کی قائل تھی۔ افطار میں بھی روزانہ دو یا تین چیزوں سے زیادہ نہ بناتی تھی۔ کھجوریں اور شربت تو ہوتا ہی تھا، رات کے کھانے کے لیے جو سالن بناتی، اسی میں سے تھوڑا سا سحری کے لیے نکال لیتی۔ کبھی کبھی سحری کے لیے الگ سے قیمہ یا چکن بھون لیتی یا پھر خاگینہ۔ ٹرے میں تھوڑا افطاری کا سامان رکھ کر وہ نادیہ کے گھر آئی تھی۔ پہلی افطاری سے لے کر آخری افطاری تک روزانہ کسی نہ کسی کے گھر افطاری بھیجنا پہلے بھی معمول تھا، اس سال تو وہ الگ تھی، اس لیے خود ہی افطاری بانٹنے کا ارادہ تھا۔

"السلام علیکم نادیہ!" اس نے باورچی خانے کے دروازے پر رک کر سلام کیا۔ اندر کا منظر ہی اور تھا۔ ڈھیروں ڈھیر پکوڑے ایک ڈش میں نکالتے ہوئے وہ ہلکان ہو رہی تھی۔ قریب ہی دونوں بچے فروٹ کاٹنے میں مصروف تھے، آدھا پھل چھلکوں



کے ساتھ ہی لگا ڈسٹ بن کی نذر ہو رہا تھا۔

''وعلیکم السلام! کیا لائی ہو تحریم! بھئی تمہارے ہاں تو بڑی زیادہ افطاری بن رہی ہوگی، ماشاء اللہ سے کھاتے پیتے لوگ ہو۔'' وہ ہاتھ پونچھتی اس تک آئی تھی۔

''ارے نہیں نادیہ! زیادہ کچھ تو نہیں بنایا، پھر بچ جاتا ہے، ضائع ہو جاتا ہے تو دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر نعمت سے نوازا ہے۔'' اس نے ٹرے اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔

''لگتا ہے تم خوب اہتمام کر رہی ہو؟'' اس نے کچن کا پھیلاوا دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے کہاں تحریم! تمہارے اسلام بھائی کا کام ہی نہیں ہے، یقین مانو اس مہنگائی کے دور میں پوری ہی نہیں پڑتی۔ نہ کسی چیز میں برکت ہے، بس یہ پکوڑے بنا رہی ہوں اور فروٹ چاٹ ہے۔'' وہ اس کے برتن خالی کرنے لگی، تحریم ایک نظر میں ہی سمجھ گئی کہ نادیہ کے ہاں مسئلہ کیا تھا، مگر کچھ کہہ نہ سکی۔

''بچے ہیں ناں، ضد کرتے ہیں تو پھر کرنا پڑتا ہے۔'' وہ برتن دھو کر اس کے ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی۔ ڈش میں سے پکوڑے نکال کر اس کی تھالی خشک کر کے اس میں ڈالے اور واپس تھمائی تھی۔ اس کی پلیٹ میں ڈالنے کے باوجود پکوڑوں والی ڈش سے پکوڑے ابل ابل کر باہر گر رہے تھے۔

☆❁☆

افطاری کا دسترخوان لگواتے ہوئے تحریم نے ملائکہ اور صارم کو مدد کروانے کا کہا تھا۔ دونوں بچے کچن سے برتن لا کر دسترخوان پر لگانے لگے تھے۔ ملائکہ ہفتم جماعت کی طالبہ تھی اور صارم چہارم میں پڑھتا تھا۔ دونوں بچے بہت سلجھے ہوئے اور تمیزدار تھے۔

افطاری کے بعد صرف دو تین شامی کباب بچے تھے، تحریم نے ائیر ٹائٹ جار میں رکھ کر سارے برتن دھو دیے۔ عشا کی اذان ہوتے ہی اکرام تراویح کے لیے چلے گئے، اماں جی بھی نماز کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ بھی عشا کی نماز کی تیاری کرنے لگی۔

نماز پڑھ کر اماں جی نادیہ کی طرف چلی گئیں۔ اس نے عشا کی نماز ادا کر کے کھانا لگایا تو اماں جی آگئیں، ان کے ہاتھ میں سالن کا ڈونگا تھا۔

''یہ کیا ہے اماں جی؟''

''نادیہ نے دی ہے کڑھی پکوڑے کا سالن ہے۔ کہہ رہی تھی کہ بچوں نے ضد کی تو بنا لیا لیکن بچوں نے باقی افطاری کی چیزیں کھالیں۔ اب اتنی کڑھی بچ گئی ہے۔'' اماں جی نے ڈونگا اس کے ہاتھ میں تھمایا، کڑھی کے اوپر تیرتا گھی دیکھ کر ہی تحریم کا دل بھر گیا۔

''بچے تو چھوٹے ہیں اس کے، انہیں تو سمجھ نہیں۔ اسے خود عقل ہونی چاہیے، اتنی کڑھی بنالی، اب میں نے بھی سالن بنایا ہوا ہے سبزی کا، اس کا میں کیا کروں گی اور اوپر سے اتنا زیادہ گھی ڈال کر بگھار لگایا ہوا ہے۔'' وہ کچن کی طرف مڑ گئی۔ وہ حتیٰ المقدور کوشش کرتی تھی کہ کھانا ضائع نہ ہو۔ اب اس کڑھی کے ڈونگے نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔

رات کھانا کھا کر وہ چھت پر واک کے لیے چلی گئی، اکرام بھی آگئے۔

ابھی انہیں واک کرتے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ساتھ گھر سے اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں۔ غور کرنے پر پتا چلا کہ نادیہ اور اسلام بھائی میں کسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہی فکر مندی سے ان کے گھر کی طرف والی منڈیر پر آگئے۔ صحن کا منظر تو واضح تھا، وہاں کوئی نہیں تھا البتہ ٹی وی والے کمرے سے بلند آواز آرہی تھی شاید جھگڑے کی آواز کو دبانے کے لیے ہی ٹی وی کی آواز بلند کی گئی تھی۔

''بس کر دو نادیہ بیگم! بس کر دو۔'' اسلام بھائی کی آواز آئی تھی۔

''کیا بس کر دوں...... گھر کا سامان ختم ہوگا تو

PakiBooks.Site

آپ سے ہی کہوں گی ناں...... اور یہاں آتا ہی کیا ہے؟'' وہ بھی چلائی تھی۔

''ابھی پرسوں ہی تو میں اتنا سامان لایا تھا۔ میرا خیال ہے اگر صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو ہفتہ بھر کے لیے بہت تھا۔'' اسلام بھائی کی بات سن کر ان دونوں نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا تھا۔ ''اب یہ نیا سنا دیا تم نے کہ گھی بھی ختم ہے۔'' ان کی بات سن کر تحریم نفی میں سر ہلانے لگی۔

''صحیح کہہ رہے ہیں اسلام بھائی! بہت فضول خرچ ہے نادیہ، ضرورت سے زیادہ کھانا بنا کر ضائع کرنا عادت ہے اس کی۔ اماں جی بھی اسی وجہ سے پریشان تھیں۔'' تحریم نے دیوار سے ہٹتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔ اکرام کے چہرے پر بھی تفکر کی لکیریں پھیل گئیں۔ اسلام کی زندگی پرسکون نہیں تھی، وہ بھائی تھا، یہ سب سن کر اس کے لیے پریشان ہو گئے۔

''تو تم یا اماں جی سمجھاتے کیوں نہیں اسے؟'' اکرام نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''توبہ کریں، نادیہ غصے کی بہت تیز ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے۔'' وہ بھی سیڑھیاں اترنے لگی۔

''فضول خرچی سے تو گھر برباد ہو جاتے ہیں اور ناشکرا پن بھی سوائے پریشانی اور جلن کے کچھ نہیں دیتا۔'' اکرام نے دکھ سے کہا۔

☆❁☆

رمضان کا دوسرا عشرہ شروع ہو چکا تھا، اس نے نندوں کی افطاری تو باری باری کر دی تھی۔ اس طرح کام کا بھی زیادہ بوجھ نہیں پڑتا تھا اور تھوڑی بہت اضافی چیزوں کے ساتھ افطاری کی دعوت بھی ہو جاتی تھی۔ بس اب نادیہ اور اسلام بھائی رہ گئے تھے۔ وہ انہیں افطاری کی دعوت دینے کی غرض سے گئی تھی، نادیہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ بچے ٹی وی کے آگے بیٹھے تھے، کچن میں پریشر ککر چلنے کی آواز آرہی تھی۔

''السلام علیکم نادیہ!''

''وعلیکم السلام، کیسی ہو تحریم! آؤ بیٹھو۔'' وہ خود بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اللہ کا شکر ہے، میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں بس ذرا سر میں درد ہے، تم سناؤ، کیسے آنا ہوا؟''

''میں آپ لوگوں کو افطاری کی دعوت دینے آئی ہوں۔ کل کی افطاری ہماری طرف ہے۔'' اس نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ارے کیوں تکلف کیا تم نے تحریم! روزہ رکھ کر کہاں کرو گی اتنا کام؟'' وہ شاید مروتاً کہہ رہی تھی۔

''ہوں...... نہیں، تکلف کیسا ہے، یہ تو مل بیٹھنے کا بہانہ ہوتا ہے، بس کل تم لوگ وقت پر آجانا۔'' وہ تاکید کرتی اٹھ گئی۔

''ہاں ہاں، ضرور۔'' وہ اسے وہیں سے رخصت کر کے دوبارہ لیٹ گئی، گھر آتے ہی اس نے اماں جی کو بتایا تھا۔

''نادیہ کے گھر کی حالت دیکھ کر تو اسلام بھائی کی ہمت کی داد دینے کو کرتا ہے۔ چارپائی کے نیچے گندے کپڑوں کا ڈھیر تھا، عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی اور تو اور چھوٹا سلنڈر کمرے میں ہی ایک کونے میں رکھا تھا۔ اماں ایسی حالت تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو ایک کمرے میں رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نادیہ کا تو ماشاء اللہ اچھا خاصا بڑا گھر ہے اس پر غضب خدا کا، کمرے میں دودھ کی دیگچی کھلی رکھی تھی۔ کم از کم چار کلو دودھ تھا جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے ڈھائی کلو لگوا رکھا ہے، ایک کلو چائے کے لیے اور بقایا ڈیڑھ کلو سب کے پینے کے لیے۔ اماں آپ ہی سمجھائیں اسے۔'' وہ صوفے پر بیٹھ کر اماں کی طرف دیکھنے لگی جو بس ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔

''کیا سمجھاؤں؟ وہ تو پہلے ہی روتی ہے کہ فلاں کا نصیب اتنا اچھا ہے اور میں ایک ایک چیز کو

ترستی ہوں۔" اماں نے پہلو بدلا۔

"مگر اس طرح تو گھر کا سکون الگ ختم ہوگا اور اسلام بھائی الگ بدظن ہوتے جائیں گے۔" وہ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"کیا کہہ سکتے ہیں یہی تو فکر ہے۔"

☆❁☆

اگلے روز عصر کے ٹائم ہی وہ اور ملائکہ کچن میں مصروف ہو گئیں۔ اماں جی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھیں تلاوت میں مصروف تھیں۔ افطاری کا مینیو بھی اماں جی کے مشورے سے بنایا تھا۔ شربت، پکوڑے، چکن سموسے، فروٹ چاٹ اور دہی بڑے افطاری کے لیے بنائے تھے۔ کھانے میں قورمہ بنایا تھا، روٹیاں بھی گھر میں ہی پکانے کا ارادہ تھا۔ تندور کی روٹیاں اندازے سے منگواؤ تو کم زیادہ ہونے کا خدشہ رہتا تھا۔ گھر کی روٹی ساتھ ساتھ پک کر دستر خوان تک منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میٹھے میں اسلام بھائی کی پسند کی آئس کریم منگوالی تھی۔ وہ لوگ افطاری سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی آ گئے تھے۔

"دہی بڑے بہت مزے کے ہیں بھابھی! گھر میں بنائے ہیں کیا؟ ہمارے ہاں تو روزانہ تین پلیٹ بازار سے ہی آتے ہیں۔" اسلام بھائی نے افطاری کے وقت اپنے باؤل میں دوسری مرتبہ دہی بڑے ڈالتے ہوئے تعریفی انداز میں کہا تھا۔ اس دوران تحریم نے دیکھا، نادیہ نے بے حد خفگی سے اسلام بھائی کی سمت دیکھا تھا۔

"جی اسلام بھائی! گھر میں ہی بناتے ہیں۔ بازار کے کھانوں کا کیا بھروسا، صفائی کا تو بالکل خیال نہیں رکھا جاتا اور پھر بچ جائیں تو بازاری چیز فوراً خراب ہو جاتی ہے۔ میں نے تو آزما کر دیکھا ہے بازاری سالن ہو یا چاٹ، بے شک فریج میں بھی رکھو، ایک دو گھنٹے میں ہی ذائقہ بدلنے لگتا ہے۔" تحریم نادیہ کے سامنے سموسوں کی پلیٹ کرتے ہوئے بولی۔ اسلام بھائی اس کی بات سے متفق تھے، اسی لیے اثبات میں سر ہلانے لگے۔

"خیریت سے افطار ہو گئی، زیادہ کچھ بچا بھی نہیں۔ جاتے ہوئے اس نے قورمہ اور سادہ دہی نادیہ کو سحری کے لیے دے دیا۔

"ارے اس کی کیا ضرورت تھی، کل حلیم بنائی تھی۔ ڈھیر پڑی ہے، سحری میں ہم وہی کھا لیتے، ویسے کھاتے نہیں بچے یا اسلام باسی سالن۔" وہ جاتے جاتے قورمے کا ڈبا پکڑے بڑے فخر سے بتا رہی تھی، تحریم دل ہی دل میں اس کی عقل پر افسوس کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

☆❁☆

ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ نادیہ کے ہاں سے بھی افطاری کا پیغام آ گیا، دونوں نندوں نے بتایا کہ ان کو بھی دعوت دی گئی ہے۔

"اماں اس طرح تو بہت خرچا ہو جائے گا، اسلام بھائی کا ایک ساتھ اتنے لوگوں کی افطاری...... ہر چیز وافر مقدار میں چاہیے ہوگی۔"

"اگر مشورہ کرتی تو میں یہی کہتی کہ یا تو باری باری سب کی افطاری کرو، نہ تو کام کا بوجھ بڑھے اور نہ ہی خرچ زیادہ ہو اور یا پھر نندوں کے ہاں تھوڑی بہت بنا کر بھیج دو۔ ہاں تم لوگ ہمسائے میں ہو، ہم لوگوں کو بلا لیتی مگر کسی سے پوچھے، کسی کی سنے تب ناں۔" اماں جی کا غصہ بجا تھا، اس نے عصر کی نماز ادا کرتے ہی ملائکہ کو نادیہ کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ ملائکہ کو دیکھتے ہی نادیہ نے شکر ادا کیا تھا۔

"آؤ بھئی ملائکہ! دادی نے بھیجا ہوگا۔"

"جی چاچی! دادی نے بھیجا ہے، کہہ رہی تھیں کہ آپ اکیلی ہیں تو آپ کی مدد کروا دوں۔" وہ وہیں باورچی خانے میں آ گئی، ہر طرف پھیلاوا ہی پھیلاوا تھا۔

"کیا بنا رہی ہیں چاچی؟" اس نے بے ترتیبی دیکھ کر ان کی سمت دیکھا۔

"ہاں بھئی بہت کچھ بنا رہی ہوں، فروٹ چاٹ ہے، وہ تو میں نے بنا کر فریج میں رکھ دی۔ دہی بڑے اور سموسے بازار سے آ جائیں گے،

پکوڑے گھر میں ہی بناؤں گی۔ تم پکوڑوں کے لیے پالک دھو کر کاٹ دو، اور سنو! کنجوسی سے کام نہ لینا۔ تمہاری ماں نے تو پکوڑوں کے معاملے میں کیا خوب بچت کی تھی، افطاری کے بعد گن کر چھ پکوڑے بچے تھے تھال میں۔" وہ بات کے آخر میں ہنس دی۔ ملائکہ کو اچھا تو نہیں لگا مگر وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

"شامی کباب بھی بنا کر فریز کر دیے تھے، پچاس کباب فرائی کر لینا۔" وہ چکن کے لیے مسالا بھونتے ہوئے بولی۔ ملائکہ نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا، جیسے اس کی دماغی حالت پر شک ہو۔ دونوں پھوپھیوں اور دونوں بھائیوں کے گھر کے افراد ملا کر اٹھارہ لوگ بنتے تھے اور اگر دو، دو کے حساب سے بھی کباب فرائی کیے جاتے تب بھی چھتیس کباب بہت تھے۔

"مسجد میں بھی بھجوانی ہے کیا؟"

"ارے نہیں، مسجد میں تو ستائیس رمضان کو بھجواؤں گی۔ کوئی بھی چیز کم نہ پڑے بس۔" اور ان کی اس بات پر ملائکہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ افطاری کے ٹائم نادیہ نے کچوریاں اور اسپرنگ رول بھی بازار سے ہی منگوا لیے۔ ڈھیروں ڈھیر سامان، کولڈ ڈرنکس بھی ہر طرح کی منگوالیں۔ اماں جی اور تحریم ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں، افطاری کے بعد کھانا لگا دیا، گھر کی بنی چکن کڑاہی اور بازار سے منگوائی بریانی۔ سب نے ہی پیٹ بھر کر افطاری کی تھی۔ کھانے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اتنا سامان بچ گیا، اماں جی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تحریم کو اشارہ کیا۔

"اتنا کچھ بچ گیا...... کسی نے ڈھنگ سے کھایا ہی نہیں۔" سب کے جانے کے بعد نادیہ فکر مندی سے دستر خوان کا جائزہ لینے لگی۔ اسلام نے سنی ان سنی کرتے مسجد کی راہ لی، ملائکہ جو برتن دھلوانے کے خیال سے رک گئی تھی، ان کی پریشانی پر دکھ سے انہیں دیکھنے لگی۔

"سب نے ڈھنگ سے ہی کھایا ہے چاچی! اصل میں روزے کے بعد پیاس اتنی ہوتی ہے کہ پانی اور مشروبات زیادہ پیے جاتے ہیں اور کھانا کم کھایا جاتا ہے۔ آپ نے بھی تو بہت زیادہ مقدار میں منگوالیا سب کچھ۔ پکوڑے اور کباب بھی ڈبل سے زیادہ بنوالیے۔" ملائکہ کی بات اسے ناگوار گزری تھی مگر خاموشی سے ڈبوں میں کھانا پیک کرنے لگی۔ ملائکہ نے سارے برتن دھلوا کر باورچی خانہ بالکل صاف کروا دیا تھا۔ وہ اجازت لے کر آنے لگی تب ہی نادیہ نے چکن کڑاہی، شامی کباب اور فروٹ چاٹ کے ڈبے اس کے حوالے کیے تھے۔

"اب دیکھ لیجیے گا ماما کل کی افطاری میں بس پکوڑے ہی بنائیں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے ڈبے تھامے تھے۔

"بھئی بڑی ہی کنجوس ہے تمہاری ماما۔" اس نے اپنی طرف سے مذاق کیا تھا لیکن اس بار ملائکہ نے ماں کی صفائی میں بولنا ضروری سمجھا تھا۔

"کنجوس نہیں ہیں، کفایت شعار ہیں، میانہ روی سے چلتی ہیں۔ فضول خرچ کو تو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے ناں چاچی!" وہ بات مکمل کر کے باہر نکل گئی۔

☆❁☆

دوسرے روز افطاری کے بعد اماں جی گھبرائی ہوئی تحریم کے پاس آئیں۔

"بھئی بہت سخت لڑائی ہوئی ہے اسلام اور نادیہ میں۔ عید کی شاپنگ کے لیے اس سے بیس ہزار مانگ رہی تھی، اسلام نے آٹھ ہزار دے کر کہہ دیا کہ بس یہی ہیں...... وہیں سے لڑائی شروع ہو گئی۔ کل کی افطاری کے اخراجات بھی گنوائے گئے، اسلام نے فضول خرچ اور جاہل کہہ دیا، یہ رونے بیٹھ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خوب طعنے دیے، میں تو منہ سر لپیٹ کر نکل آئی۔"

"اماں جی! آپ کو سمجھانا چاہیے تھا ناں۔ اسلام پریشان ہوگا۔" اکرام نے سنا تو وہ بھی فکر مند

ہو گئے۔ عام حالات میں لڑائی جھگڑے کرنا مہذب اور شریف گھرانوں کو زیب نہیں دیتا یہ تو پھر رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔

''کیا سمجھاؤں اور کسے سمجھاؤں۔'' اماں جی تو مایوس ہو چلی تھیں۔

''میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔'' تحریم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ دوپٹا درست کرتی اٹھ گئی۔ وہاں نادیہ کمرے کے پلنگ پر بیٹھی شاید اپنی امی کو ساری تفصیل بتا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی موبائل کان سے ہٹا کر بند کر دیا۔

''آؤ تحریم! کیسے آنا ہوا؟'' اس کے لیے کرسی گھسیٹتے ہوئے بولی۔

''یوں ہی سوچا عید آنے والی ہے، تم سے عید کی شاپنگ کے حوالے سے کچھ مشورہ ہی کر آؤں۔ پچھلے سال تو اکٹھے تھے، اماں جی کے مشورے سے سب چل رہا تھا مگر جب سے الگ ہوئے ہیں جب تک اماں جی سے کچھ پوچھو ناں، وہ بھی مشورہ نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں بھئی اب تم لوگ آزاد ہو، خود مختار ہو جو جی میں آئے کرو۔'' تحریم نے ہلکے پھلکے انداز میں بات شروع کی تھی۔ اس نے نادیہ پر قطعی ظاہر نہ ہونے دیا کہ اماں جی نے اسے کچھ بتایا ہے۔

''ہاں، صحیح کہتی ہو۔ اماں جی تو اپنے بیٹوں کو بھی کچھ نہیں سمجھاتیں، خیر عید کی شاپنگ کا مجھ سے کیا پوچھنے آئی ہو۔ میں تو شاید اس مرتبہ شاپنگ نہ کروں۔'' وہ مایوس سی تھی۔

''کیوں، کیا ہو گیا؟'' تحریم نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے بالکل علم نہ ہو۔

''بس اس مرتبہ خرچا بہت ہو گیا، اسلام نے جتنے پیسے دیے تھے ان میں تو بس بچوں کے ہی کپڑے ہی آئیں گے۔''

''تو تم عید کے لیے الگ سے بچت نہیں کرتیں نادیہ؟'' تحریم نے طریقے سے بات شروع کی تھی۔

''آج کل کے مہنگائی کے دور میں بچت ہوتی کب ہے بہن!''

''کرنے کی کوشش کرو تو ہو بھی جاتی ہے، میں نے تو گھر میں تین گلک بنا رکھی ہیں۔ سارا سال ان میں رقم ڈالتی ہوں، جتنی بچت ہو جائے۔ دس، بیس، پچاس، کبھی کبھی پانچ سو ہزار بھی ڈال دیتی ہوں۔ ایک گلک ٹوٹتی ہے، بچوں کے رزلٹ آنے پر، نیا یونیفارم، کتابیں، بیگ...... اس طرح اکرام کی کچھ مدد ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات تو نانی نانا کی طرف سے دی گئی مبارک کے پیسے ملا کر اور گلک کے پیسے ملا کر ہمیں اکرام سے ایک روپیہ بھی نہیں لینا پڑتا۔ دوسری گلک ٹوٹتی ہے جب خاندان میں شادی بیاہ آ جائے، تیسری گلک ٹوٹتی ہے عید الفطر اور رمضان کی تیاری کے لیے۔ اس گلک میں، میں اکرام کے دیے گئے خرچ سے رقم بچا کر بھی ڈالتی ہوں اور بعض اوقات اپنے سلائی کے پیسے بھی ڈال دیتی ہوں (تحریم بھی کبھار سلائی کا کام بھی کر لیتی تھی) اور ایسا میں شروع سے کرتی آ رہی ہوں۔ جب سے شادی ہوئی ہے ابھی رمضان سے کچھ دن پہلے گلک کھولی تو پچیس ہزار نکلے تھے، ملائکہ بھی ڈالتی رہی اپنی پاکٹ منی سے۔ دس ہزار ہم نے اکرام کو دیے، سودا سلف لانے میں ان کی مدد ہو گئی اور پندرہ عید کی شاپنگ کے لیے رکھ لیے۔'' وہ بول رہی تھی، نادیہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''اتنی بچت کیسے کر لیتی ہو؟ اکرام بھائی کا کام بھی تو خوب چلتا ہے ناں۔'' نادیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، مگر ہم بچت بھی کرتے ہیں۔ ملائکہ کو پچھلی مرتبہ اس کی سالگرہ پر سب نے ہی کیش دیا تھا، اس نے سارا میری گلک میں ڈال دیا۔ اسی طرح پچھلے سال کی عیدی بھی دونوں بچوں نے گلک میں ڈال دی۔''

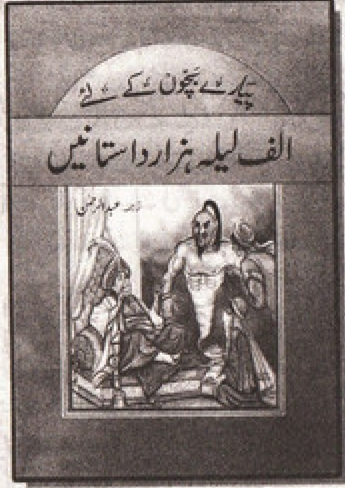
''یہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں، ضرورت نہیں پڑتی ناں اور کام بھی ٹھیک ہے اکرام بھائی کا۔'' نادیہ کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

''ہاں مگر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سب ہی بچت کر سکتے ہیں۔ اب دیکھو مجھے پتا ہے، سب ہی مجھے کنجوس کہتے ہیں، کبھی کبھی تو اکرام بھی کہہ دیتے ہیں مگر مجھے پتا ہے گھر چلانا کتنا مشکل ہے، اس مہنگائی کے دور میں۔ میں بس اتنا ہی پکاتی ہوں جتنا ایک وقت میں پورا ہو جائے، فالتو کھانا یا تو فریج کی زینت بن جاتا ہے یا پھر ضائع کر دیا جاتا ہے، اس طرح بھی اچھی خاصی بچت ہو جاتی ہے۔ تم بھی کبھی آزما کر دیکھو، وہ راشن جو ایک مہینے چلا سکتی ہو، کیوں دس پندرہ دن میں ختم کر دو اور میں صرف کھانے کے معاملے میں کنجوسی نہیں کرتی، کپڑوں کے معاملے میں بھی بڑی احتیاط سے کام لیتی ہوں۔ گرمیوں میں گھر پہننے کے لیے سیل سے سستے لان کے سوٹ لے آتی ہوں اور گھر پر ہی سلائی کرتی ہوں۔ اپنے بھی اور ملائکہ کے بھی مگر عید کے لیے یا باہر آنے جانے کے لیے ایک دو اچھے والے جوڑے لیتی ہوں اور پھر پورا سیزن بہت سنبھال کر رکھتی ہوں۔'' تحریم بول رہی تھی اور نادیہ پر اثر ہونا شروع ہو چکا تھا۔ وہ بڑی محویت سے سن رہی تھی۔

''میں نے تو جب تمہیں دیکھا اعلا اور بڑھیا کپڑے پہنے ہی دیکھا اور یہ عقل نہ آئی کہ تم اس طرح بچت بھی کر سکتی ہو۔ اس طرح تو میں بھی کچھ نہ کچھ بچا سکتی ہوں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی تھی۔

''دیکھو نادیہ! ہمارے معاشرے میں ایک مرد ہوتا ہے، کمانے والا اور گھر کے پانچ یا چھ افراد ہوتے ہیں بیٹھ کر کھانے والے۔ ہم عورتیں اگر مرد کا ہاتھ نہیں بٹا سکتیں تو کم از کم اس طرح اس کی کمائی کو ضائع ہونے سے تو بچا سکتی ہیں ناں۔ آج کل کے مہنگائی کے دور میں تو بچت بہت ضروری ہے، میں یہ نہیں کہہ رہی کہ کنجوسی سے کام لو، مگر فضول اخراجات پر قابو پا لو تو بھی بہت ہے۔ اب بات نکلی ہے تو میں بہن سمجھ کر سمجھانے کے لیے کہہ رہی ہوں، اس روز تم نے سب کی مشترکہ افطاری کی، چلو ٹھیک ہے ایک ہی بار میں سب کو بھگتا دیا مگر تمام چیزیں ضرورت سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ بنا لیں۔ گھی، آٹا، نمک، مرچ

الف لیلہ ہزار داستانیں



دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب- 1200/ روپے
ڈسکاؤنٹ- 300/ روپے
آج ہی - 950/ روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ ءعمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

مسالوں سے لے کر آلو، پیاز، فروٹ تک ہر چیز ضائع گئی۔ کسی سے مشورہ کر لیتیں تو اتنا سب ضائع نہ ہوتا۔ وہی سامان جو تم سارا رمضان کا مہینہ چلا سکتی تھیں ایک افطاری میں استعمال ہو کر ضائع گیا۔ رمضان کا مہینہ تو بابرکت ہوتا ہے، بڑا مہربان ہوتا ہے۔ دستر خوان جتنا بڑا کرو گی رزق میں اور اضافہ ہوگا۔ اسی رمضان کی مہربانی اور برکت سے ان شاء اللہ تمہیں عید کی تیاری کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی مگر آئندہ کے لیے ایک بجٹ بنالو، جتنی بھی ہو سکے بچت ضرور کرنا، کام آئے گی تو مجھے دعائیں دو گی۔" تحریم نے اٹھتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ناشکری کفران نعمت ہے نادیہ! ہم جتنی بھی نمازیں پڑھ لیں، ذکر کر لیں جب زبان سے بار بار ناشکری کریں گے، پوری نہ ہونے کا رونا روئیں گے تو، یہ تو رب کو ناراض کرنے والی بات ہوتی ناں۔"

"ہوں...... ہاں۔" وہ جیسے گہری نیند سے جاگی تھی، یہی تو کرتی آئی تھی وہ، ہر بات میں ناشکرا پن، مہنگائی کا رونا۔

"چلتی ہوں، شاپنگ کا ارادہ بن گیا تو ضرور بتانا۔" نادیہ نے اس کی تمام باتیں تحمل سے سنی تھیں۔

"ہاں...... بس دعا کرنا۔" اس کو رخصت کر کے اندر آئی تو گھر کا جائزہ لیا۔ اس رونے میں گھر کی صفائی ستھرائی کی طرف بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ تحریم کا گھر اتنا صاف ستھرا ہوتا تھا، وہ کیا سوچتی ہوگی۔ گھر کی صفائی کے دوران کتنی ہی چیزیں ضائع اور خراب ہوتی نظر آئیں...... نئی بیڈ شیٹ جو اس کی سالگرہ پر امی نے بھجوائی تھی، اس نے شوق میں بیڈ پر بچھا دی تھی مگر اس کمرے میں سوائے بچوں کے کوئی نہ جاتا تھا۔ اپنی بے وقوفی پر رونا آیا، اس بیڈ شیٹ کو اٹھا کر دھونے کے لیے رکھا تھا۔

"اچھی خاصی بیڈ شیٹ ہے، دھو کر استری کر کے عید والے دن بچھالوں گی۔ نئی بیڈ شیٹ لینے کی بچت تو ہو ہی جائے گی۔" اب دماغ کی آنکھیں کھولی تھیں تو احساس ہوا تھا کہ اسلام کی کمائی کو وہ کس بے دردی سے لٹاتی رہی تھی۔ دونوں غسل خانوں میں اچھے خاصے تولیے لٹک رہے تھے، اس کے باوجود الماری سے نکال کر دو تولیے جو بالکل نئی حالت میں تھے صحن کی تار پر لٹکا رکھے تھے۔ اس نے انہیں بھی دھونے کی نیت سے مشین میں ڈال دیا۔ باورچی خانے میں بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، کیبنٹ سے نکال نکال کر نئے برتن شیلف اور سنک کی نذر ہو رہے تھے۔ دستر خوان اور صافیاں جو ٹھیک حالت میں تھیں، انہیں دھو کر خشک کر کے اگر واپس کیبنٹ میں رکھا جاتا تو وہ عید اور دعوت وغیرہ کے موقع پر کام آسکتی تھیں۔ آلو، پیاز کی ٹوکری کی اپنی ہی کہانی تھی، ابھی دونوں ٹوکریوں میں آدھ کلو یا کلو کلو آلو پیاز موجود ہوتے تھے جب وہ اوپر سے نئے آلو پیاز ڈال دیتی تھی، نیچے والے آلو پیاز پھر بوجھ کے نیچے دب جاتے تھے اور خراب ہو کر دوسرے آلو پیاز بھی خراب کر دیتے۔

"اس مرتبہ ساری ٹوکری بالکل صاف کر کے پھر منگواؤں گی۔" خود کلامی کے انداز میں بولتی فریج کھولنے لگی، ہر چیز ابل ابل کر باہر آرہی تھی۔ ملی جلی بو سے ناگواریت محسوس ہو رہی تھی۔

PakiBooks.Site

"صحیح کہتی ہے تحریم! ایک دوسرے کی خوشبو گھس جائے تو کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہتا۔" وہ فریج صاف کرنے لگی۔ دو تین بچے ہوئے باسی سالن، بے تحاشا گوندھا ہوا آٹا، ڈھیروں بچا ہوا سلاد، دودھ کی دیگچی میں بچا ہوا دودھ...... ہر چیز کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

"گرمی میں تو یوں بھی بہت لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے، فریج میں پینے کا پانی ٹھنڈا ہو جائے یہی بہت ہے۔" خود کلامی کے انداز میں کہتی وہ خود سے عہد کر رہی تھی کہ اب میانہ روی اختیار کرے گی، فضول خرچی سے بچے گی، بچت اپنائے گی۔

شام تک گھر کی حالت بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ صاف ستھرا، سادہ سا گھر، کوئی بھی فالتو چیز باہر نہیں بکھری تھی۔ باورچی خانہ تو چمک اٹھا تھا، فریج کا دروازہ کھولنے پر صاف ستھرا ٹھنڈا ٹھنڈا خوشبو دار احساس ہو رہا تھا۔

افطاری کے ٹائم ایک پلیٹ پکوڑے، چھ شامی کباب اور کھجوروں کی افطاری دیکھ کر اسلام نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔

"یہ...... باقی سب کہاں ہے؟"

"باقی...... بس یہ ہی بنایا ہے۔ بس لیموں پانی ٹھنڈا کر کے لا رہی ہوں، اب اتنا ہی بنا کرے گا۔ رزق ضائع کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، جو مل جائے رب کا شکر ادا کر کے قناعت سے وقت گزارنا چاہیے۔" وہ بات کر کے پلٹ گئی، اسلام نے اس کایا پلٹ پر حیرت سے بچوں کی سمت دیکھا تھا۔

"صبح تائی امی آئی تھیں، انہوں نے سمجھایا اور ماما سمجھ گئیں۔ ویسے ماما کی ایک بات اچھی ہے، دیر سے ہی سہی مگر بات سمجھ جاتی ہیں۔ اپنی ضد پر اکڑنے والوں میں سے نہیں ہیں میری ماما!" بیٹی نے کایا پلٹ کی وجہ بتاتے ہوئے تعریف کی، اسلام نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کھانے میں آلو گوشت بنایا ہے، پھلکے تازے تازے بنالوں گی تاکہ روٹی بچے ناں۔ روٹی کی تو ویسے بھی عزت کرنی چاہیے۔" وہ سلیقے سے دوپٹا جمائے دستر خوان پر آبیٹھی۔ اسلام کو بے تحاشا پیار آیا اپنی بیوی پر، اس کی کمائی کا احساس کرتی وہ محبت کا ایک الگ ہی روپ دکھا رہی تھی۔

"تم ہو ہی بہت عقل مند، یہ میں دل سے کہہ رہا ہوں۔" اسلام نے محبت سے کہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ ایک عجیب سا سکون اور خوشی محسوس ہو رہی تھی، برکت کا احساس تھا جو گھر میں بھر گیا تھا۔

☆❁☆

چاند رات متوقع تھی، نادیہ نے سب کے لیے سستا سستا ایک ایک سوٹ بنالیا تھا۔ تحریم کے ساتھ ہی گئی تھی، اماں جی نے اپنی پنشن سے دونوں بہوؤں کو عیدی کا ایک ایک ہزار پہلے ہی دے دیا تھا تاکہ ضرورت کی کوئی چیز بنالیں۔ دونوں نے ایک جیسے بیڈ شیٹ خریدیں، اس مرتبہ نادیہ اپنی سستی اور سادی سی شاپنگ میں بھی بہت مطمئن تھی۔

آخری روزہ تھا، افطاری میں سموسے، فروٹ چاٹ اور پکوڑے بنائے تھے۔ تحریم کی طرف سے بریانی بھی آگئی تھی، اس برکت کے مہینے میں اس کی سوچ کا مثبت ہونا، شکر اور میانہ روی کی عادت کو اپنانا بھی ایک انعام تھا۔ افطاری کے بعد اماں جی آگئیں، اس کے لیے چوڑیاں اور مہندی لے کر آئی تھیں تب ہی اسلام بھی آگئے۔

"بھئی آج تو خوب سیل ہوگئی، پورا رمضان کا مہینہ اکا دکا سوٹ بکتے رہے۔ آج ساری کمائی پوری ہوگئی، خوب منافع ہوا۔ یہ ایک جوڑا تمہارے لیے بھی لایا ہوں، رات کو سلائی کر لینا۔" اسلام نے ایک شاپر نادیہ کی سمت بڑھایا، جوڑے کے ساتھ چوڑیاں بھی تھیں۔ وہ خوشی سے نہال ہوگئی، کچھ دن پہلے جب وہ رب کی ناشکری کر رہی تھی، اس کی دی ہوئی نعمتوں کو ضائع کر رہی تھی تب اسلام کی جیب بھی خالی تھی اور محبت بھی غائب ہو رہی تھی اور اب جب وہ شکر ادا کر رہی تھی۔ رب کی نعمتوں کی قدر کر رہی تھی تو اسلام کی جیب بھی بھر گئی تھی اور محبت کی چمک بھی بڑھنے لگی تھی۔ اسلام اب اماں جی کو ان کا سوٹ دے رہا تھا، نادیہ شکرانے کے نوافل ادا کرنے اندر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں عید کا چاند نظر آنے کا شور اٹھا تھا، وہ سجدہ شکر کے لیے جھک گئی۔ یہ رمضان بہت مہربان تھا۔

☆☆

ناولٹ

تنزیلہ ریاض

چوتھی قسط

غم ہے یا خوشی ہے تو

دوستو پھر یہ ہوا کہ مہارانی جودھابائی اس دن کے بعد سے سارے گھر سے ناراض رہنے لگیں۔ ان کا رویہ ناصرف اپنے بیٹے کے ساتھ بلکہ میرے ساتھ بھی کافی ناروا سا ہوگیا تھا۔ انہیں اپنی شکست قبول نہیں تھی اور ان کے بیٹے کو اپنی خواہش سے دست برداری منظور نہیں تھی۔ دوسری جانب عطیہ اور اس کے شوہر نے کینیڈا جانے کی تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔

کیا بتاؤں لوگو! ان دنوں ہم کتنے دل گیر رہنے لگے تھے۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ عطیہ کے کینیڈا جانے کی اطلاع کی تصدیق ہوگئی یعنی سونیا کی آمد بھی قریب آچلی تھی اور گھر کا ماحول عجیب کشیدہ سا تھا۔ التمش نے ہماری متوقع بہو کو بھی یہ کہانی سارے رموز واوقاف لگا کر سنادی تھی۔ آئیں بس یہاں سے ہی شروع کرتے ہیں۔

☆☆☆

''وہ تم لوگوں کے یہاں ہی رہے گی؟ یعنی تم لوگوں کے گھر میں۔ تم لوگوں کے ساتھ؟'' زرمین نے ناک چڑھا کر پوچھا تھا۔ اس کی آواز میں تلخی تھی اور کسی قدر حیرت بھی۔ جس کی بنا پر لہجہ کچھ کرخت اور آواز بلند ہوگئی تھی۔ کیفے ٹیریا میں بیٹھے چند ایک طلبا نے مڑ کر ان دونوں کی جانب دیکھا۔ التمش نے ناپسندیدگی سے زرمین کو گھورا۔

''نہیں...... ہم اسے آتے ہی ایدھی ہوم میں جمع کروادیں گے اور ماسٹر جی جمعہ کے جمعہ جا کر مل آیا کریں گے اپنی بھانجی سے۔'' اس نے آواز کو مدھم رکھتے ہوئے اسی کے انداز میں جواب دیا۔ زرمین نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور منہ بگاڑ کر بولی۔

''تمہارے خاندان والوں سے یہ ہی امید کی جاسکتی ہے۔ بائی دا وے وہ یہاں آکیوں رہی ہے۔ عجیب خاندان ہے تمہارا، کچھ آؤٹ ڈیٹڈ سا۔ تین مہینے ماموں کے گھر رہتا ہے کوئی آج کل۔ ارے اب تو لوگ نانی نانا کے گھر جا جا کر تین تین مہینے نہیں رہتے اور وہ محراب صاحبہ عرف سونیا بی بی تم لوگوں کے گھر تین [illegible] رہنے کے لیے آرہی ہیں۔'' اسے سخت برا لگ [illegible] تھا۔ التمش نے ایک بار پھر اسے گھور کر دیکھا۔

''ہاں بھائی بہت آؤٹ ڈیٹڈ ہے ہمارا خاندان۔ بہت پرانے زمانے کے لوگ ہیں ہم۔ فرعونوں کے زمانے میں دریائے نیل کے کنارے کپڑے دھونے کا کام کیا کرتے تھے ہمارے بزرگ۔ پتھروں پر گرتے پاجامے اور تہبند چھوا چھو، چھوا چھو کرتے کرتے یہاں کراچی آپہنچے ہم آپ جیسے عالی مرتبت لوگوں میں رہنے کے لیے۔ کیا کریں۔ اب تو ہوگئی غلطی۔'' زرمین کو اتنی مشکل صورت حال میں بھی ہنسی آگئی۔

''تم فیصل آباد میں پیدا ہوئے تھے کیا؟'' وہ چڑانے والے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''جی نہیں۔'' التمش نے منہ بنا کر جواب دیا تھا۔

''کمال ہے بھئی۔ فیصل آباد میں پیدا بھی نہیں

ہوئے۔ آئے گئے بھی کبھی نہیں وہاں۔ کوئی ایسا تعلق بھی نہیں اس شہر سے لیکن جتنیں ساری فیصل آباد والی آنٹی ہیں تمہیں۔" وہ مصنوعی حیرت کو لہجے میں سمو کر کہہ رہی تھی۔ التمش ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگتی آج مجھے۔ مسئلہ ساہیوال کا ہے اور تم یاد فیصل آباد کو کرنے لگی۔ میں کیا بتا رہا ہوں اور تمہیں کیا سمجھ میں آرہا ہے۔ اتنا سنجیدہ مسئلہ بتا رہا ہوں میں تمہیں اور تم ہو کہ میرے خاندان کے بخیے ادھیڑنے لگیں۔" وہ بات کو ادھوری چھوڑتے ہوئے رکا نہیں تھا بلکہ باہر کی جانب چل دیا تھا۔ زرمین نے اتنا ناراض اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

"اوہو۔ تم تو ناراض ہی ہوگئے۔ میں تو بس پوچھ ہی رہی تھی کہ وہ تمہاری پھپھو کی بیٹی کیوں رہنے آرہی ہے تم لوگوں کے گھر؟" زرمین نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔ التمش کافی الجھا ہوا لگتا تھا۔

"اپنے ماموں کے گھر آرہی ہے۔ ماموں جانیں، بھانجی جانیں۔ ہم کون ہوتے ہیں بولنے والے درمیان میں......؟" وہ اسی انداز میں بولا تھا۔

"تو پھر مجھے کیوں بتا رہے ہو یہ بات۔ جب ہم نے درمیان میں بولنا ہی نہیں ہے تو بہتر ہے ہم اس مسئلہ چارفٹ دس سے دور ہی رہیں۔" اب کی بار زرمین کو بھی غصہ آ گیا۔

"تمہیں پہلے سے اس لیے بتا رہا ہوں کہ جب بات بعد میں تم تک پہنچتی ہے تو تم فوت ہونے والی ہو جاتی ہو کہ تمہیں بتایا کیوں نہیں۔ تین چار مہینے رہے گی وہ۔ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہے۔ اس لیے خیر سے ابھی ذہن نشین کرلو۔ روز روز مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کب جائے گی۔ اس کی واپسی میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔ اس نے جانا ہے یا نہیں جانا۔ آخر کب جائے گی وہ۔" التمش کا لہجہ کچھ زیادہ ہی کرخت تھا۔ زرمین نے رک کر ایک لمحہ اسے دیکھا پھر نا چاہتے ہوئے بھی بات کو غیر سنجیدہ رخ دے کر بولی۔

"فوت ہو وہ تمہاری پھپھو کی بیٹی! میں کیوں ہونے لگی فوت۔ میں نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"شادی تو اس کی بھی نہیں ہوئی اور سارا مسئلہ اس شادی کا ہی تو ہے۔ بتاؤ ایک مہارانی جودھا بائی رام نہیں کی جا رہیں ہم سے۔ بڑے بادشاہ بنے پھرتے تھے ہم۔" وہ نصف جملہ بڑبڑا کر بولا تھا۔

مہناز بیگم اتنے دن سے ناراض تھیں اس سے اور یہ ویسی ناراضی نہیں تھی جسے وہ منٹوں میں دور کر دیا کرتا تھا۔ انہوں نے اس کے ہر معاملے سے لاتعلقی اختیار کی ہوئی تھی۔ اب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے کھانا نہیں بناتی تھیں یا اس کے کپڑے استری نہیں ہوتے تھے بلکہ معاملہ اس سے بھی زیادہ بدتر تھا۔ انہوں نے گھر کا وائی فائی روٹر اٹھا کر بند کر کے جانے کہاں رکھ دیا تھا۔ موبائل ڈیٹا پر وہ کتنی فلمیں ڈاؤن لوڈ کر سکتا تھا۔ اسے تو گیمز کھیلنے کی عادت تھی۔ پوری پوری موی بنا ڈاؤن لوڈ کیے یوٹیوب پر دیکھتا رہتا تھا لیکن اب کتنے ہی دن ہو چلے تھے گھر میں یہ ہی عجب صورتحال چل رہی تھی۔ اس کے دریافت کرنے پر نہایت سخت لہجے میں کہہ دیتی تھیں کہ مجھے نہیں پتا۔ وہ اسے کلام بھی نہیں کر رہی تھیں۔ التمش کو ان کی اس ناراضی سے بہت الجھن ہونے لگی تھی کیونکہ پہلے کبھی وہ ایسے نارض ہوئی ہی نہیں تھیں۔

"تمہاری ممی ناراض ہیں تم سے۔" زرمین کو اس کی مدھم سی بڑبڑاہٹ بھی واضح سنائی دے گئی تھی۔ التمش نے رک کر ایک لمحے کے لیے اس کی جانب دیکھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات کا جواب اسے فوراً دے دینا چاہیے یا نہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زرمین کو احساس ہو کہ اس کی امی ابھی تک اسے شرف پسندیدگی نہیں بخش سکیں۔

"میری بات سنو التمش! تم اپنی کزن سے ہی بات کیوں نہیں کرتے کہ وہ تمہاری امی کے سامنے اس رشتے سے انکار کردے۔ سارا مسئلہ سلجھ جائے گا۔ اسے بتاؤ کہ اس کے ایک انکار سے کتنے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔" اس نے اپنی جانب سے مشورہ دیا تھا۔ التمش نے کھا جانے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"تین سو تینتیس مرتبہ اس کے سامنے کہہ کر آیا ہوں کہ...... التمش کہتے ہیں مجھے۔ اپنے نام کا ایک ہی ہوں۔ کسی نواب سے کم نہیں سمجھتا خود کو۔ اب اس کو کس منہ سے کہوں کہ خیر سے میری والدہ محترمہ کے سامنے میری سفارش کر دے۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔ اس کے لیے اب سونیا کی آمد مسئلہ نہیں تھی۔ مسئلہ امی کی ناراضی تھی۔ زرمین چند لمحے ایسے ہی چپ چاپ اپنے ہاتھ کی جانب دیکھتی رہی جس میں پلاٹینم کی انگوٹھی سجی تھی۔ اس نے ابھی تک التمش کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی ماما نے اس انگوٹھی کو دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کیا تھا۔ التمش نے اس کی جانب دیکھا اور پھر اس کی نظروں کی سمت دیکھتے ہوئے اس انگوٹھی کا احاطہ کیا تھا پھر اس نے خود کو ریلیکس کرنے کے لیے ایک لمبی گہری سانس بھری۔

"ویسے التمش! تمہاری کزن بھی انٹرسٹڈ ہے تم میں ورنہ خود ہی انکار کر چکی ہوتی۔" زرمین نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ یہ وہ خدشہ تھا جو اس کی بے حد جان جلاتا تھا۔ التمش نے ناک چڑھا کر انکار میں سر ہلایا۔

"اب اس بات کو سر پر سوار کر لو تم۔ میری کوئی خطا نہیں ہے اس میں۔ مجھ میں تو سارا زمانہ ہی انٹرسٹڈ ہونے لگتا ہے۔" وہ جب ایسے کہتا تھا تو مذاق نہیں کرتا تھا بلکہ اسے یقین تھا کہ ایسا ہی ہے۔ وہ سب کے دل میں بلا اجازت سما جانے کی ہر صلاحیت سے مالا مال ہے۔ زرمین نے منہ بنایا۔ التمش اگر واضح طور پر کہہ دیتا کہ وہ لڑکی مجھے پسند نہیں کرتی تو اسے کچھ سکون ہو جاتا لیکن وہ ایسا کم ہی کہتا تھا۔ اکثر ہی وہ اقرار کر لیتا تھا کہ ہاں بھئی پھپھو کی بیٹی بھی پسند کرتی ہے مجھے۔ کرلو جو کرنا ہے۔

"ویسے تمہارے اس چار فٹ دس انچ میں کوئی سیلف ریسپیکٹ ہی نہیں ہے اور کتنا لیٹ ڈاؤن کروائے گی خود کو۔" وہ تلخ سے لہجے میں بولی تھی۔

التمش نے زچ ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

"زرمین پلیز۔ تم بھول کیوں نہیں جاتی ہو اس کو اور فکر مت کرو میں سنبھال لوں گا یہ معاملہ۔ ابھی تم پلیز فائنلز پر فوکس کرو اور میں؟" وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا۔

"اور تم......؟ تم کس پر فوکس کرو گے؟ پھپھو کی بیٹی پر؟" زرمین نے فوراً پوچھا تھا۔ التمش نے لمبی گہری سانس بھری۔

"شٹ اپ...... اس کے آنے میں ابھی کچھ دن باقی ہیں۔ ابھی تو میں مہارانی جودھا بائی جی پر فوکس کروں گا ورنہ مجھ سے پڑھا بھی نہیں جائے گا۔" زرمین کو یہ بات اچھی نا لگی تھی لیکن وہ چپ رہی تھی۔ ایک ہی بات بار بار پوچھنے کا فائدہ نہیں تھا۔

☆☆☆

"ارے۔ تم سب لوگ کب آئے۔" زرمین ان لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ اس کی کزنز لاؤنج میں منتظر بیٹھی تھیں۔ وہ سب سے ملنے لگی تھی۔

"تم تو یونیورسٹی کو ہی پیاری ہوگئی۔ ملتی ہی نہیں ہو۔ ہم نے سوچا آج ذرا دھاوا بول کر آئیں۔" نازش نے کہا۔ وہ اس کے تایا ابو کی بیٹی تھی۔ خاندان کی سب سے طرح دار لڑکی۔ گزشتہ سال اس کی شادی ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اب تک کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی یعنی وہ اب تک نئی نویلی دلہن

بہنوں کیلئے خوبصورت ناول
یہ گلیاں یہ چوبارے
فائزہ افتخار
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37, اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

PakiBooks.Site

تھی۔ اس کے ساتھ صحیح ٹھنی رہتی تھی زرمین کی۔ چچا کی دونوں لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ وہ سب ایک دوسرے سے بے تکلف تو تھیں لیکن دل ہی دل میں مقابلہ بازی بھی خوب چلتی تھی۔ ہر معاملے میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی مہم ہمیشہ ہی عروج پر رہتی تھی۔

''کہاں کا ارادہ ہے؟'' سوال کرنے کے ساتھ زرمین نے کن انکھیوں سے سب کا جائزہ لیا۔ نازش نے ماریہ بی کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ فلورل پرنٹ والا ٹراؤزر شرٹ اس پر بے حد جچ رہا تھا۔ زرمین نے کن انکھیوں سے چچا کی بیٹیوں کی شرٹس کا بھی جائزہ لیا تھا۔ ایک لان کے سوٹ میں ہی تھیں دوسری نے جینز کے ساتھ ٹاپ پہن رکھا تھا۔ عاصم جوفا۔ عبیرہ۔ لیوس اریبہ...... وہ حتمی نتیجے پر پہنچی تھی۔ اپنے بدن پر سجا کھاڈی کا کرتا فی الحال بڑا ہی بے کار لگنے لگا تھا۔

''روشانے کی انگیج مینٹ ہے نیکسٹ سنڈے۔ ہم شاپنگ کے لیے نکلے۔ سوچا تم سے بھی پوچھ لیں۔ چلو گی؟'' اریبہ نے کہا تھا۔ زرمین نے ذرا حیرت کا اظہار کیا۔

''واقعی...... کس سے ہو رہی ہے۔ پتا ہی نہیں چلا مجھے تو اس خبر کا۔'' اس نے جھوٹ کہا تھا۔ اسے اس بات کا کافی پہلے سے پتا تھا۔ روشانے ان لوگوں کی ہی کزن تھی۔ اس نے کچھ عرصہ ماڈلنگ بھی کی تھی۔ کسی سیاست دان کے بیٹے سے افیئر تھا اس کا اور آخری اطلاع کے مطابق اسی سے شادی کا بھی ارادہ تھا۔

''وہی معتصم مرزا سے ہو رہی ہے۔ منا لیا اس لڑکے نے اپنے باوا کو۔ لاٹری نکل آئی روشانے کی۔'' نازش نے اتنا ہی کہا تھا کہ زرمین نے اس کی بات کاٹ دی۔

''خاک لاٹری۔ اسے لاٹری کہتے ہیں۔ اتنا بے ہنگم سا لڑکا ہے، نا منہ نا متھا۔ اوپر سے رنگ بھی کالا سیاہ۔ ذرا نہیں جچتا روشانے کے ساتھ کھڑا ہوا۔ کیسے دیکھے گی ساری زندگی اسے۔ ہم سے تو دس منٹ نہیں دیکھا جاتا۔'' وہ ناک چڑھا کر بول رہی تھی۔ اریبہ اور عبیرہ دونوں نے قہقہہ لگایا۔ نازش کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیلی۔

''شکل کون دیکھتا ہے مرد کی۔ مرد کا تو بزنس دیکھا جاتا ہے اور معتصم مرزا کا بزنس ملائیشیا، سری لنکا تک پھیلا ہوا ہے۔ اربوں میں کھیلتا ہے لڑکا۔ روشانے اور آنٹی روبی نے اچھا شکار کیا ہے۔ پتا ہے کتنا امیر ہے وہ۔ سارے خاندان میں اتنا تگڑا داماد کسی کو نہیں ملا ہو گا جتنا آنٹی روبی کو مل رہا ہے۔ ابھی روشی کی برتھ ڈے پر تفنی کی ڈائمنڈ رنگ دی ہے اس نے۔'' زرمین نے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کیا جس کی تیسری انگلی میں وہ انگوٹھی سجی تھی جو اسے اتمش نے دی تھی۔

''رہنے بھی دو نازش! اب پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ روشانے شادی کر رہی ہے۔ کوئی افیئر نہیں چلا رہی کہ دو تین مہینے بعد خدا حافظ کہہ کر ہیں اور چل دے گی۔ ساری زندگی جس کے ساتھ رہنا ہو۔ اس کی شکل پہلے دیکھنی چاہیے۔ یہ روپیہ پیسا تو آج کل سب کے پاس ہی ہوتا ہے۔'' زرمین نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''یہ باتیں تب بھول جائیں گی تمہیں، جب تمہاری باری آئے گی۔ روپیہ ہی سب سے بڑی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مرد کی شکل سے گھر نہیں چلتے۔ لڑکا فواد خان ہی کیوں نا ہو۔ کنگلا ہو تو برداشت نہیں ہو سکتا۔'' نازش کی اپنی مستحکم رائے تھی۔ زرمین نے پھر کندھے اچکائے جیسے ذرا بھی متفق نا ہو۔

''روشانے کو چھوڑیں نازش باجی! زرمین کو طوبیٰ کا بتائیں۔ یہ تو سب سے بڑی دھما کا خیز خبر ہے۔ مائنڈ بلوئنگ!'' اریبہ نے مزا لیتے ہوئے کہا تھا۔ نازش نے بھی گردن ہلائی جیسے بہت مزا آیا ہو۔

''اوہ یار زرمین! طوبیٰ کی بھی بات پکی ہو گئی ہے۔ جلد ہی لڈو آنے والے ہیں اس کے بھی۔ تیاری پکڑ لو ایک اور فنکشن کی۔''

زرمین نے بھی موضوع بدلنے پر دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا۔ جانے کیوں یہ روپے پیسے کی بحث اس کے اعصاب کے لیے بہت بھاری ثابت ہونے لگی تھی۔

''طوبیٰ نے تائیوں کا لڑکا پسند کیا ہے؟'' نازش بے لیے جیسے اگلا تھا۔ اس سے پہلے کہ زرمین کوئی دلچسپی ظاہر کرتی۔ تہمینہ بیگم بریزے کا ملکے سے سبز رنگ کا بے حد عمدہ سلا ہوا سوٹ پہنے، دمکتی مہکتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔ انہیں اچھا پہننے اوڑھنے کا شروع سے بے حد شوق تھا۔ زرمین نے بھی یہ سلیقہ ان ہی سے لیا تھا۔

''ہاں! ہماری بھابھی صاحبہ کے کام دیکھ لو۔ تائیوں کا لڑکا ڈھونڈا ہے بیٹی کے لیے۔ ہے کوئی بات کرنے والی۔ اب یہی کسر رہ گئی تھی اس خاندان میں۔ جا کر تائیوں کا لڑکا پسند کر لیا۔'' انہوں نے اپنی رائے کا بھرپور اظہار کیا۔

''مجھے بھی ماما نے بتایا۔ سیلون ہیں اس کے سسر کے۔ ایک طارق روڈ پر ہے۔ ایک وہاں کہیں صدر میں ہے شاید......'' نازش تضحیک آمیز انداز میں ہنسی۔

''واقعی؟'' زرمین کو حیرت ہوئی۔ ان کے یہاں اس قسم کی باتوں کی بہت اہمیت تھی۔ ان کے دادا پردادا پاکستان بننے سے پہلے کسی گاؤں میں کمشنر رہے تھے۔ انگریزوں کے اچھے وفادار تھے سو زمین جائیداد کا خوب حصہ میں آئی تھیں اور سارے خاندان کو مفت میں ملازمتیں بھی ملتی رہی تھیں بعد میں ان ہی چیزوں کے کلیم کے سہارے پاکستان میں اچھے اثاثے بنا لیے تھے۔ سارا خاندان بس اب تک اتراتا پھرتا تھا۔

''یخ...... کیسے رہے گی وہ۔ نائی تو سنا ہے ہوتے بھی بہت گندے ہیں۔ صفائی ستھرائی کے زیادہ قائل نہیں ہوتے۔'' زرمین کو بھی بہت برا لگ رہا تھا۔

''ظاہر ہے۔ ہر وقت تو لوگوں کے بال مونچھیں صاف کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اپنی صفائی کے لیے وقت ہی کہاں بچتا ہو گا۔'' تہمینہ بیگم مغرور سے انداز میں بولیں۔

''یخ...... یخ...... چاچی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ مجھے تو سوچ کر ہی الٹی آتی ہے کہ کیسے رہے گی طوبیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ۔ ہم سے تو نہیں رہا جاتا۔ توبہ!'' نازش سابقہ انداز میں بولی تھی۔

''ہاں تو ہم ذات کے کمی کمین ہیں بھی نہیں۔ یہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
ہم سفر	فرحت اشتیاق	400/-
بن روئے آنسو	فرحت اشتیاق	250/-
متاع جان ہے تو	فرحت اشتیاق	500/-
دل داریں	ثمرہ بخاری	350/-
ہستی کا آہنگ	ثمرہ بخاری	300/-
وہ پگلی سی دیوانی سی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
آرزو گھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	200/-
لا حاصل	عمیرہ احمد	180/-
امر بیل	عمیرہ احمد	450/-
اک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	300/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	120/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	300/-
موسم تھا بے قرار	فریدہ اشفاق	300/-
دل اسے ڈھونڈ لایا ہے	آسیہ رزاقی	300/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
میرے اس کے بیچ سفر	زہرہ ممتاز	180/-
پھولوں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	180/-
میری جنت	نور بانو محبوب	250/-
بھنور	شوکت رانا الطاف	150/-
اے وقت گواہی دے	راحت جبیں	350/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	300/-
رنگ، خوشبو، ہوا، بادل	افشاں آفریدی	400/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	400/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	300/-
میرے خواب لوٹا دو	نگہت عبداللہ	400/-

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ -/30 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32216361

کمہار، دھوبی، درزی...... ہمارے مقام کو چھو بھی نہیں سکتے۔ ان کے گھروں کے حالات، طور طریقے ہماری بچیاں نہیں برداشت کرسکتیں۔ تم صحیح کہہ رہی ہو۔ الٹی تو آئے گی ہی سوچ کر۔ جانے کیسے کھاتے پکاتے ہیں یہ لوگ لیکن خیر تمہاری مامی کو کون سمجھائے بھائی۔ ان کی تو اپنی ہی منطق ہے۔ فرماتی ہیں، سب ایک برابر ہوتے ہیں۔ اللہ نے سب کو ایک جیسا بنایا ہے۔ بھلا بتاؤ سب ایک جیسا ہوتا ہے تو انار سرخ کیوں ہے اور امرود پیلا پھٹک۔ ایک پھلوں کا سردار۔ سر پر تاج لے کر پیدا ہوتا ہے اور دوسرا طوطے چڑیوں کا کھاجا۔ زرہ زرہ ٹوٹکنے کی چیز۔ نا بھئی ہم نہیں مانتے اس بات کو۔ دھوبی درزی نائی۔ یہ ہم جیسوں کے برابر نہیں ہوسکتے۔'' وہ نہایت حقارت سے بولی تھیں اور ان کے قریب بیٹھی چاروں لڑکیوں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''شکل صورت روپیہ پیسا سب ایک طرف لیکن ذات برادری سے ہٹ کر نہیں چلا جاتا ہم سے۔'' انہوں نے دوبارہ کہا تھا اور اب بھی چاروں لڑکیوں نے ناک چڑھاتے ہوئے ان کا ساتھ دیا تھا۔

''چلیں طوبیٰ کی شادی سے ایک فائدہ ہوگا۔ سارے خاندان کے مرد گھر میں ہی حجامت بنوالیا کریں گے اور شیو کروانے کے لیے سب اپنے اپنے ڈرائنگ روم میں میز سجالیا کریں گے۔'' زرمین نے کہا تھا۔ وہ سب مل کر ہنسی تھیں۔

''اور کیا پتا اب یہ روایت ہی چل پڑے۔ کل کلاں کو تم لوگوں میں سے کوئی کسی درزی دھوبی کے لڑکے کو پسند کرلے۔ ہمارے تو دن پھر جائیں گے۔ کپڑے گھر میں ہی سل بھی جایا کریں گے، دھل بھی جایا کریں گے۔'' نازش ان تینوں لڑکیوں کو چڑا رہی تھی کہ وہ تینوں ہی ابھی فارغ تھیں۔

''ہنہ...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کسی ایسے ویسے لڑکے سے شادی کرنے کا۔'' زرمین نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔

''دفع...... کسی درزی دھوبی کو بیٹی نہیں دوں گی میں۔ ایسی سستی بھی نہیں ہے میری اولاد۔'' بیگم تہمینہ نے بھی نخوت سے کہا تھا۔

☆☆☆

''آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے ممانی جان! امی صحیح کہتی ہیں آپ بہت سلیقہ مند ہیں ماشاء اللہ۔'' سونیا نے ان کا کچن دیکھتے ہوئے دل کھول کر تعریف کی تھی۔

مہناز بیگم نے اس کی بات پر زیادہ یقین نہیں کیا تھا۔ وہ چند گھنٹے پہلے ہی پہنچی تھی۔ ماسٹر جی اسے ائر پورٹ سے لائے تھے اور اب وہ ان کے ساتھ کچن میں کھڑی سلاد بنا رہی تھی۔ مہناز بیگم کو اس کی ان ہی عادات سے عشق تھا۔

''مجھے اب اتنا بھی مت چڑھاؤ۔ تمہاری امی کا اور اب تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتی میں۔ تمہارے گھر سے زیادہ خوب صورت نہیں ہے میرا گھر۔ تم نے تو جانے کیا کیا سجا رکھا ہے۔ مجھ بوڑھی سے تو اب نہیں ہوتا اتنا۔ میں تو ساہیوال سے واپس آکر وہ آئینہ بنانے کی کوشش کرتی رہی جو تم نے صحن میں لگا رکھا تھا۔ بہت خوب صورت لگا تھا مجھے۔'' وہ واقعی بہت دل سے کہہ رہی تھیں۔ سونیا نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔

''کون سا آئینہ؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔ اس نے تو گھر میں جگہ جگہ آئینے سجا رکھے تھے۔

''وہ جو صحن میں دیوار کے بیچوں بیچ لگایا ہوا ہے جس کے گرد سبز اور سرخ پھول سے ہیں۔'' وہ اسے یاد کروانے لگی تھیں۔

''ارے وہ والا۔'' سونیا کو یاد آگیا۔

''وہ آئینہ نہیں ہے ممانی جان! وہ تو پرانی سی ڈیز کو جوڑ جوڑ کر بنایا تھا اور اس کے گرد جو پھول ہیں نا وہ تو خالی جوس اور پانی کی بوتلوں کے ڈھکن کو رنگ کر کے لگایا ہوا تھا میں نے۔'' اس نے ہنستے ہوئے وضاحت کی۔ مہناز بیگم حیران ہوئی تھیں۔

''واقعی؟ مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا ہے۔ میں تو سمجھی آئینہ ہے۔ بہت اچھا لگا تھا مجھے۔'' وہ بولی تھیں۔

''میں بنادوں گی آپ کو۔ بہت آسان ہے اسے بنانا۔ وہ ہمارے والا تو میری اسٹوڈنٹس نے بنایا تھا۔ میں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں اسکول کی بچیوں کے لیے آرٹ اینڈ کرافٹ کا سمر کیمپ کیا تھا۔ ان کو سکھایا تھا تو انہوں نے بنا کر مجھے گفٹ کیا تھا۔ آپ کے لیے میں خود بنادوں گی۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ مہناز نے سر ہلایا۔

''بس اب تم رہوگی نا۔ بہت کچھ سیکھوں گی تم سے۔'' سونیا مسکرائی۔

''آپ تو مجھے شرمندہ کررہی ہیں۔ میں یہاں آپ سے سیکھنے آئی ہوں۔ امی نے بالخصوص آپ کے چپلی کباب کا ذکر کیا تھا۔ وہ سیکھنے ہیں مجھے اور پھر وہ جو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ لیپلک سکھائیں گی۔ وہ تو لازمی سکھایے گا مجھے۔'' اس نے کہا تھا۔

اسی دوران التمش نے کچن کے اندر قدم رکھا تھا۔ یہ اس کا اور سونیا کا پہلا سامنا تھا۔ مہناز بیگم نے پلاؤ کے دیگچے میں نیچے تک چمچہ پھیرتے ہوئے بنا پیچھے دیکھے کہا تھا۔

''تم فکر ہی نا کرو۔ سب کچھ سیکھیں سکھائیں گے۔ بس تم کمفرٹیبل ہوجاؤ۔ یہ سوچو یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ میں چاہتی ہوں تم جتنا عرصہ بھی یہاں رہو۔ اس کو اپنا گھر سمجھو اور مجھے اپنی امی کی طرح ہی سمجھو۔''

''اور مجھے اپنا بھائی! جب میری امی تمہاری امی ہو جائیں گی تو میں تمہارا بھائی ہی لگوں گا نا۔'' التمش نے ٹکڑا جوڑا تھا۔ مہناز بیگم کے چہرے کے تاثرات یکدم ہی سخت ہوگئے تھے۔ انہوں نے التمش کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

''نہیں بھئی، مجھے کسی کو بھائی وائی بنانے کا شوق نہیں ہے۔ تم میرے کزن ہی ٹھیک ہو۔'' سونیا نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔ التمش نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بھی کہنا بھی چاہتا تھا لیکن چونکہ اس کی امی پہلے ہی سے ناراض تھیں سو فی الحال وہ کوئی نئی محاذ آرائی نہیں لے سکتا تھا۔

''کیسے ہو التمش؟'' سونیا نے خود ہی اسے مخاطب کیا تھا جیسے ان کے درمیان کافی بے تکلفی ہو حالانکہ التمش کو اس رویے کی توقع نا تھی۔

''لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ بہت ہینڈسم ہیں ہم۔ تم بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ پلٹا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ چہرے پر عام سی مسکراہٹ تھی۔ اسے ہمہ وقت اپنی مدح سرائی کی عادت تھی۔ سونیا سلاد بنا چکی تھی۔ اس نے پلیٹ کو کلنگ فلم سے ڈھکا ہوا تھا۔ پلیٹ کو ایک سائڈ میں رکھتے ہوئے اس نے التمش کو اوپر سے نیچے تک دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ چیلنج ہے؟ تو چیلنج قبول ہے۔ بظاہر وہ بھی مسکرائی تھی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ لوگ درست کہتے ہیں۔ تم بہت ہینڈسم ہو۔'' اس نے اعتراف کیا تھا۔ التمش اس کے اس قدر بے تکلف انداز پر کچھ حیران تو ہوا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا بلکہ سر جھکا کر سینے پر ہاتھ رکھ شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ مہناز بیگم پھر بھی کچھ نہیں بولیں لیکن ان کی توجہ دونوں بچوں پر ہی تھیں۔

دل ہی دل میں انہوں نے پھر دعا کی تھی کہ......

''یااللہ میرے دل کی مراد بر آئے تو سکون آئے۔''

☆☆☆

''ایک کپ چائے بنادیں مجھے۔'' التمش کو چائے کی بالکل طلب نہیں تھی لیکن یہ صرف امی کو مخاطب کرنے کا بہانہ تھا۔ وہ قہوہ بنا رہی تھیں۔ اس کی جانب مڑ کر بھی نا دیکھا بلکہ چپ چاپ اپنا کام کرتی رہیں۔

''امی بس بھی کریں اب۔ کتنے دن ہوگئے ہیں اسی طرح ناراض ناراض رہتی ہیں آپ۔ میں نے ایسا بھی کیا کردیا ہے۔ ایک رنگ ہی تو دی ہے اسے۔ بیاہ کر گھر تو نہیں لے آیا نا۔'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی ناراض سے لہجے میں بولا تھا۔ مہناز بیگم اس کی جانب مڑیں اور غرا کر بولیں۔

''ایک دن یہ بھی کر ہی لوگے تم۔ جب ماں باپ کی مرضی کے بنا آدھا مرحلہ سَر کرسکتے ہو تو باقی آدھا کرتے ہوئے کون سا لحاظ آئے گا تمہیں۔ بیاہ کر گھر تو نہیں لے آیا نا۔ او وہ لے آؤ میاں! یہ حسرت

بھی کرلو پوری۔" ان کا چہرہ بالکل سرخ ہو چکا تھا۔

"امی......!" التمش نے بس اتنا ہی کہا پھر بمشکل اپنے لہجے کو معتدل کر کے بولا۔

"ایسا کیا کر دیا ہے میں نے کہ آپ ناراض ہی ہو گئی ہیں۔ پسند کی شادی گناہ تو نہیں ہے ناں۔" وہ لاچار سے لہجے میں بولا تھا۔ ان کو منانے کی ہر کوشش اب تک ناکام ہی ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر مڑیں اور پھر کھا جانے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"یہ ہی تو کہہ رہی ہوں میں بھی کب سے، کہ پسند کی شادی گناہ نہیں ہے۔ تب ہی تو "پسند" سے کر رہی ہوں یہ شادی۔" انہوں نے لفظ "پسند" پر سارا زور لگایا تھا۔

"میں اپنی شادی کی بات کر رہا ہوں امی!" التمش نے اپنا موقف دہرایا تھا۔

"اور میں اپنی پسند کی۔" وہ اسے گھور کر بولیں پھر مزید کہنے لگیں۔

"یعنی شادی تمہاری اور پسند میری۔" وہ بھی اس کی ماں ہی تھیں۔ وہ زچ سا ہو کر چپ ہو گیا۔ انہوں نے قہوے والے کپ اٹھائے اور ناک چڑھاتے ہوئے اس کے قریب سے گزر کر اندر کی جانب چل دیں۔

"آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ واقعی مہارانی سمجھنے لگی ہیں خود کو۔ مت بنائیں چائے میرے لیے۔" وہ سخت کبیدہ خاطر ہو کر اپنے کمرے کی جانب چل دیا تھا۔

☆☆☆

"خیال رکھیے گا، بچی ہے اب گھر میں۔ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔" ماسٹر جی نے مہناز بیگم سے کہا تھا۔ کھانے کے بعد جب سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے تو وہ دونوں الائچی والا قہوہ پی رہے تھے۔ مہناز بیگم نے ناک چڑھا کر ان کی بات کو سنا۔ ان کا مزاج التمش سے ہونے والی بحث کی وجہ سے کچھ خراب تھا جبکہ ماسٹر جی کو اس کی خبر نہیں تھی۔

"اتنی سمجھ تو مجھے بھی ہے ماسٹر جی! میں چھوٹی نہیں ہوں۔ مجھے پتا ہے مجھے کیسے سنبھالنا ہے آپ نے دیکھا نہیں التمش کے نخروں کے باوجود نے اسے اوپر کی منزل پر شفٹ کر دیا ہے۔ سونیا ہمارے ساتھ نیچے رہے گی۔ وہ اوپر کے کمرے رہے گا۔ التمش جاب تلاش کر رہا ہے۔ سارا دن ہی سے باہر ہوتا ہے تقریباً اور سونیا کا بھی ارادہ کوئی شار کورس کرنے کا ہے۔ چند دن میں اس کی اپنی مصروفی شروع ہو جائے گی۔ آپ خواہ مخواہ الٹا سید سوچیں۔" وہ وضاحت کر رہی تھیں۔

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں یہ چاہ رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان صورت حا بہت عجیب ہے۔ سخت ناپسند کرتے ہیں دونوں ایک دوسرے کو بلکہ اگر آپ غلط فہمی کی عینک اتار کر دیکھیں تو نفرت کرتے ہیں دونوں ایک دوسرے سے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں جب اتنی مقابلے باز کی فضا پیدا ہو چکی ہو تو غلطی کا امکان بے حد ہے۔ بات کہیں بگڑ نا جائے۔" ماسٹر جی تک ہی کہا تھا کہ مہناز بیگم نے سختی سے ان کی بات کی تردید کر دی۔

"ارے، خواہ مخواہ نفرت کرتے ہیں ایک دوسرے سے۔ نفرت کیوں کریں گے۔ ہاں انسیت نہیں ہے کوئی ان دونوں کے درمیان لیکن وقت کے ساتھ ہو جائے گی۔ جب کہیں باہر رشتہ کرتے ہیں بچوں کا تو بھی تو انسیت اور لگاؤ پیدا ہوتے وقت لگ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ ہی مائل ہوتے ہیں بچے ایک دوسرے کی طرف۔ آپ خواہ مخواہ میرا دل دہلائے دیتے ہیں عجیب و غریب باتیں کر کے۔ ناپسند کرتے ہیں۔ نفرت کرتے ہیں۔ بات نا بگڑ جائے۔" ماسٹر جی نے بیگم کے انداز کو بغور دیکھا۔ کچھ عرصے سے وہ اس ذکر پر کچھ زیادہ ہی مشتعل ہونے لگی تھیں۔

"آپ اتنا خفا کیوں ہو رہی ہیں۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ سے ہو گئے جیسے انہیں بے حد برا ل

PakiBooks.Site

ماسٹر جی بہت ہی کم انہیں اس انداز میں ٹوکتے لیکن جب ٹوکتے تھے تو مہناز بیگم کو سمجھ میں آ جاتا کہ ان سے غلطی ہوئی ہے۔ وہ شرمندہ سی ہو گئیں۔

"ماسٹر جی! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ آپ میرا دل اس طرح نا جلایا کریں۔ اتنا بھی کیا گناہ کر دیا میں نے جو اپنے بیٹے کا رشتہ اپنی مرضی سے کر دیا۔ آپ اور التمش اب کیا اس بات کے لیے مار ہی ڈالیں گے مجھے۔ آپ کے طنز ختم نہیں ہوتے اور آپ کے بیٹے کی غلطیاں۔" وہ ایک لمحے کے لیے چپ سی ہوئیں پھر مزید سخت لہجے میں بولیں۔

"میں نے اگر عطیہ سے بات نا کی ہوتی تو میں سب آرام سے سنبھال سکتی تھی لیکن اب میں رشتہ دے چکی ہوں اور اگرچہ زبان سے پھرنا میری روایت نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر آپ باپ بیٹا راضی نہیں ہیں تو میں عطیہ کے واپس آنے کے بعد معاملہ سنبھال لوں گی۔ بتا دوں گی اسے کہ اس کے بھائی کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے تب تک براہ مہربانی اس معاملے کو بگاڑیں مت۔ سب جیسا چل رہا ہے ویسا چل نے دیں۔" ماسٹر جی کو ان کی بات سن کر پتنگے سے لگ گئے۔

"ارے میرا نام کیوں لیں گی میری بہن کے سامنے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے اس رشتے پر۔ عطیہ کو سچ بتائیں نا کہ آپ کا ہونہار سپوت ہی معترض ہے اس رشتے پر۔" ماسٹر جی نے سخت برا مان کر کہا تھا۔

"وہ معترض نہیں ہے۔ اس احمق کو خود ہی اپنے جذبات کی خبر نہیں ہے۔ کمینہ چند دن کسی لڑکی سے فون پر باتیں کر لینے سے سمجھتا ہے کہ اسے ہی محبت کہتے ہیں۔" وہ چبا چبا کر بول رہی تھیں۔

"اچھا تو اور کسے کہتے ہیں محبت۔ بی بی یہ ہی ہے محبت۔ کمٹمنٹ کر لی ہے آپ کے بیٹے نے اس بچی سے اور کس طرح ثابت کرے وہ آپ پر کہ وہ محبت کرتا ہے اس بچی سے۔" ماسٹر جی زچ ہو کر بولے تھے۔

"ہائے ہائے اس کمبخت کو محبت کی کیا سمجھ۔ الو کا پٹھا ہے وہ اور اس کو بگاڑنے میں سب سے زیادہ اہم کردار آپ نے ادا کیا ہے۔ کتنی منتیں کی تھیں میں نے آپ کی کہ اس معاملے میں میرا ساتھ دیں لیکن نہیں بھئی۔ آپ کیوں میرا ساتھ دیں گے۔ آپ کو تو بیٹے کی محبت میں دوسری کوئی بات سوجھتی ہی نہیں ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بولی تھیں۔ ماسٹر جی چند لمحے ان کی جانب دیکھتے رہے

"اب میرا چہرہ کیوں دیکھتے چلے جا رہے ہیں۔ غلط تو نہیں کہہ رہی میں۔" مہناز بیگم ناک چڑھا کر بولیں۔ اب کی بار ماسٹر جی بھی برہم ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی ان کے درمیان اس طرح بحث ہوئی بھی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا قہوے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر دھپ دھپ کرتے باہر چل دیے۔

☆☆☆

"ایک کپ چائے بنا دیں مجھے۔" اس نے بہت مان سے کہا تھا لیکن ممانی جان کا انداز کافی تلخ تھا۔ وہ اس سے کافی ناراض سی لگتی تھیں۔ سونیا نے زیادہ باتیں نہیں سنی تھیں لیکن اپنے لیے پانی کا گلاس لینے اٹھی تھی تو ماں بیٹے کی بحث نے دروازے پر ہی رک جانے پر مجبور کر دیا تھا اور جتنا بھی وہ سمجھ پائی تھی اس سے اسے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ ان دونوں ماں بیٹے کے درمیان بحث کی نوعیت مختلف تھی لیکن مسئلہ وہی تھا جو اس کے اور اس کی امی کے درمیان باعثِ تنازعہ بنا رہتا تھا...... رشتہ۔

"ہمم......" اس نے ہنکارا بھرا اور سرہانے سے ٹیک لگا لی۔

"تو اس کا مطلب صرف ہم ہی نہیں جانتے ممانی جان بھی جانتی ہیں کہ التمش کی زندگی میں کوئی لڑکی ہے۔" اپنے بستر پر بیٹھے دیوار کی جانب تکتے ہوئے وہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

"اگر جانتی ہیں تو انہوں نے میری امی کو یہ بات کیوں نہیں بتائی اور کیا پتا بتائی ہی ہو لیکن امی نے مجھ سے چھپائی ہو۔ انہیں تو بھتیجے کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آتا۔" سونیا نے گہری سانس بھری۔ یہ سب

باتیں وہ پہلے سے ہی سوچ چکی تھی۔ اسے اب اس بات سے تکلیف بھی نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس کا ذہن کسی منطقی فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

"ایک بات تو طے ہے کہ بزرگ سارے ہی ایک پیج پر ہیں۔ چلو یہ بھی اچھا ہے اب وقت آ گیا ہے کہ مجھے اور التمش کو بھی ایک پیج پر آجانا چاہیے۔" اس نے خود سے کہا تھا۔ چند لمحے وہ ایسے ہی بستر پر ٹانگیں چڑھائے بیٹھی رہی۔ چہرے پر سوچوں کا جال تھا پھر اس نے قدم نیچے اتارے تھے۔ ہونٹ بھینچے ہوئے گہری سانس بھری جیسے ہمت مجتمع کر رہی ہو پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور جوتے پہنے تھے۔

"اس مسئلے کا یہی حل ہے میڈم سونیا!" اس نے جیسے خود سے کہا تھا پھر وہ باہر آ گئی۔ کچن میں جا کر چائے کا پانی رکھا۔ اندازے سے پتی چینی ڈالی۔ ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے اور ابھی پانی اُبلا بھی نا تھا کہ ممانی جان اپنے خالی کپ لیے کچن میں آ گئیں۔

"ارے تمہیں رات کو چائے پینے کی عادت ہے؟ مجھے پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔ تم مجھے بتا دیتی۔ میں ساتھ ہی بنا لیتی۔" وہ بولی تھیں۔ اس نے ان کے ہاتھ سے خالی کپ پکڑے اور سنک میں رکھ کر دھوتے ہوئے بولی۔

"عادت تو نہیں ہے لیکن بس ذرا سر میں درد ہو رہا تھا تو سوچا چائے پی لوں...... میں پی لوں۔" اس نے ان سے اجازت لی تھی۔ وہ چولہے کے قریب ہوئیں اور ساس پین کے اندر دیکھا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ارے ہاں ہاں بیٹی! اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے، تمہارا اپنا گھر ہے۔ جس چیز کا دل چاہے جب چاہے خود ہی لے لینا۔ تکلف کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔" وہ اسے محبت سے کہہ رہی تھیں۔ سونیا کچھ نہیں بولی۔

"میں اس میں پتی زیادہ کر دوں؟ میرے نکمے بیٹے کے لیے بھی چائے بن جائے گی۔ اسے بھی ایک کپ دے دینا۔" وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"جی جی ضرور، میں بنا لیتی ہوں التمش کے لیے بھی۔" اس نے کہا تھا۔ ممانی جان نے پتی کی مقدار بڑھائی اور پھر دودھ بھی ڈال دیا۔ سونیا چند لمحے انتظار کرتی رہی کہ وہ کچھ بولیں لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ چائے بننے کی منتظر ہیں تو اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"آپ نماز پڑھ لیں یا کوئی بھی کام کرنا ہے تو کر لیں۔ میں التمش کو چائے دے دوں گی۔" اس کے لہجے میں کچھ جھجک تھی۔ انہیں یہ بات بُری بھی لگ سکتی تھی۔ ممانی جان نے بھی ایک لمحے کا توقف کیا پھر انہیں یہ مناسب بات لگی تو بولیں۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ تم دے دینا اسے چائے۔ وہاں برآمدے میں بیٹھا ہوگا اس وقت۔ لائٹ جانے والی ہے نا۔ گھنٹہ بعد جب لائٹ آئے گی تو ہی کمرے میں جائے گا۔" سونیا سر ہلاتے ہوئے چائے کپوں میں انڈیلنے لگی تھی۔

☆☆☆

"چائے......" اس نے کپ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ لائٹ جا چکی تھی۔ التمش صحن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے کچن کے دروازے کے باہر بنی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ اسے سونیا کے ہاتھ میں چائے کا کپ دیکھ کر حیرانی ہوئی۔

"میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی تو ممانی جان نے کہا تمہارے لیے بھی بنا لوں۔" سونیا نے وضاحت کی اور اس کے قریب ہی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ التمش نے چائے کا کپ ابھی بھی نہیں پکڑا تھا۔ سونیا نے ٹرے اس کے قریب ہی رکھ دی۔ اس میں چائے کے دو کپ تھے۔

"بہت مہربانی۔ آپ کی اور آپ کی ممانی جان کی بھی۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا تھا۔

"تم ہر وقت اتنے جلے بھنے کیوں رہتے ہو۔ جب دیکھو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہو، کیوں۔" وہ عام سے انداز میں بولی تھی۔ التمش نے اسے گھور کر دیکھا۔

PakiBooks.Site

آج تک تم آئی ہو۔ چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزارے ہمارے گھر میں مگر سیلوٹ ہے تمہاری ریسرچ کو۔ اتنی جلدی میرے بارے میں اتنا کچھ پتا چل گیا۔" وہ پھر پور طنزیہ انداز میں بولا تھا۔ سونیا مسکرائی مگر بولی کچھ نہیں بلکہ اپنے چائے کے کپ کو بائیں ہاتھ سے اٹھا کر دائیں ہاتھ میں لیتے ہوئے عام سے انداز میں پوچھنے لگی۔

"تمہاری یونیورسٹی کیسی چل رہی ہے؟" التمش کو امید نہیں تھی کہ وہ اس کے اتنے برے سلوک کے باوجود اس کے پاس بیٹھ جائے گی۔

"اچھی چل رہی ہے۔ سی این جی پر ہے نا۔ پیٹرول پر ہوتی تو مسئلہ ہوتا۔ اب تو سب خیر ہے۔" اس نے بھی اپنا کپ اٹھاتے ہوئے انداز کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"شکر ہے تمہارے منہ سے کوئی خیر کا کلمہ بھی سننے کو ملا۔" سونیا نے کہا تھا۔ التمش نے کچھ نہیں کہا تھا۔ چند لمحے ایسے ہی خاموشی میں گزر گئے۔

"چائے اچھی ہے نا؟" سونیا نے پھر اسے مخاطب کیا تھا۔ التمش کو چائے کی طلب اس قدر محسوس ہو رہی تھی کہ چائے اچھی نا بھی ہوتی تو بھی وہ ایک دم سے اس کی برائی نہیں کر سکتا تھا۔

"ظاہر ہے۔ آپ کے ہاتھوں سے جو تخلیق ہوئی ہے۔ اچھی ہی ہونی تھی بقول میری امی کے۔ سونیا کے ہاتھ میں اتنا ذائقہ ہے کہ پانی میں نمک بھی ڈال دے تو یخنی کا مزا آتا ہے۔" اس کے لہجے میں اب کی بار تلخی کم اور طنز زیادہ تھا۔ سونیا کے منہ سے چائے کا کپ لگا تھا۔ اسے ہنسی آ گئی۔ اس نے چائے کا کپ پیچھے کیا پھر مصنوعی حیرانی سے اس کی جانب دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"ممانی جان نے ایسا کہا میرے بارے میں۔ مجھے یقین تو نہیں آیا لیکن پھر بھی میں آج ہی نمک ڈال کر دیکھوں گی پانی میں مجھے تو خود اس معجزے کی خبر نہیں تھی۔" اس کا انداز ایسا تھا کہ التمش کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے چائے کا کپ منہ سے لگا کر اس مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے مذاق میں کہا تھا میڈم!" وہ بولا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمایاں رہے لیکن ہونٹوں پر اچانک در آنے والی مسکراہٹ نے کام خراب کر دیا تھا۔

"اچھا۔ مذاق میں؟ یعنی یہ کام آتا ہے تمہیں۔ مذاق بھی کر لیتے ہو تم یعنی ہنستے مسکراتے بھی ہو گے؟ سُن کر اچھا لگا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

"ارے سونیا بی بی! آپ کو کیا بتائیں کہ کیا کیا آتا ہے ہمیں۔ وہ تو آپ کے ساتھ تعلقات ہی کبھی خوش گوار نہیں رہے ورنہ آپ ابھی اتنی حیران نا ہو رہی ہوتیں۔ ایک دنیا مانتی ہے التمش کے سینس آف ہیومر کو۔"

"میں حیران اس بات پر نہیں ہو رہی۔ حیران اس بات پر ہو رہی ہوں کہ ہمارے تعلقات خوش گوار کیوں نہیں ہیں۔ آخر ایسا کیا ہے ہمارے درمیان کہ جو ہمارے تعلقات کو کشیدہ کیے رکھتا ہے۔" اس نے سادہ سے انداز میں پوچھا تھا۔

"تمہیں تو جیسے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ ہر چیز سے بے خبر ہو تم۔ نُور بے بی!" اب کی بار وہ پھر طنزیہ ہوا تھا۔ سونیا نے گہری سانس بھری پھر چائے کے کپ کو سائڈ میں رکھتے ہوئے — اس کی جانب مڑی۔

"میری بات سنو التمش! مجھے واقعی نہیں پتا۔ تم بتاؤ مجھے۔ آخر وہ کیا بات ہے جو تمہیں میرے ساتھ بے تکلف ہونے سے روکتی ہے۔ تم مجھ سے بات کرتے وقت اتنا برہم کیوں ہو جاتے ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ التمش کے چہرے کے تاثرات پہلے سے زیادہ سخت ہوئے۔

"کم آن مس محراب عرف سونیا دی گریٹ۔ آپ کیا سننا چاہتی ہیں میرے منہ سے؟" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سونیا نے ہاتھ ہوا میں معلق کر کے اسے بولنے سے روکا۔

"ایک منٹ۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔

اچھی طرح سنو اب میرے منہ سے۔ وہ حقیقت جسے اپنی خود پسندی میں بھی تسلیم نہیں کیا تم نے۔ مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ذرا سی بھی نہیں۔ کیا میں نے کبھی تمہیں آئی لو یو بولا ہے یا کبھی آئی لو یو بولنے کی کوشش بھی کی ہے۔ تم سے کبھی کسی لگاؤ یا الفت کا اظہار کیا ہے۔ تمہاری امی یا میری امی کچھ بھی سوچتی ہوں۔ کچھ بھی چاہتی ہوں۔ کیا میں نے کبھی کہا کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں التمش! یا تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میرے کس عمل سے ایسا لگا تمہیں کہ میں تم میں انٹرسٹڈ ہوں؟" وہ رکی پھر مزید بولی۔

"تو تم نے خود ہی کیسے یہ سب فرض کرلیا؟ ہاں۔ کیسے؟" وہ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ التمش کو اس سے اس قسم کی گفتگو کی امید نہیں تھی لیکن اس کے کسی بھی لفظ سے انکار نہیں کرسکا تھا وہ۔

"ایک بات اپنے ذہن میں بٹھا لو التمش! ہم کزنز ہیں صرف کزنز۔ مجھے تم میں اس سے زیادہ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ذرا سی بھی نہیں۔ مارک مائی ورڈز التمش! ذرا سی بھی نہیں لیکن یہ جو تم بچوں کی طرح برتاؤ کرتے ہو نا مجھ سے۔ جل جل کر بات کرنا، طنزیہ انداز اختیار کیے رکھنا۔" وہ ایک بار پھر لمحے کے لیے چپ ہوئی اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

"جب محبوب نہیں ہوں تو محبوب والی اہمیت کیوں دیتے ہو۔" التمش پہلے تو اس کی بات سمجھا نہیں، جب سمجھا تو نا چاہتے ہوئے بھی خجل سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی تھی۔ سونیا کے لہجے میں اتنا اعتماد، اتنا استحکام تھا کہ التمش کو واقعی شرمندگی ہوئی۔ وہ غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔

"اور تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ یہ سب میں نے شروع نہیں کیا۔ تم نے کیا ہے۔ ہمارے ریلیشن شپ کو تم نے خراب کیا ہے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ کزن ہی سمجھا ہے جبکہ یہ عاشقی معشوقی والا اسٹیٹس تو تم نے دے دیا ہے ہم دونوں کو اور بات پتا کیا ہے۔ تمہیں اپنے کارڈز نہیں کھیلنے آرہے۔ اپنی چالیں نہیں چل پا رہے تم۔ تمہارے داؤ کامیاب نہیں ہو رہے اور اپنی اس ناکامی کا غصہ تم مجھ پر نکال رہے ہو۔ تم سے برداشت نہیں ہو رہا کہ چار فٹ دس انچ کے معمولی سے قد کاٹھ کے ساتھ بھی میں بزرگوں سے جرح کیے بنا اپنا مقدمہ جیتنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہوں۔ جو تم چھ فٹ کے ساتھ بھی نہیں کر پا رہے۔ تلملانا ایک چیز ہے اور اس تلملاہٹ میں کسی دوسرے کو تلملائے چلے جانا ایک الگ چیز۔ تم یہ ہی کر رہے ہو بس۔ یہ فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ تم اپنی بات منوانے کی کوشش میں پیچ پا ہوئے چلے جا رہے ہو جبکہ میں وہی کام نہایت سکون اور خاموشی سے کر رہی ہوں اور تم سے کہیں بہتر طریقے سے کر رہی ہوں۔ ہاں ہاں اپنے چار فٹ دس انچ قد کے ساتھ بھی اور وقت آنے پر میں ثابت کردوں گی کہ کسی سے اپنی بات منوانے کے لیے قد کاٹھ کا اونچا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ عقل کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔" وہ اپنا موقف بیان کر کے چپ ہوگئی تھی۔ التمش ایک لمحے کے لیے تو کچھ بول ہی نہیں پایا پھر اس کی مردانہ انا نے جیسے اسے اکسایا تھا کہ خاموش رہنے میں سبکی ہے۔

"واہ! تقریر تو بڑی اچھی کرلیتی ہیں محترمہ آپ لیکن مجھ سے کیا چاہتی ہیں آپ۔ تالیاں بجاؤں۔ آپ کے بے تکے تجزیے کو سراہوں۔ اسٹینڈنگ اوویشن دوں۔ ڈھول بجاؤں یا بھنگڑا ڈالوں۔" وہ ایک ہی جملے میں اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

"یہ جو اتنا کچھ فرمایا ہے آپ نے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ مجھے کبھی یہ سب سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ یہ تو تم مجھے بتا رہی ہو کہ میرا رویہ تمہارے ساتھ عاشقی معشوقی والا ہے ورنہ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں ہے۔ میرا مزاج ہی ایسا ہے بس جب موڈ میں نہیں ہوتا تو کسی سے بھی ہنس کر بات نہیں کرسکتا اور جب موڈ میں ہوتا ہوں تو سب سے بے تکلف ہو کر بات کرتا ہوں۔" اس نے وضاحت کی اور پھر چپ ہوگیا۔ حقیقت یہ ہی تھی کہ اس سے جواب بن ہی نہیں پا رہا تھا۔ چائے ختم ہو چکی تھی۔ سونیا اٹھی اور التمش کے قریب پڑی ٹرے بھی اٹھالی۔

"اچھی بات ہے کہ تمہیں اپنے مزاج سے آگاہی تو ہے۔ بہرحال میں نے جو بھی کہا اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کچھ جتانا چاہ رہی ہوں۔ میں نے کافی مہینے رہنا ہے تمہارے اس گھر میں اور اس کے بعد میں چلی جاؤں گی۔ مستقل قیام کا ارادہ تھا اور ابھی ہے لیکن جتنی دیر رہنا ہے سکون سے رہنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں یہ سارا وقت فضول کی کشمکش میں گزاروں اور اپنی مثبت توانائی کو اِدھر اُدھر کی چیزوں میں گزاروں۔ اتنا فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس۔ اس لیے میری جانب سے تمہیں دوستی کی آفر چائے کے کپ کی صورت پیش کردی گئی ہے۔ جب ایک جگہ رہنا ہو تو دشمنیاں پال کر نہیں رہا جاسکتا اگرچہ میں دشمنی بھی اچھے طریقے سے نبھا سکتی ہوں لیکن میں بہت اچھی دوست بھی ثابت ہوسکتی ہوں۔ غور کرنا میری بات پر۔ بال اب تمہارے کورٹ میں ہے۔ شب بخیر۔" اس نے اتنا کہا اور پھر دو اسٹیپس اتر کر کچن کی جانب چل دی۔ التمش اس کے پر اعتماد انداز کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

"پھپھو کی بیٹی کیسی ہے۔" وہ کمرے میں آیا تو زرمین نے میسج کیا ہوا تھا۔

"بہت خطرناک ہے بھائی! اللہ اللہ۔" اس نے اتنا ہی لکھا۔ لائٹ آچکی تھی۔ وہ آرام سے اپنے بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ سونیا کا ہر جملہ اس کے ذہن میں محفوظ ہوگیا تھا۔ وہی باتیں جو پہلے اسے بری لگی تھیں اب اتنی بری نہیں لگ رہی تھیں بلکہ اسے اس کی باتوں پر حرف حرف یقین آگیا تھا۔ تب ہی زرمین سے بات کرتے ہوئے اس کا موڈ مزید خوش گوار ہوگیا تھا۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ وہ کام جو اتنے دنوں سے ناممکن لگنے لگا تھا، اب یکدم ممکن ہونے والا تھا۔

"واپس کب جائیں گی یہ خطرناک چیز۔" زرمین نے پوچھا تھا۔

"دیکھا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بار بار یہ سوال مت پوچھنا۔ ابھی تو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے اسے آئے ہوئے اور تمہارا کون بنے گا کروڑ پتی والا شو شروع ہوگیا ہے۔ خدا کو مانو یار! رہے گی وہ کچھ مہینے یہاں۔" اس نے طویل میسج ٹائپ کیا پھر بلاوجہ سامنے لگے وال کلاک کی تصویر کھینچی اور زرمین کو واٹس ایپ کردی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے جوابی میسج بھیجا تھا۔

"کلاک...... اتنا بھی نہیں پتا۔" وہ بستر پر الٹا ہو کر لیٹتے ہوئے ٹائپ کر رہا تھا۔

"مجھے کیوں بھیجا؟" زرمین نے دوسرا پیغام بھیجا۔

"یہ بتانے کے لیے کہ رات بہت ہو چکی ہے۔ اب سو مر جاؤ۔" اسے نیند آرہی تھی سو چاہتا تھا وہ بھی سو جائے۔

"پہلے بتاؤ۔ پھپھو کی بیٹی کہاں ہے؟" زرمین کا اگلا میسج اسے مزید تاؤ دلا گیا۔

"ٹھہرو۔ تمہیں اس کا نمبر دیتا ہوں۔ تم خود ہی اس سے پوچھ لو۔" اس نے لکھا اور پھر یوں ہی سارے آٹھ نمبرز لکھ ڈالے۔ زرمین نے پھٹی ہوئی آنکھوں والا ایموجی اسے بھیجا تھا۔

"تمہارے پاس اس کا نمبر بھی آگیا یعنی نوبت یہاں تک آپہنچی ہے۔" وہ خطرناک تیور والے تین چار ایموجیز بھیج کر پوچھ رہی تھی۔

"نوبت یہاں تک نہیں پہنچی۔ اس سے دو ایک فرلانگ آگے نکل گئی ہے بی بی! ہم دوست بن گئے ہیں۔" وہ اسے بتا رہا تھا۔

"ٹائم ٹو لیو دا پلینٹ التمش! (اس سیارے کو چھوڑنے کا وقت آگیا ہے)۔ یہ کیسے ہوگیا...... کیسے...... کیسے......؟" اس نے دس بارہ مرتبہ "کیسے" کا میسج بھیجا تھا۔

"کل بتاؤں گا۔ ابھی مجھے نیند آرہی ہے۔" اس نے اتنا لکھا اور ساتھ ہی فون سائڈ پر رکھ دیا تھا۔

میسج ابھی ڈیلیور بھی نہیں ہوا تھا کہ زرمین کی کال آنے لگی۔

”کیا مصیبت ہے۔ تمہیں اپنے گھر میں سکون نہیں ہے۔ ہر وقت ہمارے گھر کی گھنٹیاں بجاتی رہتی ہو اور یہ وقت ہے بھلا کسی کے گھر کال کرنے کا۔ پتا ہے نا ہماری مہارانی جودھا بائی کا۔ ان کے اپنے قانون ہیں۔ وہ ایسی باتوں کا سخت برا مانتی ہیں۔ چلو فون بند کرو۔“ وہ بے تکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”یہ بک بک بند کرو اور مجھے صاف صاف بتاؤ پھپھو کی بیٹی سے دوستی کیسے ہوگئی تمہاری۔ مجھے پہلے ہی اس بات کا خدشہ تھا۔ میری ممی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ لڑکے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ ان پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ مصنوعی ناراضی سے کہہ رہی تھی۔ التمش کو ہنسی آگئی۔ اس نے آڈیو کال بند کی اور پھر ویڈیو کال ملائی۔ ایک منٹ تک زرمین نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی پھر اس کا میسج آیا تھا۔

”ویڈیو کال ریسیو نہیں کرسکتی۔ میں اپنی کزن کی انگیجمنٹ پر آئی ہوں۔“

”اچھا۔ پہلے تو نہیں بتایا تم نے۔ اکیلی ہی چلی گئی ہو۔ مجھے بھی انوائٹ کرلیتی۔ کتنے دن ہوگئے شادی والا کھانا نہیں کھایا۔ دیگ والا قورمہ یاد آگیا مجھے تو۔“ اس نے ایک اور غیر سنجیدہ میسج بھیجا۔

”نج...... تمہیں تو کبھی نا بلاؤں یہاں میں۔ اتنا بے کار فنکشن ہے۔ فضول سے لڑکے سے انگیجمنٹ ہورہی ہے۔ ہمارے اسٹینڈرڈ کے لوگ نہیں ہیں یہ۔ پیچھے سے پتا نہیں کون سی ذات کے لوگ ہیں۔ سب کچھ لو اسٹینڈرڈ کا ہے۔ ایک دم چیپ۔ ممی بتا رہی تھیں دھوبی ہوتے ہیں یہ لوگ۔ بہت ہی عجیب سا فنکشن ہے۔“

زرمین نے میسج کیا تھا۔ التمش کو اس میسج کو سمجھنے میں دو منٹ لگے تھے۔

”ہیں۔ کون ہیں۔ کیا ہیں یہ لوگ؟“ اس نے پوچھا۔

”دھوبی۔“ اس نے دوبارہ لکھا تھا۔ التمش حیران ہوا تھا۔

”اوہ نہیں یار! کمی کمین ہوتے ہیں یعنی کم ذات یہ دھوبی درزی۔ نائی کمہار وغیرہ۔ کزن کی اپنی پسند سے ہورہی ہے انگیجمنٹ ورنہ ہمارے بڑے تو ان باتوں پر کمپرومائز نہیں کرتے۔“ وہ وضاحت کررہی تھی۔ التمش چپ سا ہوگیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ زرمین ایسی باتوں کو اہمیت دیتی ہے۔

”اب بتاؤ۔ دوستی کیسے کرلی پھپھو کی بیٹی سے؟“ زرمین کی سوئی اسی جگہ اٹکی تھی۔ التمش اسے اپنی اور سونیا کی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا تھا۔

☆☆☆

”یہ کیا کررہی ہو؟“ التمش گیارہ بجے اپنے کمرے سے سو کر نکلا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور وہ معمول سے کچھ پہلے ہی بے دار ہوا تھا سونیا برآمدے میں میز پر جانے کیا کیا بکھرائے بیٹھی تھی۔ التمش نے اسے ہمیشہ ہی مصروف دیکھا تھا۔ ساہیوال میں بھی وہ کاغذ قینچیاں دھاگے بیٹھی جانے کیا کیا بناتی نظر آتی اور یہاں کراچی میں بھی اس کی مصروفیت پہلے والی ہی تھی۔ التمش کے ذہن میں اسے دیکھتے ہی رات ہونے والی گفتگو کی جھلکیاں چلنے لگی تھیں۔ اس نے زرمین سے بات کرنے کے بعد بہت دیر تک اسی متعلق سوچا تھا اور اسے لگا تھا کہ سونیا جو بھی کہہ رہی تھی غلط نہیں تھا تب ہی وہ اس کی دوستی کی پیشکش کو قبول کرنے کے لیے رضامند تھا۔ اس میں اسے اپنا مفاد نظر آرہا تھا۔

”گڈ مارننگ!“ اس نے اسے خود ہی مخاطب کرلیا تھا۔ سونیا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر جیسے اسے بالکل حیرت نا ہوئی تھی۔

”گڈ مارننگ!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں ایک استحکام تھا گویا اسے یقین تھا کہ التمش اس کی دوستی کی پیشکش کو انکار کر ہی نہیں سکتا۔ التمش مزاجاً اتنا خود پسند تھا کہ اسے یہ بات

چہرے پر تشکر آمیز مسکراہٹ یا تحیر ضرور چمکنا چاہیے تھا جبکہ ایسا قطعاً نہیں ہوا تھا سو وہ اسے مزید مخاطب کیے بنا کچن کی جانب چل دیا۔ مہناز بیگم سے بھی اس کی ناراضی چل رہی تھی سو ناشتا کہنے پر نہیں ملتا تھا بلکہ وہ کچھ بھی بنا کر میز پر ڈھانپ کر رکھ دیتی تھیں جو وہ کھا لیتا تھا۔ اس نے دیکھا میز پر آلو کے پراٹھے رکھے تھے۔ اس کی امی کو ذرا بڑے سائز کا پراٹھا بنانے کی عادت تھی جبکہ میز پر جو پراٹھے رکھے تھے وہ سائز میں چھوٹے تھے۔ وہ تمسخر اڑانے والے انداز میں مسکرایا تھا۔ اس کی سگھڑ سلیقہ مند کزن کی گھر میں آمد کے ساتھ ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب ان کے کچن میں نت نئی چیزیں بنتی رہیں گی۔

”پراٹھے کا شکریہ۔ اگرچہ یہ میری امی کے ہاتھ کے پراٹھے جیسا مزے دار نہیں ہے لیکن پھر بھی۔ ناٹ بیڈ۔“ التمش نے دوسری بار اسے خود سے مخاطب کیا تھا۔ مہناز بیگم کچن میں ہی تھیں اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کررہی تھیں۔

”اچھا۔“ سونیا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر استفہامیہ انداز میں پوچھنے لگی۔

”اس پراٹھے میں کمی ہے کوئی؟“

”تھوڑا چھوٹا ہے۔ چلو اب وہ تو اپنے قد کے حساب سے بنائے ہوں گے تم نے لیکن کناروں سے تھوڑا سا موٹا بھی ہے۔ نمک مرچ کم ہے۔ آلو کچھ زیادہ ہی کچل ڈالے ہیں اور یہ اتنا بڑا ادھنیا پودینہ کون ڈالتا ہے پراٹھے میں۔“ وہ بات برائے بات کر رہا تھا۔ چہرے پر طنز نہیں تھا لیکن مسکراہٹ بھی نا تھی۔

”میں ڈالتی ہوں۔ کوئی اعتراض اور یہ پراٹھے سونیا نے نہیں میں نے ہی بنائے تھے۔“ مہناز بیگم کچن سے نمودار ہوکر بولی تھیں۔ التمش کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔

”اوہو ہو...... پھر تو بہت گستاخی ہوگئی مجھ سے پراٹھوں کی شان میں۔ معافی ملکہ عالیہ معافی۔

[illegible] کہ کوئی اعتراض کرے۔“ اس نے کہنے کے ساتھ اُٹھ کر فٹافٹ فرشی سلام پیش کیا تھا۔ مہناز بیگم کو ہنسی تو آئی مگر ضبط کر گئیں۔

”سائل کے بچے ہر وقت ہر کام میں کیڑے نا نکالتے رہا کرو۔ یہ ساری حرکتیں اللہ کی ناراضی کا سبب بنتی ہیں۔“ وہ اس کی جانب اپنی پشت کرتے ہوئے بولی تھیں۔

”ارے التمش کہتے ہیں مجھے۔ اللہ کریم کیوں ناراض ہوں گے مجھ سے۔ میں نے کیا ہی کیا ہے۔ اللہ تو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ یہ تو آپ ہی ہیں جو ناراض حسینہ بنی پھرتی ہیں۔“

”بک بک مت کرو۔ ذرا بچی کی مدد کردو۔ کافی عرصہ بعد کراچی آئی ہے۔ راستے سمجھاؤ اسے۔“ وہ کہتے ہوئے کچن کی جانب چل دیں۔

”راستے سمجھ کر کیا کروگی تم؟ بزنس کا ارادہ ہے کیا۔ وہ بزنس جو ہاتھوں میں کاف شین پھر کاف واؤ اور پھر لام یعنی کشکول پکڑ کر کرتے ہیں لوگ۔“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ سونیا کو ہنسی آگئی اور اس نے ہنسنے میں بالکل بھی کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ کھل کھل کرتے کئی جگنو ارد گرد سے پھیل گئے۔ التمش نے کبھی اسے اس طرح ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ اسے اس کی یہ کھلکھلاہٹ بڑی بھلی لگی۔ ایسے جیسے صبح، بارش اور آئس کریم کو سراہتا ہے انسان، اس نے بھی دل ہی دل میں اس کی ہنسی کو سراہا تھا۔

”دراصل مجھے شارٹ کورسز کرنے ہیں۔ گرافکس وغیرہ کے۔ انڈس ویلی سے تو بس میں چاہتی ہوں ذرا روٹ سمجھ لوں۔ کل پرسوں جاؤں گی نا۔“ وہ وضاحت کررہی تھی۔ التمش تمسخرانہ انداز میں ہنسا۔

”انڈس ویلی میں ایڈمیشن لوگی تم؟“

”لوں گی نہیں؟ لے چکی ہوں۔ آن لائن سارا پروسیجر ہوچکا ہے۔ فیس بھی پے کرچکی ہوں تب ہی تو آئی ہوں یہاں۔“ وہ لاپروا سے انداز میں بولی جیسے

PakiBooks.Site

جتا بھی رہی ہو کہ بتایا تو تھا تمہیں کہ یہاں آنے کا مقصد تم سے شادی قطعاً نہیں ہے۔

''تو پھر سمجھادو گے تم مجھے راستے یا پھر میں جی پی ایس پر بھروسا کرلوں۔'' وہ پُراعتماد انداز میں پوچھ رہی تھی۔ ایسے جیسے ان کے درمیان ہمیشہ سے بے حد بے تکلفی رہی ہو۔ التمش کو جانے کیا سوجھی یک دم بولا۔

''میں لے جایا کروں گا تمہیں۔ کب سے شروع کرنا ہے۔ آئی مین پک اینڈ ڈراپ دے سکتا ہوں میں تمہیں۔'' وہ آفر کررہا تھا۔ وہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر کھوجنے والے انداز میں مسکرائی تھی۔

''یعنی...... تم نے میری آفر پر غور کرنے کا ارادہ کرلیا ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''سوچ تو رہا ہوں کہ آزمالیا جائے تمہیں۔ سُنا ہے جن کے قد چھوٹے ہوں ان کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں۔ بڑے سخی دوست ثابت ہوتے ہیں ایسے لوگ۔'' وہ بولا۔

''لوگوں کی چھوڑو۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ لمبے آدمی کی عقل اس کے ٹخنوں میں ہوتی ہے۔ لیکن میں نہیں یقین کرتی ایسی باتوں پر۔'' وہ چڑانے والی بات بھی اتنے سادہ انداز میں کر گئی تھی کہ نا چاہتے ہوئے بھی التمش کو ہنسی آگئی۔

''تم یقین کر بھی کیسے سکتی ہو۔ تمہارے سامنے میرے جیسی جیتی جاگتی مثال موجود ہے۔ التمش کہتے ہیں مجھے۔ قد کاٹھ میں بھی اونچا اور عقل و شعور میں بھی۔'' وہ نادیدہ کالر جھٹکتا ہوا بولا تھا۔

''چلو تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں ورنہ ابھی تک عقل و شعور کی ایسی کوئی بات سُنائی تو نہیں ہے تم نے۔'' سونیا نے ایک اور طعنہ دیا تھا لیکن وہ دونوں ہی مسکرارہے تھے۔

''سنادیں گے باتیں بھی۔ غزلیں بھی اور نظمیں بھی۔ اب تو آپ کا قیام ہمارے گھر میں ہی رہے گا۔ فیض یاب کرتے رہیں گے آپ کو اپنی ذہانت وفطانت سے۔'' وہ بولا تھا۔

''تو پھر دوستی؟'' سونیا نے پوچھا تھا۔ التمش نے اثبات میں گردن ہلائی اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تھا۔ سونیا نے بھی اپنا ہاتھ آگے کردیا۔

''یا اللہ...... یا اللہ...... اتنا اچھا شگون۔'' سوہا بیگم کچن سے باہر کی جانب ہی دیکھ رہی تھیں۔ ان کی تو باچھیں ہی کِھل اٹھیں۔ ان دونوں کو ہاتھ ملاتا دیکھ کر وہ خوشی سے پھولی نہیں سمارہی تھیں۔

☆☆☆

''بُراق تم لوگ اپنی فیملی میں ہی شادی کرتے ہو؟'' زرمین نے فائل پر رکھے پین کو اٹھاتے ہوئے سرسری سا انداز اپناتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ سب کیمپس کے گراؤنڈ میں نوٹس بکھرائے، ارد گرد کتابیں سجائے پڑھنے کی کوشش کررہے تھے۔ فائنل نے سب کو ہی پڑھنے پر مجبور کردیا ہوا تھا

''کیوں۔ تمہیں شادی کرنی ہے میری فیملی میں؟'' وہ فائل میں نوٹس ترتیب سے رکھ رہا تھا، اس کی بات کو غیر سنجیدگی سے سنتے ہوئے ذومعنی انداز میں پوچھنے لگا۔ زرمین نے ناک چڑھا کر اسے گھورا۔

''اونہہ۔ شکل دیکھی ہے۔ میں کسی اور کے لیے پوچھ رہی تھی۔'' بُراق نے اس سے بھی زیادہ بُری شکل بنائی۔

''زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے بی بی! ہمارے خاندان میں آؤٹ آف کاسٹ لڑکی از اسٹرکٹلی پروہبٹڈ۔ ہمارے یہاں لڑکے بچپن سے ہی ڈیئر کزنز کو پیارے ہوجاتے ہیں۔ کسی کو تایا کی بیٹی مل جاتی ہے اور کسی کو ماموں کو بیٹا! کام ختم پیسا ہضم۔'' وہ نیم سنجیدہ انداز میں وضاحت کررہا تھا۔ زرمین ذرا بھی متاثر نا ہوئی۔

''کوئی اچھا رواج تو نہیں ہے جو اتنے فخر سے بتارہے ہو۔'' وہ چڑ کر کہہ رہی تھی۔

''اوہو۔ تم کیوں اتنی بے زار ہو، تمہاری بکنگ تو ہوچکی ہے۔ تمہیں کیا ٹینشن؟ مسئلہ تو نمیرہ کو ہوگا۔ جس کو نا ماموں کے بیٹے نے گھاس ڈالنی ہے نا پھپھو کے بیٹے نے۔ اس بے چاری کو اچھے رشتے کے انتظار میں ایم فل کرنا پڑ جانا ہے۔'' احتشام نے



نمیرہ کو دیکھتے ہوئے چڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

وہ سب لوگ آج کل بس نوٹس مکمل کرتے پھر رہے تھے۔ ایم بی اے فنانس کے فائنل سمسٹر نے سب کو ہی حواس باختہ کر رکھا تھا۔ لائبریری، کینٹین اور کیمپس گراؤنڈز میں بس پڑھائی کی باتیں ہی چل رہی تھیں۔ ایک واحد ان ہی کا گروپ تھا جو غیر سنجیدہ باتیں بھی نہایت سنجیدگی سے کرنے میں مگن تھا۔ نمیرہ التمش سے کوئی ٹاپک سمجھ رہی تھی۔ اپنا نام سن کر اس نے مڑ کر دیکھا جب بات سمجھ میں آئی تو احتشام کے کندھے پر کتاب مار کر بولی۔

''اللہ نا کرے۔ منحوس آدمی۔ ایم فل کریں میرے دشمن۔ میں نے تو اپنی امی سے بھی کہہ دیا ہے کہ بے شک میری شادی پھپھو کے بیٹے سے کردیں مگر بس کردیں۔ میں نے اکاؤنٹس کے سوال لکھ لکھ کر بہت صفحے نیلے کرلیے۔ اب بس میرے ہاتھ پیلے کرنے کا موسم آگیا ہے۔'' اگیزامز کے دن تھے۔ سب ہی پڑھائی سے بے زار ہوئے جارہے تھے۔

''لو ایک اور کزن میرج کی حامی مل گئیں۔ میں کزنز میرج سے بڑی بے زار ہوں۔ یہ کیا کوئی لیٹسٹ ٹرینڈ ہے۔ کوئی پھپھو کی بیٹی کے لیے باولا ہوا جارہا ہے کوئی تایا کی بیٹی کے لیے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''اوہ یار اب ایسی بات نہیں ہے ورنہ میں تو منتظر بیٹھا ہوں۔ میرا سلسلہ جوڑ دو کہیں۔ میں نہیں پڑھنا چاہتا مزید۔ خدا کا واسطہ۔ میری جان چھڑوادو کوئی اس پڑھائی سے۔ میں پھپھو کی بیٹی، چاچو کی بیٹی۔ ماموں یا پھر تایا کی بیٹی سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔'' احتشام نیم مزاحیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ التمش نے گھور کر اسے دیکھا۔ اس کا سوال مکمل ہوگیا تھا۔ اس کا دھیان ان کی طرف نہیں تھا لیکن جب پھپھو کی بیٹی اور لفظ ''کزن'' کی تکرار ہونے لگی تو اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ وہ سب دوست آپس میں بے تکلف تھے۔ التمش اور زرمین کے متعلق سب ہی جانتے تھے لیکن التمش نے کبھی اپنے منہ سے سونیا کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اسے زرمین کی بے سروپا گفتگو سے الجھن ہوئی۔

''تم لوگ کتنا فضول بولتے ہو۔ کوئی ٹینشن نہیں اگیزام کی۔ اتنا زیادہ پورشن ہے۔ کیسے ختم ہوگا۔ فیل ہونے کا ارادہ ہے کیا؟'' وہ نخوت سے بولا تھا۔

''تم اگر یہ ہی بات سمسٹر کے شروع میں کرلیتے تو زیادہ اچھا تھا تب تو تم ''التمش ہوں میں۔ سب بجتا ہے مجھ۔'' کی گردان کرتے پھرتے تھے۔ اب کتابیں کھول کر بیٹھ گئے ہو لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں ہونا۔ اب کارپوریٹ فنانس میں پاس ہونے کا بس ایک ہی گُر ہے۔ ٹوپیاں پہن لو اور بچھا لو مصلے اور کوئی حل نہیں اس مصیبت سے نکلنے کا۔'' احتشام نے مشورہ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ التمش مزید کچھ کہتا۔ زرمین چڑ کر بولی تھی۔

''اوہو۔ میں اتنا اہم مسئلہ ڈسکس کررہی تھی۔ تم لوگوں نے پھر پڑھائی کی بات شروع کردی۔ چپ کرو سب۔ میں نے کیا پوچھا تھا تم سے بُراق۔ تم لوگ واقعی فیملی میں شادی کرتے ہو؟'' زرمین نے گفتگو کا رخ دوبارہ وہیں موڑ دیا تھا جہاں سے بات شروع ہوئی تھی۔ بُراق نے نفی میں سر ہلایا۔

''اوہ نہیں بھئی۔ اتنے بھی کنزرویٹو (قدامت پرست) نہیں ہیں ہم۔ فیملی کی تو کوئی شرط نہیں ہے۔ ہاں بارات مسجد میں اور ولیمہ ہال میں ضرور کرتے ہیں۔'' وہ اپنے نوٹس کو ترتیب سے فائل میں رکھ رہا تھا، اس کی بات کو اہمیت دیے بنا بولا۔

''اس کا مطلب تمہارے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی تھی۔ بُراق نے مصنوعی حیرت میں بھر کر اسے گھور کر دیکھا۔

''تمہارا اور التمش کا بریک اپ ہوگیا کیا؟''

''خدا نا کرے اسٹوپڈ! میں اپنے لیے نہیں کہہ رہی۔'' اس نے بات مکمل بھی نا کی تھی کہ بُراق نے نوٹس والی فائل سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''باجی آپ فائنلز کی فکر کریں۔ سارے محلے کی بہنوں بیٹیوں کے رشتوں کی ذمہ داریاں ان کے امی

اما کو پوری کرنے دیں۔" نمیرہ نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے زرمین کو کن انکھیوں سے گھورا۔

"سارے محلے کی نہیں۔ بس ایک لڑکی کے رشتے کی ٹھان لی ہے میں نے۔ کوئی اچھا لڑکا ہو تو مجھے ضرور بتانا تم سب لوگ۔" وہ نہایت سنجیدہ تھی۔ التمش جیسے سمجھ گیا تھا کہ وہ کس نہج پر سوچ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر خفگی بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

"تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ کیا فضول باتیں کر رہی تھیں تم؟" التمش نے یونیورسٹی میں اس سے کوئی بات نا کی تھی لیکن گھر آتے ہی اسے کال کی تھی۔

"یار میں تو بھلا سوچ رہی ہوں تمہاری کزن کا۔ احتشام اچھا لڑکا ہے۔ اچھا تو بُراق بھی ہے لیکن احتشام زیادہ ریلائی ایبل ہے (قابلِ بھروسا)۔ اکلوتا بھی ہے۔ فیملی بھی اچھی ہے۔ دعائیں دے گی تمہاری کزن تمہیں بھی اور مجھے بھی۔" زرمین نے اپنا موقف اسے بتایا تھا۔

"احتشام اچھا لڑکا ہے؟" التمش نے طنز کیا تھا۔

"گزشتہ دو سالوں میں چار افیئرز رہے ہیں اس کے یونیورسٹی میں۔ اس سے شادی کروائیں گے ہم سونیا کی۔" وہ ذرا بھی متاثر نا ہوا تھا۔

"افیئرز تو آج کل ہر ایک کے ہی ہوتے ہیں۔ وہ سیریس کسی کے لیے بھی کبھی نہیں رہا۔ ایسے لڑکے بہت اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔" زرمین نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"اوہ کم آن زری۔ کیسی فضول باتیں کرتی ہو تم۔ وہ اگر کسی لڑکی کے لیے کبھی سیریس نہیں رہا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ سونیا کے لیے سیریس ہو جائے گا۔" وہ ذرا سا ڈپٹ کر بولا تھا۔

"تم نے سنا نہیں وہ اپنے منہ سے کہہ رہا تھا کہ اسے شادی کرنی ہے اور میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ تمہاری پھپھو کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا ورنہ یہ انٹر پاس گھر بیٹھی عام عام سی لڑکیاں یوں ہی رشتوں کے انتظار میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔" زرمین بُرا مان کر نخوت سے بولی۔ التمش کو مزید بُرا لگا۔

"وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں ہے زرمین! بہت قابل ہے۔ اتنی ٹیلنٹڈ ہے پتا نہیں کیا کیا کرتی رہتی ہے۔ امی بتا رہی تھیں گھر بیٹھے اسی نوے ہزار کما لیتی ہے۔ شکل صورت کی بھی اچھی ہے۔ اس کے لیے کوئی بہت ہی بہترین لڑکا ہونا چاہیے۔ احتشام بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔" التمش نے دوٹوک انداز میں کہا۔ سونیا سے دوستی کر لینے کے بعد وہ اس کا گرویدہ سا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی گفتگو میں بھی سونیا کا تذکرہ زیادہ ہونے لگا تھا تب ہی زرمین خدشات میں گھرتی جا رہی تھی۔ زرمین ایک لمحے کے لیے تو چپ ہی رہ گئی پھر بولی تو اس کے انداز میں عجیب سا شکوہ تھا۔

"تم بالکل اپنی امی کی زبان بولنے لگے ہو۔ دو ہفتے میں ہی اتنا متاثر ہو گئے ہو ڈیئر کزن سے۔"

"ارے نہیں، متاثر نہیں ہوا۔ وہ واقعی اچھی لڑکی ہے۔" زرمین نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اسے ہی متاثر ہونا کہتے ہیں التمش۔" اس کی آواز میں عجیب سا خدشہ چھلکنے لگا تھا۔



"کم آن زری! کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم سوچ رہی ہو۔ میں تمہارے متاثرین میں سے ہوں اور زندگی بھر رہوں گا۔ بدنیت نہیں ہوں میں۔ جو چیز میری نہیں ہے، بس وہ میری نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں نا کہ میں کسی دوسرے کی اچھی چیز کو سراہوں گا بھی نہیں۔ سونیا اچھی لڑکی ہے۔ تم بھی اس سے ملو گی نا تو یہی کہو گی۔" التمش نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"تم پھر ملواؤ نا ہمیں اس سے۔ ایسا کرتے ہیں سب دوستوں کی پارٹی کرتے ہیں کسی روز۔ میری کزن بتا رہی تھی کہ رائس باؤل کا کھانا بہت اچھا ہے، وہاں چلتے ہیں۔ احتشام اور بُراق کو بھی لے چلیں گے۔ تم ملنے تو دو ایک بار اپنی کزن کو احتشام سے۔ ادنیٰ سی کوشش ہی سہی باقی کے معاملات تو بعد میں بھی

دیکھے جا سکتے ہیں۔" زرمین نے مشورہ دیا تھا۔ التمش ایک لمحے کے لیے تو چپ سا رہ گیا پھر ہونٹ بھینچ کر پُر سوچ انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تم کہہ رہی ہو تو یہ بھی کر لیتے ہیں لیکن ایگزامز کے بعد۔ یہ دو ہفتے گزر جانے دو پھر کرتے ہیں کچھ پلان۔" وہ مان گیا تھا۔

☆☆☆

"التمش! بہن کو میٹھا پان ہی کھلا دینا تھا۔" ماسٹر جی نے رات کے کھانے کے بعد بیٹے سے فرمائش کی تھی۔ التمش کسی بیکری سے شوگر فری چیزیں لا کر اکثر ہی انہیں خوش کرتا رہتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اس سے کہا تھا۔ مہناز بیگم اور سونیا دونوں ہی کھانے کے بعد کچن میں برتن سمیٹ رہی تھیں۔ التمش کے پیپرز ختم ہو جانے کی خوشی میں آج کھانا کافی پُر اہتمام بنایا گیا تھا۔

"بہن ہو وہ اس کے دشمنوں کی۔ اس کی بہن نہیں ہے وہ۔" مہناز بیگم اسی لمحے کچن سے نکل کر باہر آئی تھیں۔ ماسٹر جی کے جملے میں سب سے قابلِ اعتراض بات انہیں یہی لگی تھی۔ ان کا منہ ہی بن گیا۔ دھیمی سی آواز میں انہیں گھرکتے ہوئے بولی تھیں۔ ماسٹر جی گڑبڑا سے گئے۔

"اوہ، معاف کیجیے گا۔ گرامر کی غلطی ہو گئی۔ وہ میں التمش کو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کچھ میٹھا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ پان ہی لا دے اپنی کزن کو اور مجھے بھی۔" آخری جملہ کن انکھیوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا گیا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اتنی الم غلم چیزیں ڈالی ہوتی ہیں۔ صفائی کا خیال بھی نہیں رکھتے۔" وہ التمش کی جانب دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولیں اور میز پر پڑے باقی ماندہ برتن اٹھا کر دوبارہ کچن میں چل دیں۔ ماسٹر جی نے بے زاری سے بُرا سا منہ بنایا۔

"اب ہم اپنی مرضی سے کوئی چیز بھی نہیں کھا سکتے۔" وہ بہت اُکتا کر بولے تھے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

حساب دل رہنے دو



نبیلہ عزیز

قیمت -/400 روپے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

"یہ ان کا نام مہارانی جودھا بائی کس خصوصیت کی بنا پر رکھا تھا آپ نے؟" التمش نے نہایت سنجیدگی سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے طنز کیا تھا۔ ماسٹر جی مسکرائے۔

"اوہ یار! ٹی وی میں دیکھ کر رکھ دیا تھا۔ اب ہوگئی غلطی، کیا کریں۔" وہ جوان بیٹے کے سامنے وضاحت دیتے ہوئے بولے۔ التمش نے منہ بگاڑا۔ یہ ان دونوں کا ہی پسندیدہ تکیہ کلام تھا۔

"ٹی وی پر پھولن دیوی کو کبھی نہیں دیکھا تھا آپ نے۔" التمش نے اگلا جملہ ادا کیا تھا۔ ماسٹر جی نے نفی میں سر ہلایا۔ "تب ہی یہ صورت حال ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ ماسٹر جی کو بالکل اچھا نا لگا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ دل کی تو بہت اچھی ہیں۔" انہوں نے فوراً صفائی پیش کی۔

"جی وہ تو نظر آ ہی رہا ہے مجھے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"تم کیا سرگوشیاں کر رہے ہو ماسٹر جی سے۔" وہ دوبارہ واپس آ گئی تھیں۔

"یہ کہہ رہا تھا کہ اگر والدہ محترمہ شرف قبولیت بخشیں تو میٹھا پان مہمان کیا جا سکتا ہے۔" ماسٹر جی نے پھر درخواست کرنے والے انداز میں کہا۔

"آپ بھی کبھی بالکل ہی بچوں کی طرح ضد کرنے لگتے ہیں ماسٹر جی! اب ضد لگا لی ہے کہ پان کھائیں گے تو بس کھائیں گے۔" مہناز بیگم نے برا سا منہ بنا کر کہا تھا لیکن ان کے انداز نے جتا دیا تھا کہ التمش پان لا سکتا ہے۔ ماسٹر جی خوش ہو گئے۔ وہ دوبارہ سے کچن کی جانب جاتے ہوئے باآواز بلند بولیں گویا التمش کو پان لانے کا عندیہ دیا تھا۔

"سونیا! بیٹی چائے مت بناؤ۔ یہاں پان کی دوکان سجنے لگی ہے۔"

"چل بھئی پتر! پان کھلا دے آج۔ بڑے دن سے طلب ہو رہی تھی۔ ڈبل مسالا ڈال کر خوب ساری میٹھی چھالیہ ڈلوانی ہے" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ التمش اپنی جگہ سے ہلا تک نا تھا

"اٹھ جا یار! مہارانی جودھا بائی کے فیصلے بدلنے وقت نہیں لگتا۔" انہوں نے اسے ٹس سے مس ہوتا نا دیکھ کر دوبارہ کہا تھا۔

"ماسٹر جی! پان تو میں لے آتا ہوں۔ وہ تو دو منٹ کا کام ہے لیکن آپ کو ملوانا ہے کسی سے۔ آپ کا تھوڑا سا وقت چاہیے۔" التمش نے ان کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے درخواست کی تھی۔

"مجھے؟ مجھے کس سے ملوانا ہے پتر جی؟" ماسٹر جی نے پوچھا۔ ان کے اعصاب پر میٹھا پان سوار تھا۔ التمش نے گہری سانس بھری، پیچھے مڑ کر کچن کی جانب دیکھا اور ان کے قریب ہوتے ہوئے دھیمی سی آواز میں بولا۔

"زرمین سے۔" ماسٹر جی کو جھٹکا لگا۔

"اوہ بیڑا غرق جائے۔ اتنا مہنگا پان۔" وہ جیسے سمجھ گئے تھے کہ بیٹا کس سے ملوانا چاہ رہا ہے۔ انہوں نے بھی ایک نگاہ کچن کے دروازے کی جانب ڈالی۔

"اور خطرناک بھی۔" وہ مزید بولے تھے۔

"سوچ لیں، آپ کی مرضی ہے۔" التمش نے کرسی پر پیچھے ہو کر ٹھیک سے بیٹھتے ہوئے کندھے اچکائے، ماسٹر جی نے مسلسل کچن کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے ایک نہایت طویل، گہری سانس بھری۔ آنکھوں میں جیسے کشمکش چمکنے لگی تھی۔ چند لمحے وہ ایسے ہی بیٹھے سوچتے رہے پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔

"اچھا پتر جی!" اب شرع میں کیا شرمانا۔ جا لے آ۔ پان۔" التمش کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

لو بھئی۔ پیارے پڑھنے والے اب کوئی مجھ سے نا پوچھے کہ آگے کیا ہوا۔ میں پہلے میٹھا پان کھاؤں گا پھر ہی باقی کہانی آگے بڑھاؤں گا۔

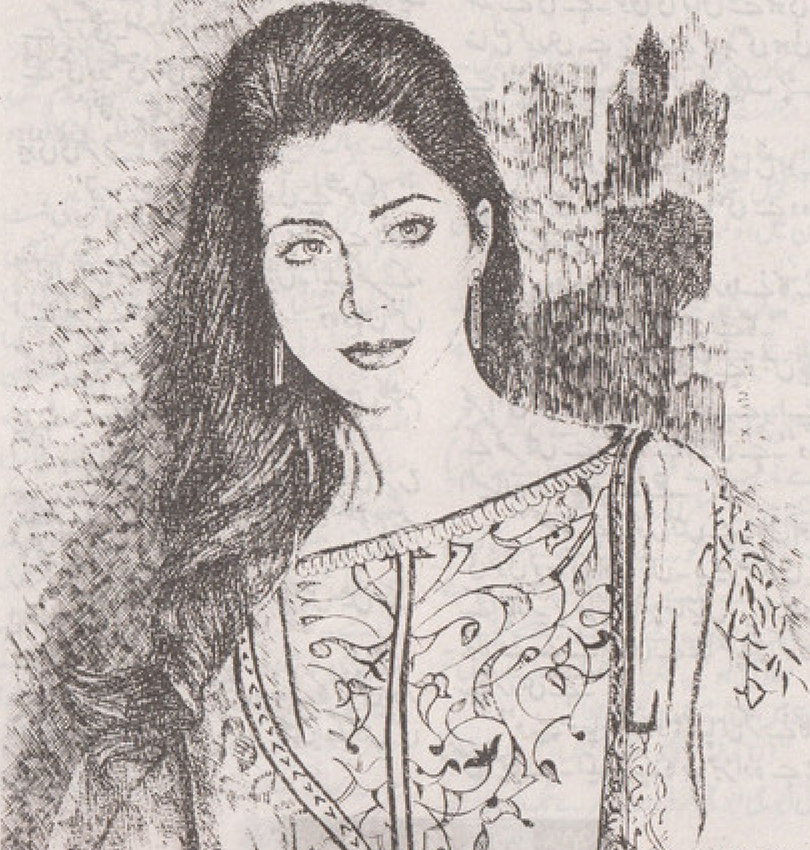
(باقی آئندہ ماہ)

PakiBooks.Site

سدرۃ المنتہیٰ

آسان سی بات

"زندگی عجیب رخ اختیار کرتی جا رہی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ آگے والا وقت زیادہ بہتر اور پرخوش آئند ہوگا۔ مگر اس کے برعکس مسائل آتش فشاں کا روپ اختیار کرتے جاتے ہیں۔" وہ اخباروں کا



پلندا اٹھا کر دراز میں ڈالتے ہوئے بولے تھے۔

ادھ کھلی دراز سے اخباروں کا آدھا پلندا بے ترتیب اس طرح جھانک رہا تھا۔ جیسے مجھے باہر نکالو کی عاجزانہ درخواست کر رہا ہو۔

اسی وقت بینا اندر آئی تھی کمرے میں اور دراز کھول کر سب سے پہلے اس نے اخباروں کو ٹھیک سے ترتیب دیا دراز میں بچھایا اور ہلکے سے دراز بند کردی۔ وہ کبھی کبھار چیزوں کا بھی انسانوں کی طرح ہی خیال رکھتی تھی۔ افتخار نے بیٹی کی لاشعوری حرکت پر غور کیا تھا۔ وہ ایسی کئی حرکات بے ساختہ کر جاتی تھی۔

''تو اخباروں کے بھی دم گھٹتے ہیں کیا؟'' وہ مسکرا کر بولے۔

بینا نے اثبات میں سر ہلا کر ان کے نزدیک سے گزر گئی۔ مسز افتخار قدرے سنجیدگی اور فکرمندی سے بیٹی کو دیکھتی رہی تھیں۔

''افتخار یہ پھر کچھ سوچنے لگی ہے۔'' افتخار نے بیوی کی طرف ناسمجھی سے دیکھا تھا۔

''تو سوچنے دو، یہی عمر تو ہوتی ہے شعور کی۔''

''یہ عمر خواب دیکھنے کی ہوتی ہے افتخار! لڑکیاں اس عمر میں سپنے دیکھتی ہیں۔ ایک گھر کے، اپنے گھر کے، اپنی خوشیوں کے...... وہ وہاں کس طرح رہے گی وغیرہ۔''

''خواب اور طرح کے بھی ہو سکتے ہیں کلثوم بیگم!''

''نہیں افتخار! ایک لڑکی کے خواب اسی طرح کے ہوتے ہیں اور ہونے بھی چاہئیں۔'' کلثوم بیگم کا لہجہ حتمی اور پریشان کن تھا۔

''ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں میں ایک واضح فرق ہوتا ہے مسز!''

''افتخار آپ پر بھی نا بجلی کے بل کا ٹینشن سوار ہو گیا ہے اور کوئی بات تو آپ سمجھیں گے نہیں کسی کی۔''

''صرف بجلی کا بل نہیں کلثوم بیگم! گیس اور پانی کا بھی۔ اس کے علاوہ بچوں کی فیسیں۔ ایک شکر ہے بینا کا ماسٹرز مکمل ہوا۔'' لمبی سانس کھینچ کر ایزی چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر بولے۔

''ابھی کہاں افتخار صاحب! ابھی تو آپ کی صاحبزادی ایم فل کرنا چاہ رہی ہے۔'' کلثوم بیگم نے اپنے تئیں جیسے بم پھوڑا تھا۔

''ہیں......؟ واقعی......'' وہ قدرے حیرت اور خوشی سے تقریباً اچھل کر سیدھے ہوئے تھے۔

''آپ اس بات پر خوش ہو رہے ہیں افتخار؟''

''تو یہ بات خوش ہونے کی نہیں ہے؟''

''ہائے میں قربان افتخار صاحب! یہ بات صدمے کی ہے۔ خوشی کی کہاں سے ہوگئی۔ وہ عمر ضائع کر رہی ہے پڑھ پڑھ کر بڈھی ہوئی جا رہی ہے اور ادھر آپ یہ خبر سن کر چہک پڑے۔ حد ہوگئی۔ جیسی بیٹی ویسے باپ۔''



''دیکھو کلثوم بیگم! وہ وقت کو ضائع ہونے سے ہی تو بچا رہی ہے۔ کچھ کرنا چاہتی ہے وہ۔ اسے کرنے دیا جائے۔''

''یہ وقت اس کی شادی کروانے کا ہے افتخار میاں! ابھی گھر نہیں بسا تو کب بسے گا۔''

''دیکھو گھر جب بسنا ہوتا ہے تو بس جاتا ہے پھر ابھی بھی وہ گھر میں بسی ہوئی ہے۔ اپنے باپ کے گھر میں ہے، محفوظ ہے، خوش ہے۔'' وہ انہیں اطمینان دلانا چاہ رہے تھے۔

''محفوظ ہے مگر خوش نہیں ہے۔ ماں ہوں اس کی خوشی کو جانتی ہوں میں۔ یہ غیر ضروری کتابوں کے انبار یہ پڑھائیاں شڑھائیاں، یہ سب وہ خود کو بہلانے کے لیے کر رہی ہے۔ ٹائم پاس کرنے کے لیے کر رہی ہے۔''

''ویسے سوچا جائے تو ٹائم پاس کرنے کا انداز بھی اچھا ہے۔ ایک آپ کا صاحبزادہ ہے جو ٹائم

پاس کرنے کے لیے سڑکوں پر دھول اڑاتا ہے یا پھر کمپیوٹر سے لگا چپکا بیٹھا فلمیں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اچھی بھلی کام کی مشین ایجاد کی گئی تھی اسے بھی نرا ٹیلیوژن بنا لیا لوگوں نے۔'' وہ شوہر کو حیرت تو کبھی حسرت سے دیکھتی تھیں اور ابھی ان کے انداز میں صرف اور صرف بے بسی تھی۔

''مجھے لگتا ہے اماں بی سے ہی بات کرنی ہوگی۔ آپ سے بات کرنے کا بھی کوئی فائدہ نکلا ہے جواب نکلے گا۔'' تھک کر اٹھیں۔

''اچھا اب جا رہی ہو تو زمین کو کہنا ایک کپ چائے کا بنا دے۔'' وہ مزید خفا نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''کیا بھئی چائے پینے کا حق تو رکھتا ہوں نا؟''

''سارے حق بس آپ ہی کو حاصل ہیں۔ باقی تو سارے گھر میں یتیمی کی زندگی گزارنے والے ہوئے۔''

''نہیں بھئی تمہیں زیادہ حقوق حاصل ہیں، میں دن میں دو کپ پیتا ہوں۔ تم چار لسی کے گلاس پیتی ہو۔''

''وہ تو مجھے تیزابیت نے مجبور کیا ہے ورنہ پینے پلانے سے مجھے کتنی کوفت تھی یہ آپ کو بھی پتا ہے۔''

''دیکھو بھئی پینے پلانے کے پروگرام پر ہمارے مذہب نے ہی بینڈ لگایا ہوا ہے۔ ہم کیا کرسکتے ہیں۔'' مسکراہٹ دبالی گئی۔

''توبہ افتخار! توبہ ہے آپ سے۔ بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔ بھجواتی ہوں چائے میری بلا سے چھ کپ پیجیے گرمی میں۔ مجھے کیا۔''

جھلاتی ہوئیں کچن کی طرف جانے لگیں تو راستے میں ہی زمین سے ٹکراؤ ہوا۔

''ذرا دیکھ کر نہیں چل سکتیں؟'' وہ بڑبڑاتی ہوئی ابو جی ابو جی کرتی ہوئی کمرے تک آرہی تھی۔

ماں سے سوری کا لفظ بول کر کمرے کی راہ لی۔

''اے سن...... سن تو لے زمین!'' انہوں نے آواز دی مگر تب تک وہ اندر جا چکی تھی۔

''اب خود ہی کہہ دیں گے۔'' اطمینان سے کچن کی طرف آگئیں۔



وہ شام کا پہر تھا جب کلثوم بیگم نے بڑی ماں کے کان میں بینا کی شادی کی پریشانی کا سور پھونک دیا۔ بس پھر کیا تھا کہ انہوں نے رات بھی لوری لگائے رکھی تھی۔

''آجائے پہلے روزے کی افطار پر محمود کو کہتی ہوں اس بار حیدر آئے چھٹیوں میں تو کچھ نہیں دیکھنا کوئی مجبوری نہیں۔ بس شادی کر دینی ہے۔''

چاہے محمود سو مسائل کا رونا روئے مگر اس بار یہ طے کر کے چھوڑا کہ اپنی بات منوا کے دم لیں گی۔ یہاں تک بینا کا ایم فل میں داخلہ لینے کا ارادہ منسوخ کرایا۔

افتخار صاحب جو رمضان کے راشن کی لسٹ دیکھ کر برابر بے ہوش ہونے ہی والے تھے کہ انہیں ان کی پریشانی کی توپوں کا رخ بینا کی شادی کی طرف موڑ دیا۔ اب وہ تھے کہ جیب میں بجلی گیس کے بلز کی ناآسودہ پرچیاں، ہاتھ میں رمضان المبارک کے راشن کا احوال اور پھر محمود بھائی کے سامنے بینا کی شادی کا ذکر چھڑتے ہی بے چارگی کے عالم والی صورت کا خیال ہی انہیں ہولا دینے کو کافی تھا۔ صورت حال کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس سال محمود بھائی نے اپنی بڑی بیٹی عاقبہ کی شادی کی ہے۔ عاقبہ جو پینتیس کی ہو چکی تھی اب اس سال بھی نہ شادی کرتے تو کب کرتے، چھوٹے کے میڈیکل کی پڑھائی کے خرچے تھے اور سارا لوڈ حیدر پر تھا۔ اپنی مجبوری بھی نظر کے سامنے تھی مگر بڑے بھائی کے اور اپنے حالات بھی ڈھکے چھپے نہ

تھے۔

معلوم تھا کہ شادی بیاہ کے معاملات میں خرچے کس طرح منہ کھول کہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ایسے کہ اطمینان سے بیٹھنے تک نہیں دیتے۔

محمود بڑے بھائی تھے جن کے چار بچے تھے سب سے بڑی عقیلہ جس کی شادی کم عمری میں کردی گئی تھی کہ رشتہ اچھا تھا۔کم عمری میں ہی عقیلہ نے سسرال کی زیادتیوں کے دکھ اٹھائے۔کئی بار مار کھا کھا کر میکے آبیٹھتی۔شوہر مزاج کا تیز۔کانوں کا کچا۔مجال ہے جو کبھی سن سمجھ لے۔جب بولتا تو چپ ہونے کا نام نہیں لیتا اور جب دھاڑتا تو کوئی بول نہ سکتا۔ہائے مجبوری کہ مشرقی لڑکی کو ہر حال میں گھر بسانا ہوتا ہے۔عقیلہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔پچیس کی عمر میں تین بچے گود میں اٹھائے وہ چالیس کی لگتی تھی۔دوسری عاقبہ جسے کم عمری میں بیاہنے کے ڈر سے بٹھایا تو عمر چڑھ گئی۔ایک چھوٹا تھا جسے پڑھنے کا شوق تھا اور ایک حیدر تھا جو دو بہنوں سے چھوٹا اور چھوٹے سے بڑا تھا۔

اماں ابا کی ساری امیدیں حیدر کے ساتھ بندھی تھیں۔

حیدر کو ملازمت نہ ملی البتہ ایک دوست کی مہربانی سے دبئی جاب کا چانس نکل آیا۔

وہ نکل گیا۔چار سال ہوئے تھے اسے وہاں گئے۔چار سالوں میں ایسے لگتا جیسے وہ چودہ سال کا عرصہ بتا آیا ہو۔ڈیوٹی نائٹ تھی۔آرام نامکمل مگر کیا کرتا کہ اپنے ملک میں نوکری کی آس میں روز دھکے کھانے کے بجائے اس نے غیر ملکی صعوبتوں کو ترجیح دی تھی۔

محمود صاحب ریٹائرڈ ہوچکے تھے۔پینشن سے بیوی کو حج کرایا،بیٹی کی شادی کی اور کچھ زیور جوڑا باقی کی تمام تیاریاں رہتی تھیں۔خود افتخار صاحب جو بڑی بیٹی کو ٹھیک وقت پر بیاہنے کے حق میں تھے مگر بھائی کے حالات اپنے گھر کے اخراجات اور مسائل دیکھ کر ہراساں ہوجاتے تھے۔بیٹا غیر ذمہ دار نہ مزاج کا جو زمین سے بھی چھوٹا تھا اور زیر تعلیم تھا۔زمین نے کالج مکمل کیا تھا اور بینا کو ماسٹرز کیے دو سال ہوگئے تھے۔

اب اس سے پہلے کے تیس لگتے کلثوم بیگم چاہتی تھیں شادی ہوجائے اور افتخار صاحب چاہ رہے تھے حالات مزید کچھ سازگار ہوں تو بیٹی کو اچھے سے رخصت کریں تب تک وہ مزید پڑھنا چاہتی ہے تو پڑھ لے۔

اور ابھی جو بڑی اماں کو بینا کی شادی کا بھوت چڑھا تو توجہ ہٹانے کے لیے وہ انہیں پھر سے چند دن میں آنے والے ماہ مبارک کی ترجیحات کی طرف لے آئے۔چند گھنٹوں بعد وہ راشن کی لسٹ میں سے چاہتے ہوئے بھی کوئی چیز ہٹا نہ سکیں کہ بچوں کی الگ فرمائشیں ہوتی ہیں۔۔اور دینے دلانے کا من بھی اسی مہینے میں چاہتا ہے۔مسجد میں کھانا بھیجنا پڑتا ہے۔بزرگوں کے ایصال ثواب کا جوش بھی پرزور ہوتا ہے تو خوش خوراکی کے سارے ریکارڈ توڑنے پر برکت کا گماں بھی یقین کی طرح برستا ہے جو بہت حد تک درست بھی تھا مگر……جیب……جس پر دباؤ پڑتا تو لگتا کہ دل پر ہے۔



اور بڑی ماں نے ایمان کی کہانی سناتے ہوئے ہدایت کی کہ دل بڑا رکھو۔دل اگر کشادہ ہو تو سب بھلا ہوتا ہے۔دل اگر کینہ پرور ہے۔تنگ ہوجائے تو رزق بھی تنگ ہوجاتا ہے پھر دل رزق تنگ ہوجانے کا خوف ہی ایسا تھا جو پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکائے یا رہنے دے مگر دل کو ضرور ہولا دیتا ہے سو دل بڑا رکھنے کی تجویز قدرے مناسب تھی۔موافق چاہے نہ ہوتی۔

☆☆☆

"رمضان کا چاند نظر آگیا مگر تمہارا چاند کب نظر آئے گا؟" یہ زمین نے بینا کے کان کے قریب سرگوشی کی تو وہ چاند دیکھ کر دعا مانگتے ہوئے رکی تھی لمحے کو۔پھر کچھ سوچ کر چہرے پر بے دلی سے ہاتھ پھیرا اور نیچے سیڑھیا اترتی چلی گئی۔زمین کو لگا جیسے وہ امید کھو چکی ہو۔ابھی کل ہی تو بے ساختہ اس کے منہ سے شکوہ نکلا تھا کہ "جب لینڈ لائن کا بھاری بھرکم بل آنے کے باوجود حیدر دو منٹ بات کرکے خیریت پوچھ لیتے تھے اور اب جدید سہولیات ہونے کے باوجود ان کے پاس مہینوں وقت نہیں ہوتا ہے پوچھیں یا پھر سوچیں کہ ایک بینا بھی ہے۔"

وہی جو اس کی بچپن کی دوست تھی۔وہی جو دو سال۔عمر میں چھوٹی ہونے کی بنا پر اس سے بہت زیادہ ڈانٹ کھا جاتی تھی۔وہی جس پر وہ اکثر رعب جھاڑتا تھا۔

اور پھر وہی اس کی زندگی سے منسوب کی گئی تو نثار ہونے لگا' خواب دیکھنے اور دکھانے لگا اور یہ وہی حیدر تھا جو سال میں ایک بار چھٹی پر آتا تو باقی افراد کی طرح ہی گھر آکر مختصر سا حال پوچھ لینے کے بعد کھسک لیتا۔اسے لگا تھک گیا ہے۔

"حیدر تھک گیا ہے" اور اسی رات اس نے اپنی ڈائری کے پہلے صفحے پر لکھا کہ حیدر تھک گیا ہے۔

☆☆☆

پہلا روزہ تھا۔

خوب رونق لگی ہوئی تھی پہلے روزے پر افطاری کا اہتمام بڑی ماں گھر پر رکھتی تھیں اپنے بیٹوں اور بیٹی کے لیے بیٹی اپنی فیملی سمیت بڑا بیٹا محمود بیٹے اور بیگم سمیت آیا ہوا تھا۔دو کزنز تھے۔ایک پڑوس کی شبو تھی اور ایک پرانے محلے والی خالہ زیتون بہو کے ساتھ آئی تھیں۔زمین کی سہیلیاں تھیں اور بینا کی ایک یونیورسٹی کی دوست امجد کے دوست بھی مدعو تھے۔

مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ دسترخوان لگایا گیا تھا۔افطاری کے بعد امجد دوستوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔بینا اور زمین چھت پر تھیں۔بڑی ماں نے گھر کے بڑوں کو بڑے کمرے میں جمع کیا ہوا تھا اور موضوع چھڑا بینا کی شادی کا۔محمود نے کئی مجبوریاں ایک ساتھ گنوادیں اور بیگم نے اخراجات کی تفصیل۔

ان کے تئیں اس سال بہرحال شادی ہونا ناممکن تھی اور بڑی ماں کی ضد جو حکم کی صورت اختیار کرگئی تھی۔کلثوم بیگم خاموشی سے کارروائی ملاحظہ کررہی تھیں اور افتخار صاحب پہلو بدلتے رہ گئے جبکہ محمود، بیگم سمیت غصے کو دباتے ہوئے برہمی لیے ہوئے اٹھے اور بغیر الوداعی کلمات کے دروازے کی راہ لی۔

کلثوم بیگم حیرت، بڑی ماں دکھ اور افتخار شرمندگی لیے ہوئے انہیں اس طرح بے مروتی سے جاتا ہوئے دیکھتے رہ گئے۔خیال تھا کہ اب پورا مہینہ انہوں نے پلٹ کر خبر تک نہیں لینی۔

افتخار سوچ رہے تھے کہ حیدر آجاتا تو اس سے بات کرکے دیکھتے۔یہ بات کچھ جلدی ہوگئی۔کلثوم بیگم کو گھورنے لگے تو وہ اپنا آپ بچاتی کچن سمیٹنے نکل گئیں۔

جبکہ بڑی بی ایک دکھ کی کیفیت میں یک ٹک بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں اس افسوس میں کہ……محمود میرے ساتھ تو اس طرح بات نہیں کرتا تھا۔یہ اسے کیا ہوگیا۔

بھلے مہینے کی پہلی تاریخ کو اکڑ دکھا کہ چلا گیا۔ابتدا ہی پڑی۔کم از کم تحمل سے کام لیتا۔ایسی بھی کیا مصیبت تھی۔ایک شادی کی بات ہی تو تھی۔رشتہ لیتے وقت ماں جی کے پاؤں دباتے ہوئے نہ تھکتا اور اب جب فرض کی بات آئی تو منہ سجالیا۔یہ لو۔جب بھی بات کرو تو اس کا یہی پینترا ہوتا ہے۔وہ برہم تھیں، دکھی تھیں۔

افتخار نے ان کی دل جوئی کے لیے رمضان کی نشریات لگادی۔

"اے لو یہ رمضان کی نشریات ہے؟ نہ کلام پاک کا ورد۔نہ تفسیر و تجوید……یہ تو افراد گیم شو کھیلتے ہوئے بندروں کی طرح ناچ رہے ہیں۔"

"اماں جی! یہ تو بس ہلا گلا ہے۔"

"اے چھوڑ میاں! اس ہلے گلے کو خدا کو یاد

کر۔ اٹھ جا کہ مصلا بچھا۔ یہی تو مہینہ ہے برکتیں لوٹنے کا۔ اللہ کو راضی کرنے کا۔ بھلے گلے کے لیے تو سال بھر پڑا ہے۔" گھٹنوں پر زور دے کر اٹھیں اور جائے نماز لے کر تخت پر بیٹھ گئیں اور افتخار صاحب نے مسجد کی راہ لی۔

☆☆☆

"پہلے تو ایسا وقت نہیں تھا۔ رشتوں کو ایک دوسرے کی پروا ہوتی تھی۔ حیدر کو آئے ہفتہ گزر گیا ہے خبر تک نہیں لی۔ سلام تک کرنے نہیں آیا۔"

بڑی ماں کو فکر تھی، شکوہ تھا۔

"ہم بھی تو حیدر بھائی سے ملنے کے لیے جاتے ہیں۔ ہم بھی تو اس بار نہیں ملے۔" زرمین نے دھیان دلایا تھا۔ افتخار نے اس کی بات پر غور کیا تھا۔ کلثوم بیگم نے نخوت سے رخ پھیر لیا۔

"ایسے رشتے دار و لیے رشتہ دار سنا کر۔"

بڑی ماں کا دکھ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا اور دوسری طرف بینا کی خاموشی تھی۔ سترہ روزے چپ چاپ جیسے گزر گئے تھے۔ آج افطار پر بھی اسجد نے منہ بنایا مینو دیکھ کر۔

"رمضان میں تو یہ دال ساگ مت پکایا کرو تم لوگ اور یہ آلو کے سموسے ابو اسی جگہ سے لاتے ہیں روزانہ۔ لگتا ہے باسی بیچتا ہے۔" وہ ہر ایک چیز کو اٹھا اٹھا کر چیک کر رہا تھا۔

"دہی کا رائتہ اس قدر پتلا۔" "روز تو اچھا ہوتا ہے اسجد آج ہو گیا ایسا۔" زرمین نے ٹوکا تھا۔

"سارے اتفاق آج ہی ہونے تھے۔" وہ شربت پی کر خوان سے اٹھ گیا۔

"شربت تو ٹھیک بنا تھا یا وہ بھی پھیکا تھا؟" یہ زرمین ہی ہو سکتی تھی۔

"میٹھا تھا۔ ضرورت سے زیادہ۔" یہ اسجد ہی تھا۔

"میاں تراویح کے لیے آج تکلیف ضرور کیجیے گا۔ کل بھی نماز کے وقت آپ کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔" افتخار صاحب مغرب پڑھ کر ابھی کمرے سے نکلے تھے۔

وہ نماز کے بعد ہی بھرپور افطاری کرتے تھے اذان کے وقت صرف پانی کے دو گھونٹ پی کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

"آ جاؤں گا ابا جان!" اسجد منہ بنا کر کمرے میں گھس گیا۔

کلثوم فکر میں گھل گئی تھیں، اٹھ گئیں۔ اس کے لیے کچھ اور بنانے چلیں اور بینا اور زرمین نے کچھ دیر میں خوان سمیٹا۔ بڑی ماں تخت پر بیٹھی تسبیح کرتے ہوئے جانے کن سوچوں میں گم تھیں۔

یہی کہ پہلے جو برکت ماہ مبارک کا خاصہ تھی۔ وہ کہیں روٹھ کر چلی گئی یا ہم نے گنوائی؟ پہلے جو رشتوں میں صلح جوئی کا سلسلہ تھا وہ جذبہ مفقود ہو گیا یا کہ بجھا ہوا ہے؟ پہلے جو تعلقات میں تحمل تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر اٹھتے تھے تب بھی دل کشادہ ہوتے تھے۔ اب آدھا خوان بھرا ہونے کے باوجود بھی شکم سیر نہیں ہوتا۔ دل مطمئن نہیں ہوتا۔ نیت بھر جاتی ہے مگر لقمے کی تاثیر نہیں ہوتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے وقت ناراض کھڑا ہو۔ مسائل کا انبار ہے کہ گھٹتا ہی نہیں۔ دعائیں ہوتی ہیں کہ قبولیت کے زمرے میں نہیں آتیں۔ نتائج سالوں کا سفر کرتے ہیں اور اگر پھر کچھ مل بھی جائے تو وہ خوشی نہیں مل پاتی۔

وہی خوشی جو وہ بینا کے چہرے پر دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ افتخار کو یہ تک نہ کہہ سکیں کہ حیدر کو کان سے پکڑ کر لا۔ وہ مان جو بڑوں کو اپنے بچوں پر ہوتا تھا کہ جو سلوک بھی ہوگا بچے اف تک نہیں کریں گے۔ سر جھکا کے سنیں گے۔

حالات کی ستم ظریفی کہیے یا اعتماد کی خودسری یا پھر لاپروائی کہ بچے سننے کے بجائے سنا جاتے ہیں۔

کبھی بھی کوئی بچہ اٹھ کر دلائل کے زور پر بڑوں کے نظریات فہم و فراست کی وہ لگا جاتا ہے کہ لحاظ نام کی چیز ہی نہیں رہتی۔ وہ ڈرا نہیں حیدر کے سامنے نہیں لا پا رہا تھا۔

دوسری طرف محمود کی بے مروتی آڑے تھی۔ تیسری بھی بینا کی خاموشی تھی اور چوتھی وہ خود تھیں۔ تسبیح پھیرتی ہوئیں، سوچوں کو سلجھانے کی کوشش میں الجھتی ہوئیں کہ جب تک مسائل نہیں سلجھتے سوچ کیسے سلجھے گی۔

کیا توبہ کے دروازے بند تو نہیں ہو گئے؟ کل ہی تو کام والی ماسی نے بھی کہا تھا کہ بڑی اماں دعا کرنا اس رمضان ہم بخشے جائیں۔ کتنی بڑی بات کر گئی تھی وہ۔

تب وہ تھکی تھیں اور اب سجدہ ریز ہو گئیں۔

یہ وہ مسائل تھے جن کا حل انہیں نہیں سوجھ رہا تھا۔ یہ وہ مسائل تھے جو شدت کا روپ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ سروں پر بیٹھ کر ناچنے لگے تھے اور سکوں کا سکہ اچھلتا ہی نہیں تھا۔ تہ در تہ گرتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

بینا نے بڑے حوصلے کا فیصلہ کیا تھا سب ہی کو حیران کر دیا۔ خدا جانے حیدر سے اس کی کیا بات ہوئی تھی کہ حیدر نے جہیز لینے سے انکار کر دیا اور بینا نے شرط ڈال دی کہ شادی نہایت سادگی سے ہونی چاہیے۔ بڑوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ پہلے روایات پھر اعتراض بالآخر سوچ میں پڑ گئے۔

بے طرح کے اخراجات کے پیچھے آخر کب تک شادی رکی رہے گی اور خرچ اور آمدنی کے تخمینہ کو درست کرنے کے لیے انسان کتنے سال دن رات کر کے کمائے گا۔ بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ عید کی شام سادگی سے نکاح ہوگا اگلے دن ولیمہ کی تقریب میں چند محلے والوں اور دوستوں کو مدعو کیا جائے گا۔

ہلکی پھلکی جو تیاریاں تھیں وہ چھڑ گئی تھیں۔ بڑی بی کو مہینوں بعد چین کی نیند آئی تھی اور محسوس ہوا جیسے دعائیں قبول ہو گئی ہوں۔ یہ سب بھلے مہینے کی برکت تھی یا پھر رشتوں میں لوٹتی ہوئی صلح جوئی یا پھر ایمان کا قرار تھا کہ سب کچھ بھلا معلوم ہونے لگا تھا۔ چاند رات نماز کے بعد بینا کی چار سہیلیوں نے مل کر خوب رونق لگائی۔ گانا بجانا کیا۔

پڑوس کی شبو سمیت چند خواتین بغیر کسی کھانے پینے کی دعوت کے، بس اپنائیت جتانے آ گئیں۔ افتخار صاحب مٹھائی لے آئے۔ کلثوم بیگم کو جو ملال تھا کہ بیٹی گھر سے خاموشی میں رخصت ہوگی۔ وہ جاتا رہا۔

صبح عید تھی اور نکاح کی تقریب تھی۔ زرمین نے کہا۔ "لو تمہارا چاند بھی نظر آ ہی گیا۔" بینا اور کلثوم کے چہرے پر بڑی آسودگی تھی۔ افتخار صاحب کے چہرے پر اطمینان اور زرمین تو چہکتی پھرتی تھی۔ اسجد نے بھی چھوٹی موٹی تیاریوں میں ہاتھ بٹایا ہوا تھا۔

اور بڑی ماں نے آج بھی ایک لمبا سجدہ ادا کیا۔ وہ سجدہ جسے شکر کا سجدہ کہتے ہیں۔ جو بھلے مہینے کا درس تھا۔ صبر اور شکر۔ آج لقمے میں بڑی تاثیر تھی۔ وہ تاثیر جو دلوں میں خدا کی نعمتوں کے اقرار میں ابھرتی ہے تو ذائقہ بھی دو چند ہو جاتا ہے اور شکم بھی سیر ہونے لگتا ہے۔

☆☆

فصل غم کا گوشوارہ

رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

میں ہاری پیا

نفیسہ سعید

اس نے تیار ہو کر اچھی طرح آئینہ میں اپنا جائزہ لیا، گلابی لپ اسٹک ہونٹوں پر جچی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ راشیل نے ایک بار پھر غور سے آئینہ دیکھا اور دھیمی آواز میں بڑبڑائی۔

"اتنی ہلکی سی لگائی تھی پھر بھی ہونٹوں پر جچی منحوس صاف دکھائی دے رہی تھی اور ابھی باہر نکلتے ہی اماں کی عقاب جیسی نگاہوں کی زد میں آجانی ہے پھر سمجھو خیر نہیں۔"

مسلسل بڑبڑاتے ہوئے اس نے قریب رکھے باکس سے ٹشو پیپر کھینچا جیسے اپنے ہونٹوں پر رگڑ کر لپ اسٹک کے رنگ کو ہلکا ہی کیا تھا کہ باہر سے آتی اماں کی تیز آواز نے اسے ہلا دیا۔

"پومی...... اے پومی! جلدی آجا تیری وین آنے والی ہے۔"

"حد ہے...... اماں کو جتنا مرضی سمجھا لو انہوں نے مجھے پومی کہنے سے باز نہیں آنا۔" غصے میں بڑبڑاتی راشیل نے بستر پر رکھی اپنی سفید چادر اچھی طرح اوڑھی، بیڈ پر رکھا بڑا سا بیگ اپنے کندھے پر ڈالا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی، اماں سامنے ہی لاؤنج میں کھڑی تھیں۔

"میں نے تیرے لیے انڈا ابال دیا ہے، جلدی سے کھالے ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"افوہ اماں! یہاں کون سا کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے جو انڈا جم جائے گا۔"

چادر کو تھوڑا سا ترچھا کر کے مزید چہرے کو چھپایا اور جلدی سے انڈا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا، مبادا اماں کی عقابی نگاہ اس کے چہرے پر نہ پڑ جائے، وہ تو شکر ہے انڈا زیادہ گرم نہ تھا ورنہ تو سمجھو آج اس کی زبان نے جل کر تالو سے ہی لگ جانا تھا۔ یہ ہی سوچتی وہ برآمدے کا دروازہ کھولے باہر صحن میں آگئی اور کافی دیر سے رکا اپنا سانس بحال ہی کیا تھا کہ بے اختیار نگاہ اوپر سے آتے ماہیر پر پڑی جو راشیل کو دیکھتے ہی آخری سیڑھی پر رک گیا تھا، پھر اس نے ایک سرسری سے نظر میں راشیل کا سر تا پاؤں جائزہ لیا۔

"یہ آج تمہارے کالج میں کوئی فنکشن ہے؟"

سوالیہ انداز لیے وہ راشیل سے جواب طلب تھا جو ماہیر کی بات سنتے ہی گھبرا گئی اور جلدی سے اپنی چادر اچھی طرح درست کرتے ہوئے حیرت سے بولی۔

"آپ سے کس نے کہا؟"

"تمہارے ہاتھوں پر لگے لال پینٹ کو دیکھ کر تو ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔" اس کا اشارہ غالباً راشیل کی لال نیل پالش کی جانب تھا۔

"نیا رنگ خریدا تھا، رات لگا کر چیک کر رہی تھی صبح اتارنا بھول گئی۔"

جلدی سے جواب دے کر وہ باہر کی جانب لپکی مبادا ماہیر کی تفتیشی نگاہ کی زد میں اس کی لپ اسٹک اور آنکھ کا کاجل نہ آجائے ورنہ سمجھو خیر نہ تھی۔

"ایک منٹ رکو۔" ابھی اس نے ایک ہی پاؤں گیٹ سے باہر نکالا تھا کہ پیچھے سے سنائی دیتی ماہیر کی آواز نے جیسے اس کا سانس بھی بند کر دیا۔

"اب کیا مصیبت ہوگئی۔" وہ ہولے سے بڑبڑائی۔

"میں تمہارے کالج کی طرف ہی جا رہا ہوں، آجاؤ تمہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔" اسے فراخ دلی سے آفر کرتا وہ اپنی موٹر سائیکل کی جانب بڑھا ہی تھا کہ باہر سے آتے وین کے تیز ہارن کی آواز نے جیسے راشیل کے تن مردہ میں جان ڈال دی اور پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"میری وین آگئی ہے۔" اور پھر ماہیر کے جواب کا انتظار کیے بنا بیرونی گیٹ عبور کر کے باہر نکل آئی اور تیزی سے وین میں سوار ہوتے سمے اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ماہیر موٹر سائیکل لے کر اس کے پیچھے نہیں آگیا۔

☆☆☆

پچھلے دو ماہ سے لگاتار کالی گاڑی والا خوب صورت نوجوان ان کی وین کا پیچھا کر رہا تھا، جسے شروع شروع میں تو وہ یکسر نظر انداز کرتی رہی کہ



جانے کون ہے؟ اور کس کے پیچھے آرہا ہے؟ آخر وین میں اتنی لڑکیاں ہیں مگر ایک ماہ گزرنے کے بعد اسے اندازہ ہوا وہ گاڑی والا کسی اور کے نہیں بلکہ خود راشیل ہی کے پیچھے آرہا ہے۔ جس کی تصدیق کچھ اس طرح ہوئی کہ جیسے ہی وہ وین سے اترتی وہ بھی سائڈ سے گاڑی نکال کر آگے بڑھ جاتا پھر رابی نے بھی بتایا کہ تمہارا گھر آتے ہی یہ لفنگا بھی غائب ہوجاتا ہے اور صبح تو یہ تمہاری گلی کے کونے سے ہی ہماری وین کے پیچھے لگتا ہے۔

اور پھر اس دن تو کمال ہوگیا جب وہ پورے ایک ہفتہ کی چھٹی کے بعد کالج گئی تو واپسی میں گیٹ سے باہر نکلتے ہی بے اختیار نگاہ سامنے کھڑی بلیک کرولا پر پڑی، جسے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی کیونکہ گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا یقیناً وہ لفنگا ہی تھا جو روزان کی وین کا تعاقب کرتا۔ راشیل گاڑی میں بیٹھا تو اسے روز ہی دیکھتی تھی مگر آج اس طرح سامنے کھڑا پہلی بار دیکھا اور پہلی نظر میں ہی جیسے وہ اس کے دل میں اتر گیا۔ خوب صورت، اونچا، لمبا نوجوان آنکھوں پر کالا چشمہ لگائے اسے ہی دیکھ رہا تھا راشیل کا دل ایسے دھڑکنے لگا جیسے ابھی سینہ کی دیوار توڑ کو باہر نکل آئے گا بنا کسی سبب کے ہی وہ پسینہ پسینہ ہوگئی، گھبرا کر یہاں وہاں نظر دوڑائی کالج وین خاصی دور ایک درخت کے سائے میں کھڑی تھی جس تک پہنچنے کے لیے اس نوجوان کے پاس سے گزرے بنا کوئی چارہ نہ تھا، مرتی کیا نہ کرتی۔ خاموشی سے روڈ کراس کیا، جیسے ہی وہ اس کی گاڑی تک پہنچی وہ لفنگا کسی فلمی ہیرو کی طرح گلا کھنکارتا اس کے عین قریب آ کر آہستہ سے بولا۔

''ایکسکیوزمی۔'' راشیل تو یہ آواز سنتے ہی اچھل پڑی، اسے یقین ہی نہ آیا کہ سامنے کھڑا نوجوان اس سے مخاطب ہے۔

''نصیب دشمناں آج کافی دنوں بعد کالج آئی ہیں خیریت تو تھی۔''

سینے پر اپنے دونوں ہاتھ باندھے وہ اسی سے مخاطب تھا۔ راشیل نے چاہا کہ بنا کوئی جواب دیے اس کے قریب سے گزر جائے مگر نوجوان شاید اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا اس لیے ہلکا سا مسکرایا۔

''ریلیکس مس...... ڈریں مت میں کوئی آدم خور نہیں ہوں جو آپ جیسی خوب صورت لڑکی کو کھا جاؤں گا۔''

''پلیز آپ میرا راستہ چھوڑیں۔'' حلق میں آیا تھوک نگلتی وہ بہ مشکل بولی۔ راشیل کی بات سنتے ہی وہ خاموشی سے ایک طرف ہوگیا۔ وہ پچھلے ایک منٹ سے سڑک کنارے کھڑی ایک اجنبی سے باتیں کر رہی تھی، یہ خیال ہی خاصا دل لرزا دینے والا تھا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا۔ یہ ہی سوچتی وہ یک دم فٹ پاتھ پر چڑھ گئی تاکہ روڈ کراس کر کے سامنے کھڑی وین تک جاسکے صد شکر کہ وہ اس کا تعاقب کرتا ہوا وین تک نہیں آگیا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ وین میں داخل ہوگئی اور کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا نوجوان اپنی گاڑی میں واپس بیٹھ چکا تھا۔

راشیل نے ایک نظر کالج گیٹ پر ڈالی جہاں سفید یونیفارم میں ملبوس لڑکیاں باہر نکل رہی تھیں دل ہی دل میں ایک بار پھر سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کسی نے اسے سڑک کنارے اس لفنگے سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا ورنہ جانے کیا کیا کہانیاں بن جاتیں، جن کی وضاحت کرتے کرتے اس کا گریجویشن مکمل ہوجاتا مگر کوئی شاید اس کی بات پر یقین نہ کرتا کیونکہ اس دنیا میں ''یقین'' وہ واحد لفظ ہے جو بڑی مشکل سے حاصل کیا جاسکتا ہے جبکہ گنوانے میں منٹ نہیں لگتا۔

☆☆☆

یقیناً وہ کسی شہزادے سے کم نہ تھا جب سے اس نے راشیل سے بات کی تھی، وہ اسی اجنبی کے سپنوں میں گم تھی۔ پل پل اس کی گمبھیر آواز راشیل کے کانوں میں رس گھول کر اسے چونکا دیتی۔ آج پہلی بار اس پر انکشاف ہوا، کسی مرد کی آواز اتنی خوب صورت بھی ہوسکتی ہے مگر ابھی بھی وہ یہ نہ جان پائی تھی کہ وہ کون ہے؟ جاننا چاہتی تھی مگر انا آڑے آجاتی۔

بے شک وہ جب کالج سے باہر آتی وہ اسے سڑک کنارے کھڑا نظر آتا مگر راشیل کسی شہزادی کی مانند گردن اکڑائے اک شان بے نیازی سے اس کے پاس سے گزر جاتی حالانکہ اب وہ کالج آتے ہوئے اپنے چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ بھی کرنے لگی تھی تاکہ دیکھنے میں زیادہ خوب صورت نظر آئے اور اس کی وجہ یقیناً وہ نوجوان ہی تھا جو اس کے دل کی گہرائیوں میں بسا اک اجنبی ہی تھا۔ جس کا اسے نام بھی معلوم نہ تھا مگر دل...... ایسا بے ایمان جو ساری رات اس کے سپنے دیکھتا اور دن چڑھے اسے دیکھنے کی حسرت لیے کالج کے راستے پر رواں دواں ہوجاتا۔

دونوں طرف ایک ایسی محبت شروع ہوچکی تھی جو اپنے انجام سے بے پرواہ، اک دوسرے میں گم انجان منزلوں کی مسافر تھی ویسے بھی محبت کرنے والوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ وہ تو اندھیری راتوں کے مسافر ہوتے ہیں اور ایسی ہی اندھی رات کا یہ سفر راشیل کی زندگی میں بھی شروع ہونے والا تھا جس سے وہ بے خبر اپنے حال میں مست تھی اور بے شک انسان جب تک نہیں جانتا تب تک ایسے مست رہتا ہے۔

☆☆☆

شام کا جھٹپٹا اندھیرا ہر طرف پھیل رہا تھا جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو بے اختیار ہی نگاہ صحن میں رکھے مٹی کے خالی برتنوں پر پڑی۔ آگے بڑھ کر دیکھا باجرہ اور پانی دونوں نہ تھے، کبوتر پورے صحن میں یہاں وہاں چکراتے پھر رہے تھے، وہ پلٹ کر تیزی سے کچن میں آئی، کیبنٹ کھول کر دیکھا باجرے کا برتن خالی تھا۔ جگ میں پانی بھرا اور صحن میں رکھے خالی کٹوروں میں ڈالتے ہوئے اندر کمرے کی جانب بڑھی، اپنی دراز کھول کر پیسے نکالے، ابھی پرس میں رکھ رہی تھی کہ دروازہ کھول کر امی اندر داخل ہوئیں اور راشیل کو کہیں جانے کی تیاری کرتا دیکھ کر اپنی جگہ رک گئیں۔

''تم کہاں جارہی ہو؟''

''نکڑ والی دکان سے باجرہ لینے، ختم ہوگیا ہے۔''

''دماغ تو نہیں خراب ہوگیا، دیکھا نہیں مغرب ہونے والی ہے ایسے وقت دکان پر جانا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی ماہیر نے دیکھ لیا تو ناراض ہوگا۔'' امی نے آگے بڑھ کر اسے روکتے ہوئے کہا۔

''ارے امی! ہمارے گھر کوئی مرد نہیں ہے اور جہاں مرد نہ ہوں وہاں عورت ہی اپنے کام کے لیے گھر سے نکلتی ہے۔ آپ تو بلاوجہ ہی ڈرتی رہتی ہیں۔''

''کیوں تمہیں میں اور بابا مرد نظر نہیں آتے؟'' ماہیر کب کمرے میں آیا اسے پتا ہی نہ چلا، اب جو اس کی آواز سنی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ دروازے کے عین درمیان کھڑا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''میں اپنے گھر کی بات کر رہی تھی۔''

آہستہ سے جواب دے کر اس نے مٹھی میں دبے روپے واپس دراز میں رکھ دیے۔ جانتی تھی اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ ہی ہوا اگلے پانچ منٹ میں ہی ایک باجرے کا بھرا تھیلا ماہیر نے لاکر بڑی خاموشی سے اس کے حوالے کردیا۔

☆☆☆

ہلکی ہلکی بارش تو صبح سے ہی ہورہی تھی مگر جب وہ کالج سے باہر نکلی تو بارش میں خاصی تیزی آچکی تھی۔ شومئی قسمت آج رابی بھی نہیں آئی تھی اور اسے اکیلے ہی روڈ کراس کر کے سامنے کھڑی وین میں بیٹھنا تھا جس سے تھوڑا آگے بلیک کرولا لیے وہ اجنبی نوجوان اسے دور سے ہی دکھائی دے رہا تھا لیکن ظاہر ہے گھر جانے کے لیے وین تک جانا تو ضروری تھا۔ یہ ہی سوچتے ہوئے اس نے ہمت کی،

www.PakiBooks.Site

یونیفارم کی سفید چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور جیسے ہی روڈ کراس کرنے کے لیے قدم آگے بڑھایا، آہستہ آہستہ چلتی بلیک کرولا اس کے قریب آن رکی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ راشیل ڈر کر دو قدم پیچھے ہوگئی جب ڈرائیونگ سیٹ کا شیشہ نیچے کرتا نوجوان اس سے مخاطب ہوا۔

''آجائیں، میں آپ کو گھر چھوڑ دوں، بارش کافی تیز ہے۔''

''شکریہ میں چلی جاؤں گی ویسے بھی میں اکیلی نہیں ہوں۔ وین میں اور بھی لڑکیاں ہیں جنہیں میری طرح اپنے گھر جانا ہے۔'' جواب دے کر اس نے آگے بڑھنا چاہا جب وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتا ہوا عین اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''اور لڑکیاں میری ذمہ داری نہیں ہیں۔'' سینے پر دونوں ہاتھ باندھے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی ذمہ داری تو میں بھی نہیں ہوں۔'' بارش میں بھیگتی راشیل اسے دوبدو جواب دیتے ہوئے بولی، ویسے بھی اسے اس وقت اس طرح روڈ پر کھڑا ہونا ذرا اچھا نہ لگ رہا تھا۔

''اپنی اپنی سوچ کی بات ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میری ذمہ داری ہیں، اب آپ کیا سوچتی ہیں مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔''

بات کرتے ہوئے اس کے ماتھے پر ابھرنے والی ہلکی سی تیوری اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ اسے راشیل کا اس طرح جواب دینا قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

''بہرحال جیسے آپ کی مرضی......''

سنجیدگی سے کہتا وہ گاڑی کی جانب بڑھا ہی تھا کہ جانے راشیل کو کیا ہوا تیزی سے چلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور ساتھ ہی چلائی۔

''ایکسکیوزمی......سر!'' وہ رک گیا لیکن پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ ''سوری سر! آپ برا نہ مانیں۔''

''موسیٰ خان جمالی۔'' راشیل کے جملے کو کاٹتا وہ تیزی سے بولا۔ ''میرا نام ہے اور پلیز آپ مجھے سر مت کہیں۔''

''موسیٰ!'' راشیل نے دل ہی دل میں دہرایا، اتنا خوب صورت نام جسے دہراتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکن ایک دم ہی بڑھ گئی اور گالوں پر سرخی سی چھا گئی۔ سامنے کھڑا موسیٰ بڑی خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا ان دونوں کے درمیان کی یہ خاموشی روڈ پر جاتی کسی وین کے تیز ہارن نے توڑ دی، جس کی آواز نے ساکت کھڑی راشیل کو چونکا دیا۔

''میں چلتی ہوں۔'' وہ گھبرا کر واپس پلٹی۔

''اپنا نام تو بتا دو؟'' موسیٰ کی گنگناتی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

''راشیل نیازی۔'' نام بتا کر وہ رکی نہیں بلکہ تیزی سے فٹ پاتھ پر چڑھی اور دوڑتی ہوئی روڈ کے دوسری جانب پہنچ گئی جہاں وین اس کے انتظار میں کھڑی تھی بنا یہ پروا کیے کہ وین میں بیٹھی لڑکیاں اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہیں۔ وہ اندر داخل ہو کر خاموشی سے کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی تاکہ ساتھ چلتی گاڑی میں موجود موسیٰ کو دیکھ سکے جس کا دیدار اب شاید اس کے دل کی آس بن چکا تھا اور اپنی اس آس کو پورا کرنے کے لیے وہ اب کچھ بھی کر سکتی تھی بنا کسی کی پروا کیے۔ ابھی نیا نیا محبت کا خمار تھا جو اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لیے اسے دنیا جہاں سے بے خبر کر دینے کو تھا اور وہ بھی اس محبت کے سمندر میں ڈوبنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

☆☆☆

راشیل نے دیکھا امی جب سے بازار سے آئی تھیں کچھ پریشان تھیں بلکہ کافی گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھیں، ایک دو دفعہ اس نے پوچھا بھی مگر وہ شاید اپنے دل کی کوئی بات اسے نہیں بتانا چاہتی تھیں البتہ گھر کے دروازے کی کنڈیاں لگائے وہ ہر آہٹ پر چونک جاتیں اور جیسے ہی شام ہوئی زمان ماما کے گھر واپس آتے ہی امی بھی سیڑھیاں چڑھتی اوپر والے حصے میں چلی گئیں۔

کچھ دیر تو راشیل نے ان کی واپسی کا انتظار کیا پھر خود بھی نیچے کی تنہائی سے گھبرا کر اوپر آگئی تاکہ کچھ دیر مومنہ کے پاس بیٹھ کر دل بہلا سکے۔ مومنہ، ماہیر کی چھوٹی بہن اور زمان ماموں کی بیٹی تھی جو تقریباً راشیل ہی کی عمر کی تھی اور دونوں میں بچپن سے ہی خاصی دوستی تھی ابھی بھی وہ جب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو برآمدہ خالی تھا۔ امی شاید زمان ماموں کی اسٹڈی میں تھیں یہ ہی سوچتی وہ مومنہ کے کمرے کی جانب بڑھی، جب اسٹڈی سے آتی امی کی آواز سن کر اس کے قدم اپنی جگہ رک گئے۔

''نہیں لالا! مجھے پورا یقین ہے وہ وہی تھا میری آنکھیں اسے پہچاننے میں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔''

امی کی آواز میں موجود خوف نے راشیل کو کمرے میں ہونے والی گفتگو سننے پر مجبور کر دیا اور وہ اسٹڈی کے دروازے کی قریب جا کھڑی ہوئی۔

''اتنے سال بیت گئے آسیہ بی بی! وقت کی گرد نے ہر چیز دھندلا دی جس میں ہمارے تمہارے چہروں کے نقوش بھی چھپ گئے پھر کیسے تم نے اسے پہچان لیا۔'' ماما زمان دھیمی آواز میں بول رہے تھے، ان کی کوئی بات راشیل کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی جب اچانک اپنے کمرے کا دروازہ کھولتا ماہیر باہر نکل آیا اور راشیل کو دیکھتے ہی حیرت سے بولا۔

''یہ تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟''

راشیل گھبرا گئی جلدی سے پلٹ کر دیکھا اور بولی۔

''امی کو بلانے آئی تھی۔''

''ہاں تو کمرے میں جا کر بلا لو، باہر کھڑی چوروں کی طرح اندر کی گفتگو کیوں سن رہی ہو؟'' ماہیر کی کرخت آواز اس کی کانوں سے ٹکرائی۔

''توبہ ہے آواز ہے یا کوئی پھٹا ڈھول۔''

آہستہ سے کہتی وہ مومنہ کے کمرے کی جانب بڑھی، ساتھ ہی دل ہی دل میں اس نے ماہیر کی آواز کا مقابلہ موسیٰ کی آواز سے کیا اور ہنس دی۔

''کہاں اس کی خوب صورت آواز، نرم پانی کی پھواروں جیسی اور کہاں ماہیر کی آواز ایسے جیسے پہاڑوں پر برستی بارش۔'' پھر اپنی دی گئی تشبیہ پر خود کو ہی داد دی۔

''واہ راشیل بی بی لگتا ہے اردو لٹریچر پڑھنے کا فائدہ تمہیں پہنچ رہا ہے۔'' اور مسکراتی ہوئی مومنہ کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ اسی دوران وہ امی اور زمان ماما کے درمیان ہونے والی پراسرار گفتگو کو قطعی نظر انداز کر چکی تھی۔

☆☆☆

راشیل نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گرد ماں کے علاوہ صرف ایک ہی رشتہ دیکھا جو زمان ماما کا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب اس کے بابا ایک حادثہ کا شکار ہو کر یہ دنیا چھوڑ گئے، ماں کا کوئی سسرالی رشتہ تو شاید تھا نہیں اور نہ ہی کبھی راشیل نے کسی اپنے کو دیکھا البتہ بابا کی موت کے بعد زمان ماما اسے اور امی کو اپنے ساتھ دوسرے شہر لے آئے جہاں نور مامی نے ہمیشہ امی کو نند سے زیادہ بہن سمجھ کر ان کا ساتھ دیا اور اس طرح آسیہ کی جوانی اپنے بھائی کی چوکھٹ پر گزر گئی۔

ماہیر زمان ماما کا بڑا بیٹا جو راشیل اور مومنہ سے چار سال بڑا تھا لیکن محسوس ایسا ہوتا جیسے وہ ان سے کوئی چالیس سال بڑا ہو۔ سارا بچپن ان دونوں کا اس کی شیر جیسی نگاہوں کی گرفت میں رہ کر گزر گیا۔ اس کی اجازت کے بنا انہوں نے کبھی چھت کی منڈیر پر چڑھ کر یہاں وہاں نہ جھانکا کیونکہ یہ سب ماہیر کو پسند نہ تھا۔ گلیوں میں دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کا شوق بھی وہ کبھی پورا نہ کر سکیں بلکہ جب اور جو بھی کھیلنا ہوتا، اپنے گھر کے صحن میں ہی کھیلا جاتا۔

ماہیر نے کبھی راشیل اور مومنہ کے درمیان فرق نہیں رکھا، زمان ماما نے ان ماں بیٹیوں کو نیچے

PakiBooks.Site

[illegible] دیا تھا اس کے باوجود وہ ہر ماہ راحمن چچے نام پر امی کو معقول رقم دیتے جبکہ آسیہ خود بھی بہت اچھی سلائی کرتی تھی جس کے ذریعہ وہ اپنے اوپر کے اخراجات پورے کرلیتی۔

زندگی ایک پرسکون ندی کی مانند رواں دواں تھی کہ اچانک اتنے سالوں بعد آسیہ کی زندگی میں ایک ایسا پتھر گرا جس نے اس کے پورے وجود کو کسی ان دیکھے خوف میں مبتلا کردیا۔ ایک ایسا خوف جو وہ راشیل کو بھی نہ بتا سکتی تھی اور یہ ہی شاید اس کی زندگی کی ایک اور بڑی بھول تھی۔ جس کا احساس اسے آگے چل کر وقت نے دلا دیا اور وہ بھی اس وقت جب اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ بچا تھا مگر سچ یہ ہے کہ کوئی بھی انسان اپنے آنے والے وقت سے آگاہ نہیں ہوتا کیونکہ غیب کا علم صرف خدا کے پاس ہے اور اگر خدانا خواستہ یہ علم انسانوں کے پاس آجاتا تو یقیناً قبل از وقت پھیلنے والی تباہیوں کا شمار بھی ناممکن ہوتا۔

☆☆☆

وہ کمپیوٹر اسکرین پر جگمگاتی موسیٰ کی تصویر کو یک ٹک دیکھ رہی تھی یہ تصویر اس نے موسیٰ کی پروفائل سے نکالی تھی اور جب وہ کمرے میں تنہا ہوتی خاموشی سے کمپیوٹر آن کرتی اور موسیٰ کو ایسے دیکھتی جیسے وہ اس کے سامنے موجود ہو، پہروں اسے یوں ہی دیکھتے رہنا راشیل کا ایک ایسا پسندیدہ مشغلہ ٹھہرا جسے وہ بڑے شوق سے سرانجام دیا کرتی اور کوشش کرتی کہ امی جیسے ہی یہاں وہاں ہوں وہ فوراً اپنا کمپیوٹر آن کرکے موسیٰ کی تصویر دیکھے وہ نظروں ہی نظروں میں اسے اپنے دل میں اتارنے کا عمل اتنی عالم مدھوشی میں ادا کررہی تھی کہ کب مومنہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اسے پتا ہی نہیں چلا، چونکی اس وقت جب مومنہ کی تحیر زدہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”اوئے یہ ہینڈسم کون ہے؟“

راشیل جو تصویر دیکھتے ہوئے اپنے آپ مسکرا رہی تھی ایک دم گھبرا اٹھی اور مارے گھبراہٹ کے کمپیوٹر اسکرین بھی بند کرنا بھول گئی۔ مومنہ دھپ کرکے اس کے نزدیک آن بیٹھی اور مشکوک نظروں سے کمپیوٹر اسکرین کا جائزہ لیا جہاں سامنے ہی گھنی سیاہ مونچھوں والا موسیٰ مسکراتا انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

”تم نے بتایا نہیں کون ہیں یہ؟“ مومنہ نے پلٹ کر راشیل کو دیکھتے ہوئے اپنا سوال پھر سے دہرایا۔

”کوچنگ کے نئے سر ہیں۔“ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے راشیل نے جواب کے ساتھ ساتھ موسیٰ کی تصویر کو کراس کیا اور جھٹ سے اپنی پروفائل میں واپس آگئی۔ ساتھ ہی اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ بروقت مناسب جواب اس کے ذہن میں آگیا ورنہ مومنہ نے تو اس کا دماغ خراب کردینا تھا کیونکہ وہ ایسی ہی تھی اگر کسی بات کے پیچھے لگ جاتی تو پیچھا چھڑانا خاصا مشکل ہوجاتا۔ راشیل کے جواب نے اسے بالکل مطمئن کردیا اس لیے اپنی دونوں ٹانگیں بیڈ پر رکھتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔

”چلو...... جو بھی ہیں دفع کرو، اس وقت تو میں تمہیں ایک بڑی خاص خبر سنانے آئی ہوں، سنوگی تو تم بھی میری طرح خوشی سے ناچنے لگوگی۔“

”اللہ خیر، ایسا کیا ہوگیا جو آج ہمیں نچائے گا۔“

”ارے اچھے اچھے کپڑوں کی تیاری کرلو، ماہیر بھائی کی شادی ہونے والی ہے۔“ اپنے تئیں وہ بم دھماکا کرتے ہوئے بولی۔

”ارے واہ...... کب؟ کیسے اور کس سے؟“ مومنہ کی خبر نے اسے بھی خوش کردیا اور تصور ہی تصور میں وہ اپنے کپڑوں کے رنگ چنتے ہوئے بولی۔

”کب کا تو پتا نہیں۔“ مومنہ سوچتے ہوئے بولی۔

”کیسے؟ جیسے سب کی ہوتی ہے اور رہی بات کس سے تو ابھی لڑکی ملی نہیں ہے البتہ اماں ابا نے تلاش شروع کردی ہے تو امید ہے جلد ہی مل بھی جائے گی۔ ایک ایسی حسینہ جو ماہیر بھائی کی دلہن بن کر ہمارے گھر کو رونق بخشے گی، ذرا سوچو کتنا مزا آئے گا، ہے نا۔“ بات کے اختتام پر خوشی سے چہکتی مومنہ نے اس سے تصدیق چاہی۔

”بس اللہ کرے اب وہ لڑکی جلد مل جائے، [illegible]ے ہم اپنی بھابھی بنا سکیں۔“

مومنہ کے ساتھ ساتھ راشیل بھی بہت خوش تھی، شادی اور اس سلسلے میں بننے والے نئے کپڑوں کے تصور نے ہی اس کے چہرے کو خوشی سے گلنار کردیا تھا۔

☆☆☆

موسیٰ اور راشیل کے درمیان محبت کا کھیل آہستہ آہستہ شروع ہوگیا اور ایک اور ابن آدم نے حوا کی بیٹی کو اپنے محبت کے جال میں گھیر لیا تھا۔ ایک ایسے جال میں جو حوا کی بیٹی کو شروع میں اپنی زندگی محسوس ہوتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ اس میں اس طرح جکڑ جاتی ہے کہ اس جال سے نکلنے کو اپنی موت تصور کرتی ہے لیکن پھر بھی ایک وقت آتا ہے جب اسے جال سے نکلے بنا گزارہ نہیں ہوتا مگر ابھی وہ وقت بہت دور تھا ابھی تو محبت کا یہ جال راشیل کو اپنی زندگی محسوس ہورہا تھا اور جیسے جیسے وہ اس جال میں گھرتی جارہی تھی اسے زندگی اور رنگین لگنے لگی تھی۔

پہلے پہل جب اپنے قریب سے گزرتی، راشیل کو موسیٰ نے اپنا نمبر ایک کارڈ پر لکھ کر تھمایا تو مارے گھبراہٹ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بے ہوش ہوجائے گی مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا اور وہ۔ جس نے کارڈ لیتے سمے دل ہی دل میں عہد کیا تھا کہ وہ موسیٰ کو کبھی بھی کال یا میسج نہیں کرے گی۔ رات ہوتے ہی اپنا وعدہ خود ہی توڑ بیٹھی اور دماغ کے منع کرنے کے باوجود دل کے ہاتھوں کھیلتے ہوئے راشیل نے موسیٰ کو اپنے سیل سے میسج بھیج دیا جس میں وہ اپنا نام لکھنا نہ بھولی اور پھر یہ سلسلہ ایسا چلا کہ وہ اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات بھی موسیٰ سے ڈسکس کرنے لگی اور یہاں تک کہ وہ رات کو موسیٰ سے بات نہ کرتی، نیند کی دیوی اس سے روٹھی رہتی جسے منانے کے لیے موسیٰ کی خوب صورت آواز کا سننا شرط ٹھہرا، موسیٰ کی آواز، موسیٰ کا انداز گفتگو، موسیٰ کی محبت، غرض ہر چیز نے راشیل کے دل کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا اور وہ اس کی چاہت کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔

☆☆☆

آج کوئی تیسری لڑکی تھی جو اماں نے ماہیر کو دکھائی تھی، مگر جانے ایسا کیا تھا اسے کوئی لڑکی ہی پسند آکر نہ دے رہی تھی نہ ہی وہ یہ وضاحت کر پا رہا تھا کہ اسے کیسی لڑکی چاہیے کیونکہ بات وہ خود بھی نہ جانتا تھا اور اس کی اسی حرکت نے اماں کے ساتھ ساتھ بابا کو بھی پریشان کردیا تھا کیونکہ وہ دونوں چاہتے تھے کہ ماہیر کے سر پر جلد سہرا سجا دیکھ لیں لیکن ماہیر وہ جانے کیا چاہتا تھا یہ کسی کو علم میں نہیں تھا۔ ویسے بھی ماہیر ایک سنجیدہ مزاج نوجوان تھا، اپنی اوپر ایک ایسا خول چڑھائے رہتا جسے اتار کر اندر جھانکنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ابھی بھی جب وہ اماں کی دکھائی ہوئی لڑکی کی تصویر اندر اپنے بستر پر ہی چھوڑ کر باہر نکل آیا تو ان کی بڑبڑاہٹ نے صحن تک ماہیر کا پیچھا کیا۔

”پتا نہیں یہ لڑکا کیا چاہتا ہے، کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آرہی۔ اب ایسی حور کہاں سے لاؤں جو کھٹ کرکے اس کے دل میں اتر جائے۔“

ماں کی باتیں سن کر ماہیر کے سنجیدہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر گئی اور وہ یوں ہی بے دھیانی میں چلتا صحن کی منڈیر کے قریب آگیا۔ بے خیالی میں نیچے جھانکا سامنے ہی راشیل بیٹھی مومنہ کی کسی بات پر ہنس رہی تھی، اتنی خوب صورت ہنسی شاید ماہیر نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی یا پھر اس سے پہلے اس نے کبھی راشیل کو غور سے نہیں دیکھا تھا وہ راشیل کی ہنسی میں ایسا گم ہوا کہ کب مومنہ اوپر آئی اسے پتا ہی نہ چلا اور یقیناً وہ کافی دیر ایسے ہی کھڑا نیچے دیکھتا رہتا جہاں اب راشیل بھی موجود نہیں تھی اگر مومنہ آواز

دے کر اسے اپنی جانب متوجہ نہ کرتی۔

"بھائی کیا ہوا؟ ایسے کیوں کھڑے ہیں آپ؟"

شاید اس نے آگے بڑھ کر ماہیر کا کندھا بھی چھوا تھا وہ یک دم چونک گیا، پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ مومنہ حیرت سے اسے ہی دیکھ رہی تھی، اپنی سابقہ محویت کو یاد کرکے وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا۔

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی یہاں کھڑا تھا۔"

مومنہ کو کیا جواب دے ماہیر کی سمجھ میں نہ آیا۔ اسی لیے اپنی روایتی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے بولا تاکہ وہ مزید کوئی سوال نہ کرے اور یہ جواب دینے کی زحمت سے بچ جائے اور ایسا ہی ہوا مومنہ خاموشی سے کچن کی جانب بڑھ گئی جبکہ ماہیر اپنے دل میں ایک عجیب سی کسک لیے باہر صحن میں رکھی چارپائی پر ہی بیٹھ گیا، ایک ایسی کسک جو اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

شاید اس پر ہونے والا محبت کا حملہ تازہ تھا اس لیے فی الحال وہ بے خبر تھا، اپنے دل کی حالت کو سمجھ نہیں پارہا تھا۔ اس لیے خاموشی سے آنکھیں بند کرکے وہیں لیٹ گیا، جب یک دم ہی تصور میں ہنستا ہوا راشیل کا چہرہ اسے ایک بار پھر سے بے قرار کر گیا۔ وہ جتنا راشیل کے تصور کو اپنے دماغ سے جھٹک رہا تھا اتنا ہی وہ تصور کسی آکٹوپس کی طرح اس کے دماغ کو اپنے پنجوں میں جکڑے ہوئے تھے اور پھر اسے محسوس ہوا کہ راشیل کا یہ تصور اسے اچھا لگنے لگا ہے، کیوں؟ اس کا جواب جاننا ہی نہ چاہ رہا تھا اس لیے خاموشی سے اس تصور میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

جب سے تُو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے
سنگ ہر شخص نے، سنگ ہر شخص نے ہاتھوں
میں اٹھا رکھا ہے

عابدہ پروین کی مدھر آواز اس کے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی جس کے سحر میں جکڑی راشیل کو حیرت ہوئی۔ یہ غزل آج سے پہلے اسے کبھی اتنا اچھا نہ لگا تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی شوخ وشنگ گانے سننے کی عادی تھی، غزل تو کبھی اس کی چوائس ہی نہ تھی پھر آج کیسے اسے یہ غزل اتنی من کو بھائی کہ دل چاہا بار بار سنے اور سنتی ہی جائے۔ شاید دل پر برسنے والی پہلی محبت کی بارش اپنا اثر دکھا رہی تھی، دنیا حسین سے حسین تر ہوتی جارہی تھی۔

ان ہی خیالوں میں ڈوبی راشیل نے سامنے لگے آئینہ میں خود کا اچھی طرح جائزہ لیا، گندمی رنگت اور بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ اس میں کچھ ایسا خاص نہ تھا جو موسیٰ جیسے خوب صورت مرد کو اس کا دیوانہ بنا دیتا، پھر آخر اتنی لڑکیوں میں موسیٰ کو وہ ہی کیوں نظر آئی؟ شاید محبت کے تناور پودے نے موسیٰ جیسے خوبرو مرد کو اس کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا اور یقیناً ایسا ہی تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں غرق آئینہ دیکھ رہی تھی جب اچانک کمرے کا دروازہ کھول کر آسیہ اندر داخل ہوئی، اپنے عکس کے عین پیچھے راشیل کو اپنی خوب صورت ماں کا عکس نظر آیا جس کے سامنے وہ بالکل پھیکی پڑ گئی۔

سچ یہ تھا کہ آسیہ آج بھی بہت خوب صورت تھی، گوری چٹی، اونچی لمبی آسیہ کہیں سے بھی راشیل کی ماں نہ لگتی تھی۔ راشیل نے مسکرا کر اپنی ماں کو دیکھا اور پیچھے پلٹتے ہوئے بولی۔

"اماں آپ اتنی خوب صورت ہیں پھر میں آپ کے جیسی کیوں نہیں؟"

اس کا جملہ اتنا اچانک تھا کہ پہلے پہل تو آسیہ کی سمجھ میں نہ آیا جب سمجھی تو ہلکا سا مسکرا دی جس کے ساتھ ہی اسی کے گال پر پڑا ڈمپل مزید گہرا ہو گیا اور وہ بیٹی کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتی ہوئے بولی۔

"میرا بچہ، مجھ سے بھی زیادہ خوب صورت ہے، حسین، معصوم اور دل میں اتر جانے والا......"

"افوہ اماں آپ ماں کی نظر سے دیکھ رہی ہو جس کے لیے اپنی اولاد دنیا میں سب سے زیادہ حسین ہوتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ آپ اتنی خوب صورت ہیں کہ میں آپ کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ آپ کا حسن مجھے دھندلا دیتا ہے۔"

"تم بالکل اپنے باپ جیسی ہو، ایسا ہی تھا وہ تمہاری طرح، بڑی بڑی آنکھیں جو دیکھنے والے کے دل کے اندر تک اتر جائیں۔ تمہارے جیسی میٹھی زبان، جب بولتا تو دل چاہتا وہ بولتا رہے اور میں سنتی رہوں۔"

بیٹی کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی آسیہ ایک دم کہیں دور ماضی کی یادوں میں ڈوب گئی اور ان یادوں کے حسین لمحات اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر جھلملا گئے جسے دیکھتے ہی راشیل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا اور وہ تیزی سے ماں کی آنکھیں صاف کرکے ان کے گلے لگ گئی۔

"سوری اماں! میری باتوں نے آپ کو ہرٹ کیا۔"

"ارے نہیں بچہ! کبھی یادیں بھی کسی کو ہرٹ کرتی ہیں، یادیں تو ہوتی ہی اس لیے ہیں کہ ان میں کھو کر اپنے پیاروں کو نہ بھولا جاسکے۔ وہ پیارے جو پرائے دیس کے باسی ہو کر اپنا پیچھا بھول جاتے مگر انہیں یاد رکھنے والے ہمیشہ یوں ہی یادوں میں ہی یاد رکھتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی آسیہ کو بہت کچھ یاد آ گیا وہ سب جو وہ کبھی راشیل کو نہ بتا سکتی تھی سوائے چپکے چپکے رونے کے اور اس سے بھی مسکراتی آسیہ کا دل اندر سے قطرہ قطرہ ہو کے بہہ رہا تھا اور دل کے یہ آنسو باہر موجود کسی شخص کو دکھائی نہ دے رہے تھے یہاں تک کہ اس کی سگی اولاد بھی ماں کے ان دکھوں سے بے خبر تھی جو اس کے دل میں ڈیرہ ڈالے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

"میں تمہارے ساتھ ایک کپ چائے پینا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو تو......"

موسیٰ کے اس میسج نے اسے تھوڑی دیر کے لیے خوشیوں کی سمندر میں اتار دیا پھر فوراً ہی ذہن میں آنے والے بروقت جواب نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا اور راشیل نے جلدی جلدی میسج ٹائپ کرکے سینڈ کر دیا۔

"میں چائے نہیں پیتی۔"

"چلو پھر ساتھ کافی پی لیں گے۔"

"کہاں؟" سوال کرتے سمے وہ بھول گئی تھی کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہو گا کیونکہ موسیٰ کی محبت نے اسے خاصا دلیر بنا دیا تھا اب تو وہ باقاعدہ اپنے کالج بیگ میں میک اپ کا سامان رکھنے لگی تھی جو وین میں داخل ہوتے ہی دیدہ دلیری سے کرتی بنا یہ پروا کیے کہ لڑکیاں اس کے بارے میں باتیں بنائیں گی۔ ویسے بھی وین میں موجود اکثر لڑکیوں کے یہ چھوٹے چھوٹے مشغلے ہوتے جن سے وہ سب انجوائے کرتیں۔

"جہاں تم کہو۔" محبت پاش لہجہ میں ساری ذمہ داری اس پر ڈال دی گئی۔

"لیکن میں آپ کی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گی۔"

ابتدا کی جھجک اور احتیاطی تدابیر جو وقت کے ساتھ خود ہی ڈھے جاتی ہے اور یہ محبت کرنے والا ہر شخص جانتا ہے اور عقل مند وہ ہی ہوتا ہے جو اس سے بنا بحث کیے سامنے والے کی بات مان لے جیسے ابھی موسیٰ نے بنا چوں چرا اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی، میں آج کوچنگ کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔" جواب سنے بنا فون بند کر دیا گیا اور نشۂ محبت میں سرشار راشیل نے سامنے لگی وال کلاک پر ایک نظر ڈالی۔

دو گھنٹے باقی تھے اسے کوچنگ جانے میں، موسیٰ کے ساتھ بتائے جانے والے چند لمحات کے تصور سے ہی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ الماری کھول کر اس نے اپنا سب سے بہترین سوٹ نکالا اور پورے دو گھنٹے کی تیاری کے بعد جیسے ہی آئینہ دیکھا بے اختیار خود پر پیار آ گیا۔

"یہ محبت بھی کیا چیز ہے، جب ہو جائے تو

PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

انسان کو دنیا کی ہر شے سے محبت ہو جاتی ہے، سب اچھا لگنے لگتا ہے۔ بارش، ہوا، خوشبو کا تو شاید ہر شخص دیوانہ ہوتا ہے مگر یہ ظالم محبت تو طوفان سے بھی ہو جاتی ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹے بھی اچھے لگتے ہیں، محبت کا رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اترتے اترتے صدیاں بیت جاتی ہیں اور اکثر اوقات تو یہ قبر کی گہرائیوں میں بھی اس انسان کے ساتھ جاتا ہے جو اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے تو طے ہوا راشیل کا دل محبت کے رنگ میں رنگ گیا تھا اور محبت کی یہ خوشبو اس کے پورے وجود پر چھا کر اسے سرشار کر گئی تھی، محبت جیت گئی تھی اور وہ ہار گئی تھی اور اب یہ ہار ہی اس کی زندگی کا حاصل ٹھہری۔

☆☆☆

"دیکھو بیٹا! ایسے تو کام نہیں چلے گا، اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دو ورنہ جہاں میں کہوں وہاں خاموشی سے ہاں کر کے شادی کر لو۔"

دو ماہ کی انتھک محنت کے بعد نور تھک گئی تھیں، ہر بار ماہیر کا انکار کرنا انہیں پسند نہ آ رہا تھا آخر وہ بھی ایک عدد بیٹی کی ماں تھیں اس لیے جب وہ کسی کی ماں کی ان امیدوں کو اپنے انکار سے توڑتیں جو جانے انجانے میں اپنی بیٹی کے حوالے سے ماہیر کے خواب دیکھ لیتی تو خود بھی شرمندگی میں ڈوب جاتیں یہ ہی وجہ تھی جو آج انہوں نے ماہیر سے دو ٹوک بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔

"کیا بات ہے اماں! آج آپ اتنی خفا کیوں ہیں؟"

"بات خفگی کی نہیں ہے بیٹا! اصول کی ہے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ دوسروں کی بچیوں کو اس طرح رد کیے چلی جاؤں، اللہ ناراض ہوتا ہے۔"

"تو مت رد کریں۔" اطمینان سے جواب دیتا ماہیر ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ "ایک ہی دفعہ وہ لڑکی ڈھونڈ لیں جو آپ کے بیٹے کی پسند ہو۔"

نور نے دیکھا بیٹے کے چہرے پر محبت کا رنگ بکھرا نظر آ رہا تھا اور اسی رنگ کے زیر اثر ماہیر کے چہرے پر بلا کا سکون پھیلا ہوا تھا وہ مسکرا دیں۔

"لگتا ہے میرے بیٹے کو محبت ہو گئی ہے تو پھر جلدی سے مجھے اپنی پسند کا نام بتاؤ تاکہ ہم وہاں جا کر تمہارے رشتہ کی بات کر سکیں۔"

"محبت......" ماہیر نے دل ہی دل میں دہرایا۔

"محبت کا تو امی پتا نہیں البتہ آپ میرے لیے بی جی سے بات کریں۔"

بچپن سے ہی اپنے باپ کی دیکھا دیکھی ماہیر اور مومنہ، اپنی پھوپھی آسیہ کو بی جی ہی کہا کرتے تھے۔

"بی جی سے کیا بات کروں؟" نور کو حیرت ہوئی۔

"اُفوہ اماں میں بی جی آسیہ کی بات کر رہا ہوں آپ ان سے میرے رشتہ کی بات کر لیں۔" جھجکتے ہوئے ماہیر نے اپنی بات مکمل کی۔

"بی جی آسیہ سے......" نور نے دہرایا۔

"تمہارا مطلب ہے تم راشیل سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

بیٹے کی بات سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں، انہیں یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ ماہیر، راشیل سے شادی کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ ایک سنجیدہ مزاج کا نوجوان تھا جبکہ اس کے مقابلے میں راشیل تو خاصی شوخ و شنگ لڑکی تھی اور ماہیر کو تو ایسی لڑکیاں کبھی پسند ہی نہیں آتی تھیں۔

"ہاں اماں میں کوئی فارسی تھوڑا بول رہا ہوں سیدھی سادی اردو زبان میں اپنا مدعا بیان کیا ہے۔ آپ میرے رشتے کی بات بی جی سے کر لیں۔"

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! جس نے میری خواہش کو تمہارے دل میں محبت بنا کر اتار دیا۔ یہ تو میں خود چاہتی تھی کہ گھر کی بچی گھر میں ہی رہے لیکن تم سے ڈر کے ذکر نہ کرتی تھی، مبادا تم برا نہ مان جاؤ۔"

بیٹے کی خواہش نے نور کو خوشی سے سرشار کر دیا اور وہ ایک دم ہی کھل اٹھیں۔

PakiBooks.Site

"لیکن اماں! ایک بات کا خاص خیال رکھیں رشتہ طے کرتے وقت راشیل کی رضامندی بہت ضروری ہے اس لیے بی جی سے بات کرنے سے پہلے زیادہ اچھا ہو گا آپ راشیل سے بات کر لیں۔"

"ارے بیٹا! راشیل کو بھلا کیا انکار ہو گا، سیدھی سادی بچی ہے۔ رشتہ طے ہوتے ہی تم سے محبت کرنے لگے گی کیونکہ ہر عورت کی یہ فطرت ہے جس کے نصیب میں لکھ دی جائے اسے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔"

"میں ہر عورت کو تو نہیں جانتا البتہ راشیل کے لیے آپ کو ایک دفعہ پھر ضرور کہوں گا آپ پہلے اس سے بات کریں پھر بی جی آسیہ سے کوئی ذکر کریں کیونکہ میں نہیں چاہتا رشتہ طے کرتے سمے بی جی آسیہ بابا کی نیکیوں کا احسان اتارنے کے لیے راشیل سے کوئی زبردستی کریں۔ جو بھی ہے میں محبت اور رشتوں میں زبردستی کا قائل نہیں۔" ماہیر کی بات کسی حد تک درست تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! جیسی تمہاری مرضی، میں مومنہ کی ڈیوٹی لگاتی ہوں وہ راشیل کے دل کا حال جاننے کی کوشش کرے۔"

"جو آپ بہتر سمجھیں۔" اپنا مدعا ماں تک پہنچا کر ماہیر مطمئن ہو گیا۔ جانتا تھا کہ اس کی عقل مند ماں اس سلسلے میں اسے کبھی مایوس نہیں کرے گی۔

☆☆☆

ماہیر اسے کوچنگ کے باہر اتارتے ہی تیزی سے موٹر سائیکل لیے آگے بڑھ گیا۔ راشیل نے گردن گھما کر دیکھا کالی گاڑی روڈ کے دوسری جانب کھڑی تھی اور یہ وہ پہلا دن تھا جب ماہیر کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی راشیل نے اپنا رخ کالی گاڑی کی جانب موڑ لیا اور اک عالم مدہوشی میں چلتی وہ موسیٰ کے عین سامنے جا کھڑی جو اسے اپنی جانب آتا دیکھ کر پہلے ہی گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میرے سامنے ہو۔" گاڑی لاک کرتا موسیٰ محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا بولا جانے اس کی نظروں میں ایسا کیا تھا جس نے راشیل کو گونگا کر دیا اور وہ چاہ کر بھی کوئی جواب نہ دے سکی۔

"آؤ سامنے کیفے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

آہستہ سے اس کا ہاتھ تھامتا موسیٰ روڈ کے دوسری جانب بڑھ گیا جب راشیل نے عالم بے یقینی میں اپنے ہاتھ پر ایک نظر ڈالی جو موسیٰ کے گورے چٹے ہاتھ میں دبا بالکل ماند نظر آ رہا تھا۔ ایک پل میں ہی اسے اپنی قسمت پر رشک آ گیا کہاں موسیٰ اور کہاں وہ خود ایک عام سی لڑکی۔ جانے کیسے موسیٰ جیسے وجیہہ شخص کے دل میں اتر گئی اور پھر اس دن موسیٰ کے ساتھ کافی پیتی راشیل بھول گئی کہ وہ ایک اجنبی شخص کے ساتھ ہے۔

کہتے ہیں شرم و جھجک ایک ہی بار کی ہوتی ہے جو ختم ہو جائے تو بے جھجک آدمی بے خوف بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے آہستہ آہستہ راشیل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ موسیٰ کا پڑھایا جانے والا عشق کا سبق ایک ذہین طالبہ کی طرح رٹتی ہوئی وہ اپنا اقدار، روایات، شرم و حیا سب بالائے طاق رکھ چکی تھی اور شاید یہ ہی محبت تھی جو بھی تھا اس پہلی ملاقات نے راشیل کے دل میں ایک ایسی کسک پیدا کر دی کہ دل چاہا موسیٰ ایسے ہی اس کے سامنے بیٹھا رہے، بولتا رہے اور وہ خاموشی سے اسے تکتی رہی، سنتی رہے اور یوں ہی زندگی تمام ہو جائے۔ زندگی تو تمام نہ ہوئی البتہ کوچنگ کا وقت ختم ہو گیا اور ناچار راشیل کو موسیٰ کو چھوڑ کر کوچنگ کے گیٹ پر آنا پڑا تاکہ وہاں سے اپنے گھر جا سکے ورنہ اس کا بس چلتا تو آج وہ موسیٰ کے ساتھ اس کے گھر چلی جاتی مگر افسوس اکثر وہ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں اور پھر اپنی چاہ کی آس میں پل پل گن کر زندگی گزارنا اتنا اچھا لگتا ہے کہ انسان باقی سب بھول جاتا ہے، جیسے راشیل بھی بھول گئی اسے یاد رہا تو صرف موسیٰ جو اس کی دھڑکنوں میں آواز کی طرح بس گیا تھا۔

☆☆☆

مومنہ کو پہلے پہل تو یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ ماہیر کی خواہش کے مطابق راشیل جلد ہی اس کی بھابھی بننے والی ہے اور جب یقین آیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی، فوراً ہی ماں کو گلے لگالیا۔

''اُف اماں! آپ سوچ نہیں سکتیں کتنا مزا آئے گا جب راشیل میری بھابھی بن کر یہاں اوپر ہمارے ساتھ آجائے گی، واللہ دل خوش ہوگیا۔''

''ہاں بیٹا بات تو خوشی کی ہے مگر ماہیر یہ چاہتا ہے کہ تم اس سلسلے میں راشیل کی رائے جاننے کی کوشش کرو، آیا وہ کسی اور کو پسند تو نہیں کرتی کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ ہر کام راشیل کی مرضی کے عین مطابق ہو۔''

''ارے نہیں اس نے بھلا کس کو پسند کرنا ہے۔'' حالات سے بے خبر مومنہ نے انکار میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اور کوئی ہے ہی نہیں، جو راشیل کو پسند آئے اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتاتی، آپ جانتی ہیں نا وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی اسی لیے بہتر ہوگا آپ بی جی سے بات کرلیں۔''

نور نے دیکھا مومنہ بالکل مطمئن تھی اس کے چہرے پر پھیلا اطمینان نور کو بھی شانت کرگیا کیونکہ وہ نہیں جانتی تھیں کہ راشیل کے سلسلے میں لگائی جانے والی مومنہ کی قیاس آرائی بالکل غلط تھی اور جو مومنہ سمجھ رہی ہے ویسا بالکل بھی نہیں ہے شاید کچھ باتیں وقت کی گرفت میں ہوتی ہیں۔ جو آہستہ آہستہ ہم تک پہنچتی ہیں جیسے کہ راشیل کی پسند جو موئی تھا کسی کے علم میں نہ تھی کیونکہ اس بات کا علم ابھی صرف راشیل ہی کو تھا اور اس نے اپنے دل کی یہ پسند ساری دنیا سے چھپا کر رکھی تھی نہیں جانتی تھی کہ ایسی باتیں زیادہ عرصہ تک چھپ نہیں سکتیں۔

☆☆☆

ماہیر جب گھر سے نکلا تو آفس کے لیے پہلے ہی لیٹ ہوگیا تھا اوپر سے روڈ پر ٹریفک بھی اتنا جام تھا کہ لگتا تھا یہیں شام ہوجائے گی جبکہ آج اسے آفس بھی کچھ ضروری کام تھا جس کے لیے جلدی پہنچنا تھا۔ یہ ہی سوچ کر اس نے اپنی موٹر سائیکل اندر گلیوں میں ڈال دی اور پھر جلد ہی شاہراہ قائدین پر نکل آیا جہاں سے سیدھا جاتے ہوئے وہ نورانی کے سگنل پر کھڑا تھا جب سگنل توڑتی وہ کالی گاڑی تیزی سے اس کے پاس سے گزری، ماہیر نے ایک نظر گاڑی کے اندر جھانکا تو جیسے اپنی جگہ شاکڈ ہوگیا۔ فرنٹ سیٹ پر مسکراتی لڑکی اسے راشیل جیسی لگی لیکن یقین نہ آیا کہ وہ راشیل ہوسکتی ہے۔ بہر حال ایک الجھن میں گرفتار آفس پہنچ گیا۔ میٹنگ کے دوران سارا دھیان راشیل کی جانب رہا، فارغ ہوکر ٹائم دیکھا دو بج گئے تھے۔ عام طور پر راشیل اس وقت گھر آجاتی تھی، یہ ہی سوچ کر مومنہ کو فون ملایا، دوسری ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کرلی۔

''تم کالج سے گھر واپس آگئی ہو؟''

''نہیں بھائی! میں آج گھر میں ہی تھی، طبیعت خرابی کے باعث چھٹی کی ہے۔ خیر تو ہے آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

بہن تھی اتنی دور سے بھی بھائی کے لہجے میں موجود بے قراری بھانپ گئی، اس لیے جلدی سے بول اٹھی۔

''راشیل آگئی ہے؟ مجھے دیکھ کر بتاؤ۔''

بہن کی بات کا جواب دیے بنا ماہیر نے اگلا سوال داغا، جسے سنتے ہی مومنہ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

''اوہ تو یہ بات ہے، بھائی کو راشیل کی فکر ابھی سے ہونے لگی۔'' دل ہی دل میں سوچتی مومنہ نے اوپر سے جھانکا جہاں سامنے ہی صحن میں لگے نلکے پر راشیل وضو کررہی تھی' مومنہ جانتی تھی کہ وہ کالج سے آکر سب سے پہلے نماز پڑھتی تھی۔

''جی آگئی ہے، نیچے نلکے پر وضو کررہی ہے، کوئی کام ہے تو بتادیں۔''

''ٹھیک ہے، میں گھر آکر خود ہی اس سے بات کرلوں گا۔''

مختصر جواب کے ساتھ ماہیر نے فون بند کردیا جبکہ دوسری طرف مومنہ ہاتھ میں فون لیے کھڑی یہ سوچتی رہی، آخر ماہیر بھائی کو ایسا کیا ہوا تھا کہ انہوں نے خاص طور پر راشیل کا معلوم کرنے کے لیے اسے فون کیا لیکن ظاہر ہے یہ بات وہ ماہیر سے نہیں پوچھ سکتی تھی اس لیے سر جھٹکتی اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا، جب آسیہ کی آنکھ کھلی پیاس کی شدت سے اس کے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے۔ قریب رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور ایک ہی سانس میں سارا گلاس ختم کردیا جب بے اختیار ہی نگاہ دوسرے بیڈ پر لیٹی راشیل پر پڑی، کچھ دیر تو وہ اسے دیکھتی رہی پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''شکر ہے اللہ کا یہ میری جیسی نہیں ہے ورنہ میں اسے کہاں چھپاتی۔'' اسی سوچ کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں، ساتھ ہی امتیاز نیازی کا ذکر ذہن میں آکر اسے بے چین کرگیا۔ محبت کی ڈگر میں اس نے جس طرح آسیہ کا ساتھ نبھایا تھا، بہت کم مرد ہی اپنی بیوی کا ایسے ساتھ دیتے ہیں محبت سے گندھا شخص جو محبت کے ہاتھوں مارا گیا، وہ آہستہ آواز میں سسکیاں لے کر رونے لگی جب قریبی مسجد سے ابھرنے والی اذان کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، وہ چونک اٹھی۔

''اللہ اکبر اللہ اکبر (بے شک اللہ بہت بڑا ہے)''

اللہ کی بڑائی کا تصور لیے آسیہ دروازہ کھول کر صحن میں نکل آئی تاکہ وضو کرکے نماز پڑھ سکے جب کہ راشیل جب کالج جانے کے لیے جاگتی تو پہلے نماز پڑھتی پھر تیار ہوتی، اس وقت تک آسیہ نماز پڑھ کر اس کے لیے ناشتا تیار کردیتی تھی یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا جس کی وہ پچھلے اٹھارہ سالوں سے اتنی عادی ہوچکی تھی کہ اب تو صبح جاگنے کے لیے کبھی اس نے کبھی الارم نہ لگایا تھا۔

یہ سب سوچتی آسیہ وضو کرکے اپنے رب کے حضور کھڑی ہوگئی وہ رب جو اپنے بندوں کو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ جس کی محبت کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اسی رب کے حضور جھکتے ہوئے آسیہ اپنا کچھ دیر پہلے کا غم یکسر فراموش کربیٹھی، اسے یاد رہا تو صرف اللہ جو اس کی شہ رگ سے بھی قریب تھا۔

☆☆☆

ماہیر جیسے ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا، راشیل کی کھلکھلاتی ہنسی نے اس کے قدم وہیں روک دیے۔ دل چاہا یہاں کھڑا یوں ہی یہ ہنسی کی آواز اپنے دل میں اتارتا رہے جب یک دم ہی کل والا واقعہ یاد آگیا جسے یاد کرتے ہی ماہیر کا موڈ فوراً خراب ہوگیا اور وہ تیزی سے سیڑھی کا دروازہ کھولتا اندر داخل ہوا، دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز پر مومنہ اور راشیل نے ایک ساتھ پیچھے پلٹ کر اسے دیکھا جب ماہیر چلتا ہوا راشیل کے عین سامنے کھڑا ہوا اور بنا تمہید ہی اسے مخاطب کرتے بولا۔

''تم کل بلیک کرولا میں کس کے ساتھ تھیں؟''

اس کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ راشیل کے ساتھ ساتھ مومنہ کا منہ بھی حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ دونوں ماہیر کو ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے انہیں سمجھ میں نہیں آیا ہو وہ کیا پوچھ رہا تھا جبکہ راشیل کا تو دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

''آپ کس سے بات کررہے ہیں بھائی؟''

چونکہ اس نے کسی کا نام لیے بنا مخاطب کیا تھا اس لیے مومنہ کا سوال جائز تھا، ماہیر نے اسے مڑ کر دیکھا اور بولا۔

''ظاہر ہے جس کے سامنے کھڑا ہوں اسی سے جواب طلب کررہا ہوں۔'' اور بس اتنا ہی وقت کافی تھا راشیل کو اپنی پریشانی چھپانے کے لیے اس ایک سیکنڈ میں وہ فوراً نارمل ہوگئی۔

''آپ نے مجھے کہاں دیکھ لیا، بلیک کرولا میں گھومتے ہوئے اور کب دیکھا؟''

بظاہر سادہ سے لہجے میں لیے گئے سوال سے ہی واضح طور پر جھلک رہی تھی جبکہ مارے گھبراہٹ اس کا دل دھڑک دھڑک کر سینے سے باہر نکلنے کو تیار تھا۔ پرسکون چہرے کی نسبت اس کے اندر ایک جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا، دوسری طرف اس کی خود اعتمادی نے ماہیر کو گڑبڑا دیا۔

"کل صبح تم نورانی کے سگنل پر تھیں طارق روڈ سے آگے......"

"میرا خیال ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ میں کسی بلیک کرولا والے کو نہیں جانتی۔" وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور قریب رکھی چپل پاؤں میں پھنسائی۔

"میں بھلا کالج یونیفارم میں کسی کی کرولا میں کیوں گھوموں گی، حد ہے۔"

بات کرتے کرتے اس کا لہجہ بھیگ گیا، وہ شاید رو دی تھی۔ ماہیر کو اپنی جلد بازی پر ایک دم ہی افسوس ہونے لگا اس نے دیکھا لائٹ پنک شلوار قمیص پر دوپٹا اوڑھے وہ ہمیشہ کی طرح معصوم اور سادہ لگ رہی تھی اتنی معصوم کہ شاید وہ اتنی دلیری کے ساتھ کسی اجنبی کی گاڑی میں کبھی سفر نہ کر سکے۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی ماہیر جی بھر کر شرمندہ ہوا، اب سمجھ میں نہ آیا اپنی بات کی وضاحت کیسے کرے، جب غصہ سے اپنے بال جھٹکتی راشیل اس کے پاس آئی۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا، میں کرولا میں کس کے ساتھ تھی؟"

ماہیر کی خاموشی نے اس کی دیدہ دلیری کو ہوا دے کر مزید شیر کر دیا تھا۔

"پتا نہیں شاید مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

اپنے بلاوجہ کے شک پر وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا جو اس کی زبان راشیل کے سامنے گونگی ہو گئی ورنہ اس سے پہلے تو کبھی راشیل کو اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس سے اتنے سوال کرتی اور وہ جواب دیتا لیکن شاید محبت کا حملہ اتنا ہی شدید ہوتا ہے کہ چاہنے والے کی قوت گویائی چھین لیتا ہے، جیسے ابھی ماہیر کی زبان تالو سے جا لگی تھی۔

"غلط فہمی میں ہی آپ نے مجھ پر اتنا بڑا الزام لگا دیا؟"

بات تو کچھ بھی نہ تھی لیکن راشیل کو بہت برا لگا کہ ماہیر نے بنا سوچے سمجھے اس پر الزام تراشی کر دی، صورت حال سنگین ہو گئی تھی جب مومنہ ان دونوں کے درمیان آ گئی۔

"افوہ راشیل! کیوں اتنا برا مان رہی ہو، بھائی نے شاید تمہاری ہم شکل کوئی لڑکی دیکھ لی تھی بلیک کرولا میں۔ بس اس لیے تم سے پوچھ لیا، کیوں بھائی ایسا ہی تھا نہ؟" بات ختم کر کے اس نے ماہیر سے تصدیق چاہی۔

"ہاں بالکل ایسا ہی تھا، وہ لڑکی ایک دم راشیل جیسی تھی یا شاید مجھے راشیل جیسی لگی۔ بہرحال جو بھی ہے اپنی غلط فہمی کی معافی چاہتا ہوں۔" راشیل نے شاید اس کی وضاحت سنی ہی نہیں، چپل پہن کر دھپ دھپ سیڑھیاں اترتی نیچے چلی گئی۔ صاف [illegible] کہ وہ ناراض ہو چکی ہے۔

☆☆☆

"دنیا گول ہے جہاں گھوم کر ہر انسان ایک دوسرے کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔"

خان بابا کی سوچ میں ڈوبی آواز جیسے ہی اس کے کان سے ٹکرائی وہ چونک اٹھی، فوراً اپنا جھکا سر اٹھا کر دیکھا۔ آنکھیں موندے، کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے خان بابا شاید خود سے مخاطب تھے۔ امیر بیگم نے اپنا سر دوبارہ جھکا لیا اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ وہ خان بابا سے اس جملے کے متعلق کوئی سوال کرتی وجہ شاید اس کی وہ غلامی تھی جس میں وہ پچھلے بیس سالوں سے جکڑی ہوئی تھی اور چاہ کر بھی غلام کی یہ ان دیکھی زنجیریں اپنے جسم سے دور نہیں کر سکتی تھی، اسی لیے بہتر تھا خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھ کر انتظار کرتی شاید خان بابا مزید کوئی ایسی بات کرتے جس سے پوری بات کھل کر امیر کے سامنے آ جاتی،

اسی انتظار میں مزید کچھ وقت آگے سرک گیا۔ دو نفوس کی موجودگی کے باوجود برآمدے میں گہرا سکوت طاری تھا جسے خان بابا کی سرگوشی نما آواز نے ایک بار پھر سے توڑ دیا، ابھی بھی وہ شاید وہ خود سے ہی مخاطب تھے۔

"کتنا بھاگے گی؟ کہاں تک بھاگے گی؟ بھاگ لے...... جا بھاگ لے۔"

"کون خان بابا؟" بے اختیار ہی امیر کی زبان سے یہ جملہ پھسل گیا، جسے سنتے ہی خان بابا گویا ہوش کی دنیا میں واپس آ گئے۔ اپنی وہیل چیئر پر سیدھا بیٹھتے ہوئے انہوں نے لال انگارہ آنکھوں سے امیر کو گھورا اور تیز آواز میں چلائے۔

"تو ادھر کیا کر رہی ہے؟ کیوں بیٹھی ہے یہاں؟ ہماری جاسوسی کرتی ہے؟" امیر ایک دم ڈر کر اٹھ کھڑی ہوئی، خوف سے اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی سانسیں بند ہو جائیں گی۔

"بولتی کیوں نہیں؟ کیوں بیٹھی ہے تو ادھر۔"

"وہ خان بابا......" وہ ہکلائی۔ "آپ کو پانی دینے آئی تھی، دو دفعہ آواز دی آپ نے نہیں سنا تو انتظار میں ادھر ہی فرش پر بیٹھ گئی۔"

"چل نکل ادھر سے، خبیث عورت! ہمارا بات سننے کو بیٹھی ہے۔ میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں' گندے غلیظ لوگ، آنے دے گل جان کو بتاتا ہوں تیری زنانی۔ ادھر بیٹھ کر ہمارا خبر گیری کرتا ہے۔"

امیر کمرے سے نکل کر باہر کی جانب بھاگ گئی، اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ خان بابا ریڑھ کی ہڈی میں زخم کے باعث معذور ہو گئے تھے ورنہ تو آج اس کی خیر نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی اور اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی ابھری۔

"کیا فائدہ ایسی عاشقی کا جو دوسروں کی زندگی کو جہنم بنا دے۔"

روتی ہوئی امیر جانے کس سے شکوہ کر رہی تھی جبکہ اسی وقت وہاں کمرے میں اس کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔

☆☆☆

زمان لالا کو جب بھی کوئی بات کرنی ہوتی، ہمیشہ آسیہ بی جی کو ہی اوپر بلا لیا جاتا لیکن آج جانے ایسی کیا خاص بات تھی جو لالا اور نور خود چل کر اس کے پاس آئے اور آتے ہی راشیل کو مومنہ کے پاس بھیج دیا یہ سب دیکھتے ہوئے آسیہ سمجھ گئی کہ ضرور کوئی ایسی بات ہے جس کا راشیل کے سامنے ذکر کرنا مناسب نہیں تھا۔ یہ ہی سوچ کر وہ یک دم ہی گھبرا اٹھی، جلدی جلدی دونوں کو پانی کا گلاس دیا اور ویسی موڑھا گھسیٹ کر بھائی کے پاس جا بیٹھی۔

"لالا! کوئی خاص بات تھی جو آپ نیچے آئے، مجھے اوپر بلا لیا ہوتا۔"

"بات ایسی ہی تھی جس کے لیے ہمارا چل کر نیچے آنا ضروری تھا۔" نور نے مسکراتے ہوئے آسیہ کی جانب دیکھا تو اس کے دل کو تسلی ہوئی یقیناً کوئی خطرے والی بات نہ تھی۔

"کیونکہ ضرورت مند ہمیشہ اپنی ضرورت کی پاس جاتا ہے، ضرورت کبھی چل کر ضرورت مند کے پاس نہیں آتی تو ایسا ہی سمجھو کہ آج ہم تمہارے در پر سوالی بن کر آئے ہیں اپنی ایک ضرورت کے لیے۔"

لالا کی باتیں آسیہ کے ذہن کو الجھا رہی تھیں اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ایسی کوئی سی ضرورت ہے جو آسیہ ان کی پوری کر سکتی ہے۔ آج تک تو وہ اپنی ضرورتوں کے لیے خود زمان لالا کی محتاج تھی۔

"میں آپ کی کوئی ضرورت پوری کر سکوں تو یقین جانیں مجھے خوشی ہوگی کہ میرے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہے جو آپ کے کام کی ہے۔"

"تمہارے پاس تو دنیا کی بہت قیمتی شے ہے اگر تم اسے ہمارے نام کر دو تو یہ تمہارا ہم سب پر ایک بہت بڑا احسان ہوگا۔ آسیہ بی جی! ہماری جھولی میں راشیل ڈال دو، اسے ہمارے ماہیر کی دلہن بنا دو۔"

نور نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جیسے ہی اپنی بات مکمل کی، مارے خوشی کے آسیہ بی جی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''ساری زندگی آپ لوگوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا، کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی بھائی بہن کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میں تو کئی سالوں سے آپ کے ان احسانات کی مقروض ہوں اور وہ قرض ہی نہیں ادا کرسکتی پھر ایک اور احسان، کس زبان سے آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔''

فرط جذبات میں آسیہ رونے لگی جب نور نے اسے اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے چپ کروایا اور آہستہ سے بولی۔

''جو بات کوئی نہیں جانتا، اس کا اب ذکر نہ کرو۔ اس راز کی پاسداری سے ہی ہمارے رشتوں کی بقا ہے جو ہم تینوں کے بیچ موجود ہے۔ کوشش کرو کہ ہم میں سے ہر فرد اسے اپنے ساتھ ہی دل کی گہرائیوں میں بسائے قبر میں اتر جائے کیونکہ یہ بہت ضروری ہے۔''

''اور ہاں آسیہ بی جی! تم اسی سلسلے میں راشیل کی رضا مندی ضرور معلوم کرنا کیونکہ یہ ماہیر کی خواہش ہے کہ جب تک راشیل اس رشتہ پر دل سے راضی نہ ہو ہاں نہ کی جائے۔''

''لو بھلا اسے کیا اعتراض ہوگا، نصیب والی ہے میری بیٹی جس کے مقدر میں ماہیر جیسا ہیرا لکھا گیا۔''

''ہیرا تو ہماری بیٹی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کی جگمگاہٹ ہمارے گھر کو روشن کردے پھر بھی تم یہ کام اپنی بیٹی کی رضامندی سے کرنا۔''

اوپر سے آتی راشیل کے کان سے ماموں کا آخری جملہ ٹکرایا اور وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ ایسا کون سا کام ہے جس کے لیے میری رضا مندی کا ہونا ضروری ہے لیکن جلد ہی اس نے اپنے ذہن میں آئے اس خیال کو جھٹک دیا کیونکہ یہ وقت اس کا موسیٰ سے بات کرنے کا تھا لہٰذا جلدی جلدی ان کے پاس سے گزرتی اندر کمرے میں چلی گئی تاکہ ماں کی مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر موسیٰ کو کال کے لیے گرین سگنل دے سکے۔

☆☆☆

چڑھتی محبت کا خمار، خاردار راستوں کو بھی گل گلزار کردیتا ہے۔ زندگی میں ہر طرف رنگینی ہی رنگینی بکھری دکھائی دیتی ہے۔ آئینہ دیکھو تو خود سے زیادہ کوئی حسین نہیں لگتا، آنکھ بند کرو تو محبوب کا تصور ہر شے پر حاوی ہوجاتا ہے، دنیا ''میں'' اور ''تو'' میں سمٹ جاتی ہے۔ نہ کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی کچھ سنائی دیتا ہے، آنکھیں کھولو تو سامنے محبوب، سننا چاہو تو اس کی آواز ہی چاروں طرف سنائی دیتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہ جو عشق ہے اک دیوانگی ہے۔

اک آگ ہے، اک جوش ہے
اک نشہ ہے، اک خمار ہے
یہ عشق ہی تو ہے جو دل میں اتر کر
سب تباہ کردیتا ہے، سب برباد کردیتا ہے
یہ عشق ہی تو ہے جس کی آتش محبوب کو جلا دیتی ہے
خاک کردیتی ہے، یہ عشق ہی تو ہے جاناں
جو کچھ نہیں چھوڑتا، سب خاک کردیتا، خاک ہوجاتا ہے

اپنے سامنے رکھے کاغذ پر لکھی نظم کو راشیل نے کئی بار پڑھا اور پھر مسکرادی اور دل ہی دل میں موسیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''تمہاری محبت نے مجھے شاعرہ بنادیا
'میں' میں نہ رہی، مجھے 'تو' بنادیا''

آنکھیں موندے، موسیٰ کے تصور کو دل میں بسائے وہ خود بہ خود مسکرارہی تھی جب کمرے کا دروازہ کھول کر آسیہ اندر داخل ہوئی۔ ایک نظر خاموش بیٹھی مسکراتی ہوئی بیٹی پر ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر اس کے سامنے میز پر رکھا کاغذ کا پرزہ اٹھا لیا۔

''یہ کیا ہے؟'' راشیل کی لکھی ہوئی غزل پڑھ کر اس کے ماتھے پر تیوری پڑگئی۔

''کچھ نہیں امی! اردو ادب میں غزل کا ایک

PakiBooks.Site

مقابلہ ہے اس کے لیے کوشش کررہی ہوں شاید میں بھی کچھ لکھ سکوں۔''

ماں کے ہاتھ سے پرچا لیتے ہوئی اس نے بڑے اطمینان سے جھوٹ بولا ویسے بھی موسیٰ کی محبت نے جہاں اسے بےخوفی بخشی تھی وہاں وہ بڑی روانی سے جھوٹ بولنا بھی سیکھ گئی تھی اور جھوٹ بھی اتنی معصومیت سے بولتی کہ سامنے والا آنکھیں بند کرکے یقین کرلیتا جیسے اس دن ماہیر اور آج آسیہ نے بلاچوں چرا اس کی بات کو سچ مان لیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' آہستہ سے کہتی آسیہ نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ ''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی جب تم فارغ ہو تو بتانا۔''

''اوکے مما!'' ماں کا منہ چومتی راشیل کمرے سے باہر نکل گئی کیونکہ اس وقت وہ کافی جلدی میں تھی، کوچنگ کا وقت ہوچلا تھا اور جانتی تھی کہ موسیٰ پچھلے دس منٹ سے کوچنگ کے باہر کھڑا اس کے دیدار کا منتظر تھا۔ آج تو ویسے بھی اسے وہاں تک پیدل جانا تھا اس لیے فی الحال آسیہ کی بات سننے کا اس کے پاس بالکل بھی وقت نہ تھا۔

☆☆☆

آج گھر میں کوئی بھی نہیں تھا خان بابا شاید گل جان کے ساتھ ڈیرے پر چلے گئے تھے اکثر جب وہ گھر کی اداسی سے تھک جاتے تو گل جان کے ساتھ ڈیرے چلے جاتے تو مانو یہ وقت امیر کی آزادی کا ہوتا جب وہ بلاخوف و خطر اپنے کمرے سے باہر نکلتی۔ کچن سے اپنی مرضی کا کھانا کھاتی اور اکثر ہی اوپر والے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتی۔ یہ کمرہ بی جان کا تھا جو اس گھر کی واحد ہستی تھیں، جنہیں امیر سے تھوڑی بہت ہمدردی تھی وہ اکثر ہی خان بابا کی مار سے امیر کو بچانے کے لیے ڈھال بن جایا کرتیں مگر آج جانے کیا بات تھی اس خالی گھر میں بھی امیر کا دل خوش نہیں ہوا۔ دل کے اندر ڈیرا جمائے بیٹھی اداسی کسی طور کم ہونے میں ہی نہیں آرہی تھی۔

وہ کچے صحن میں بچھی چارپائی پر جا بیٹھی، آج اسے اماں بابل کا چھوٹا سا آنگن یاد آرہا تھا، اس صحن میں بھاگتی دوڑتی مرغیاں، بابا کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک سب اس کے حواسوں پر چھائے اسے بوجھل بنا رہے تھے۔ آج اتنے سالوں بعد اسے اپنا بڑا بھائی اتنی بری طرح یاد آیا کہ بےساختہ ہی وہ سسک اٹھی۔

''جانے اماں کس حال میں ہوگی؟ میرے بغیر تو شاید مر ہی گئی ہوگی۔'' اتنے میں اس کے کان میں ایک آواز گونجی۔

''حیات محمد......'' ساتھ ہی کسی نے زور زور سے گھر کا دروازہ بھی بجایا۔

''آیا بھئی آیا......صبر تو کر۔''

یہ آواز ابا کی تھی جو ہمیشہ کی گھن گرج سے جاری تھی۔ ابا کی تھکی تھکی آواز امیر آج بھی نہ بھولی تھی اور اس وقت وہ وہیں چارپائی پر لیٹی لیٹی، اپنے ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی۔

☆☆☆

آج کا دن پچھلے تمام دنوں سے مختلف تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے سورج بھی کوئی نیا نکل آیا ہو، سرد ہواؤں کے باوجود حیات محمد کا سارا جسم جل رہا تھا۔ اس کے سینے میں آگ کے بھانبڑ تابڑتوڑ جل رہے تھے۔ اسی آگ میں اس کا بوڑھا اور کمزور وجود بھی جلتا جارہا تھا یہ ایک ایسی آگ تھی جو کسی کو دکھائی نہ دے رہی تھی مگر جو اس کی گرفت میں آگیا۔ اسے سر سے پاؤں تک جلا کر سوا کردینے والی آگ۔ اس آگ کی سڑاند اتنی زیادہ تھی تو پھر جہنم کی آگ کیسی ہوگی مگر اس پل تو حیات محمد کے لیے دنیا بھی کسی جہنم سے کم نہ تھی۔ ایک ایسا جہنم جس میں اس کا جیتا جاگتا وجود دھڑادھڑ جل رہا تھا، وہ بمشکل اپنے قدم گھسیٹتا صحن تک آیا ہاتھ کا چھجا بنا کر آنکھوں پر رکھتے ہوئے کچن کے اندر جھانکا اور دور سے چلا دیا۔

''آجا رانی کی ماں، پنچایتی ہمارا انتظار کررہے ہیں۔''

''نہ تو نے کوئی روٹی ٹکر نہیں کھانا، کل رات

سے بھوکا پیاسا پڑا ہے۔'' کچن کے دروازے پر کھڑی میراں نے ایک نظر اپنے شوہر پر ڈالی جس کی کمر ایک رات میں ہی جھک گئی تھی۔

''اب اپنے نصیب میں روٹی ٹکر کہاں......''

حیات محمد نے ایک لمبی سانس بھری ہی تھی کہ اندر کمرے سے نیلے یونیفارم میں ملبوس رانی باہر نکلی، دو چوٹیاں بنائے، کندھے پر بیگ ڈالے وہ اتنی معصوم نظر آرہی تھی کہ بے ساختہ حیات محمد کا دل چاہا اسے واپسی کمرے میں بند کر کے تالا لگا دے مگر کیا کرتا مجبور تھا، سینے سے بے اختیار ہی ایک ٹھنڈی آہ نکل آئی۔

''ہک ہاہ...... بھلا اس دن کے لیے لوگ رب سوہنے سے پتر مانگتے ہیں، اک وا ایک پتر دیا تھا اللہ نے، وہ بھی ہمارا شملہ مٹی میں رول کے چلا گیا۔ اپنی عاشقی کی آگ میں یہ بھی مڑ کر نہ دیکھا کہ پیچھے رہ جانے والوں کا کیا بنے گا، جانا ہی تھا تو ہم تینوں کو اپنے ہتھی مار جاتا، دکھ تو نہ ہوتا۔''

میراں اپنے سینے پر دو ہتڑ مار کر بین کرنے لگی، جب حیات محمد نے آگے بڑھ کر سامنے دیوار پر لگی، اپنے بیٹے کی بڑی سی تصویر کو اتار کر دور پھینک دیا۔ تصویر کے زمین سے ٹکراتے ہی میراں جیسے تڑپ اٹھی۔

''نہ حیات محمد نہ...... اس کی فوٹو نہ پھاڑنا، ایک یہ ہی نشانی ہے میرے سوہنے شہزادے کی میرے پاس، اس کو نہ چھین۔''

اسی پل دروازے پر زوردار دستک سنائی دی، ساتھ ہی پھیکے کی آواز بھی، جسے سنتے ہی سارے گھر پر جیسے سناٹا چھا گیا۔

''حیات محمد! ڈیرے پر آجا، پنچایتی تیری راہ دیکھ رہے ہیں۔''

''آیا بھئی آیا، صبر تو کر۔'' کندھے پر صافہ رکھے وہ دروازے کی سمت بڑھتا بڑھتا رک گیا۔

''رانی کی ماں! اس کو ساتھ لے کر تو بھی ڈیرے آجا، ملک صاحب کا حکم ہے۔ پورا گھر آج پنچایت میں حاضر ہو۔''

''میں پنچائیت جا کر کیا کروں گی؟'' رانی نے حیرت سے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میرا تو آج حساب کا ٹیسٹ ہے، اسکول نہ گئی تو استانی جی نے شکایت لے کر گھر آجانا ہے۔''

''آنے دے استانی جی کو گھر، تیرے ٹیسٹ سے زیادہ پنچائیت ضروری ہے۔''

ابا نے رک کر ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، ابا کے پیچھے ہی رانی بھی ماں کا ہاتھ تھامے ڈیرے کی جانب چل دی۔ یہ جانے بنا کہ وہاں آج اس کی زندگی کا اہم فیصلہ ہونے جارہا ہے، وہ حساب کے ٹیسٹ کی فکر لیے ملک صاحب کی حویلی پہنچ گئی، جہاں ان کا ڈیرہ بھی تھا۔

☆☆☆

''تمہارے کزن نے دوبارہ تو تم سے کوئی بات نہیں کی؟'' موسیٰ نے اپنے قریب بیٹھی راشیل کی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، اور میرا نہیں خیال اب وہ دوبارہ مجھ سے ایسی بات کرے گا۔''

''اچھا کیا جو تم نے ایک دفعہ ہی بہادری سے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ اگر تم اس دن ڈر جاتیں تو ہمارے لیے بہت مشکل ہو جاتی۔'' موسیٰ محبت پاش نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔

''جانتی ہو پھر تمہارا خوف تمہیں مجبور کرتا کہ مجھ سے نہ ملو اور اگر ایسا ہو جاتا تو یقین جانو میں تو بنا موت ہی مر جاتا۔''

''اللہ نہ کرے جو ایسا ہوتا۔'' راشیل نے دہل کر موسیٰ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، راشیل کی اس حرکت نے موسیٰ کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''آپ کو پتا ہے اگلے مہینے میرے فائنل امتحان شروع ہونے والے ہیں۔'' راشیل فوراً اس موضوع پر آتے ہوئے بولی جس کے لیے اس نے آج خاص طور پر موسیٰ کو ملنے کے لیے بلایا تھا۔ ''پھر میرے لیے گھر سے نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔'' آہستہ آہستہ کہتے اس نے اپنی بات مکمل کی۔

''اوہ......'' موسیٰ چونکا اور ایک نظر راشیل کے چہرے پر ڈالی۔ ''پھر ہم کیسے ملیں گے؟''

''میں یہ چاہ رہی تھی کہ آپ......'' جھجکتی ہوئی راشیل نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ موسیٰ نے دیکھا وہ اضطرابی حالت میں اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''گھبراؤ مت میری جان! جو کہنا ہے کھل کر کہو۔'' سگریٹ کا کش لگاتے موسیٰ نے اس کے منہ پر دھواں چھوڑتے ہوئے اسے حوصلہ بخشا اور اس کی اس ادا پر راشیل تو جیسے فدا ہی ہو گئی کیونکہ اس کے گھر کوئی بھی سگریٹ نہ پیتا تھا اور اس اسٹائل سے سگریٹ پیتا موسیٰ اسے ہمیشہ پہلے سے بھی زیادہ اچھا لگتا۔

''دراصل میں چاہ رہی تھی آپ اپنی امی کو میرے گھر بھیج دیں۔'' اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ اپنا مدعا موسیٰ تک کیسے پہنچائے۔

''صرف امی کو بھیجوں، خود نہ آؤں؟'' شرارت سے موسیٰ نے اس کے ماتھے پر گری بالوں کی لٹ کو چھوا۔

''خود بھی آجائیں مگر اپنی امی کے ساتھ۔''

''ضرور آؤں گا لیکن ابھی نہیں، تمہیں تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔ ایک تو مما پچھلے کچھ دنوں سے بیمار ہیں، دوسرا میری تعلیم مکمل ہونے میں پورا ایک سال باقی ہے اس کے بعد مجھے اعلا تعلیم کے لیے انگلینڈ جانا ہے۔ میری کوشش ہو گی باہر جانے سے قبل میں تم سے نکاح کر کے جاؤں۔''

راشیل کو تسلی دیتے ہوئے موسیٰ نے اس کے نرم و نازک ہاتھوں کو بڑے پیار سے سہلایا اور راشیل کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ موسیٰ اس کی بات سمجھ گیا تھا اب اس کا دل اندر تک شانت ہو گیا۔

☆☆☆

آنکھیں موندے لیٹی امیر کو آج کئی سال پرانا منظر اپنی آنکھوں کے سامنے ایسے چلتا محسوس ہو رہا تھا جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اسے یاد تھا کچی مٹی کے فرش پر بیٹھا حیات محمد ایسے لرز رہا تھا جیسے وہ خود قصوروار ہو لیکن سچ یہ ہے کہ ہمیشہ اولاد کے قصور کی سزا ماں باپ کو ہی بھگتنی پڑتی ہے جیسے اس سمے وہ بھگتنے کو تیار بیٹھا تھا۔

''ہاں بھئی حیات! تُو مانتا ہے نا تیرا نالائق پتر خان صاحب کی دھی کو نکال کے لے گیا ہے جبکہ یہ بے چارے تو ہمارے گاؤں میں مہمان تھے۔'' ملک صاحب نے حقے کی لے منہ سے نکالتے ہوئے حیات کو مخاطب کیا۔

''سارا قصور میرے پتر کا نہیں ہے جی۔'' حیات محمد کے روکتے روکتے بھی میراں بول اٹھی۔

''ان کی دھی بھی برابر کی قصوروار ہے سزا دونوں کو ملنی چاہیے۔''

''وہ تو ملے گی، تُو فکر نہ کر، دونوں کو ملے گی۔ میں نے خان کو کہہ دیا ہے جہاں وہ گنہگار ملیں دونوں کو گولی سے اڑا دے۔''

''ہائے میرے ربا۔'' یہ بات سنتے ہی کسی نے جیسے میراں کا کلیجہ مٹھی میں لے کر دبوچ لیا۔

''نہ ملک صاحب! اتنا ظلم نہ کریں، جان بخش دیں جی ان کی، میرا اک وا اک پتر ہے جی۔'' حیات، ملک صاحب کے قدموں پر گرا اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا جبکہ کچھ دیر قبل والا اس کا غصہ پانی پر آئی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

''دیکھ حیات محمد! سارا پنڈ چنگی طرح جانتا ہے خان اپنی دھی اور زنانی کے ساتھ حکیم جی کا مہمان تھا۔ جہاں ان کی بیمار بیوی کا علاج چل رہا تھا اور صرف ایک مہینہ ہی ہوا تھا انہیں ہمارے گاؤں آئے ہوئے کہ تیرے پتر نے اس نمانی کو ورغلا لیا۔ حکیم صاحب کی گواہی ہے کہ وہ بنا ضرورت ان کے مطب کے چکر لگاتا تھا اور کئی دفعہ گلی کی نکڑ پر بھی کھڑا پایا گیا۔ اس لیے آج ہم پنچایتیوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کی دھی کے بدلے تیری دھی، خان کے

PakiBooks.Site

حوالے کر دی جائے تا کہ تم لوگوں کو پتا لگے کسی کی
پگڑی پیروں تلے رولنے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور خان
بھی بدلے میں یہ ہی چاہتا ہے کیونکہ اس کی دھی اپنی
بیمار ماں کی خدمت کرتی تھی جو خان اور اس کا پتر نہیں
کر سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تیری رانی ان کو
ونی کر دی جائے۔''

''نہ ملک صاحب! اتنا ظلم نہ کریں، ہم تو
مر جائیں گے۔'' ملک کی بات سنتے ہی میراں تڑپ
کر اٹھنے ہی والی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اس کے
کندھے پر ڈنڈا مار کر دوبارہ اسے زمین نشین کر دیا
اور وہ بلبلاتی ہوئی واپس اپنی جگہ بیٹھ گئی جبکہ سجدے
کی حالت میں پڑا حیات محمد بنا آواز کے رو رہا تھا۔

''اس سے تو اچھا تھا تو جاتے ہوئے ہم تینوں
کو زہر دے کر مار جاتا، کیوں زندہ چھوڑ گیا۔'' جبکہ
رانی کی سمجھ میں ہی نہ آیا یہ ایک دم کیا ہو گیا۔ اس کے
کندھے پر لٹکتا بیگ کسی نے کھینچ کر زمین پر پھینک
دیا، وہ ڈر کر با آواز بلند رونے لگی، جب سختی سے اس
کا بازو دبوچے شخص نے اسے خان کے قدموں میں
گرا دیا۔

''لے جاؤ اسے اپنے ساتھ، سب گواہ رہنا ہم
نے لڑکی کے بدلے لڑکی دے دی ہے پھر بھی تمہیں
اختیار ہے جب وہ دونوں زانی تمہارے ہاتھ لگیں
مار کر لاشیں ہمارے ڈیرے بھیج دینا۔ ہم سمجھ جائیں
گے کہ تم ایک غیرت مند پٹھان ہو۔''

اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتے خان نے
زمین پر پڑی بلکتی رانی کو گلے سے دبوچ کر اپنے
سامنے کھڑا کر لیا۔

بارہ سالہ رانی کی دل دوز چیخیں کسی بھی حساس
دل کو لرزانے کے لیے کافی تھیں مگر شاید یہاں موجود
ہر شخص کا دل پتھر کا تھا جس پر ایسی آہ و بکا کا کوئی اثر
ہونے والا نہ تھا ویسے بھی یہ ڈیرہ تھا جہاں ہر روز
ایسے فیصلے ہوتے تھے۔ ہر دن آدم کے بیٹے کی غلطی
کی سزا حوا کی بیٹی کو بھگتنی پڑتی، ایک ایسی سزا جو روز
اسے مارتی ہے اور پھر ہر دن اس مری ہوئی عورت کو
نیا جنم لینا پڑتا ہے تو طے ہوا آج اس لمحہ، اس پل رانی
بھی مر گئی جسے اپنے بڑے بھائی کی عاشقی کی ایسی سزا
ملی کہ وٹہ سٹہ نکالا نصیب بنا کیونکہ خان کا تعلق کوئٹہ سے
تھا جہاں سے وہ دو ماہ قبل اپنی بیوی کے علاج کے
لیے گاؤں آیا تھا اور اس دوران اس کی بیٹی اور رانی
کے بھائی کے درمیان شروع ہونے والی محبت کی
داستان، بدنامی کا نشان بن کر ان کے سارے گھر
والوں کی قسمت پر سیاہی پھیر گئی، عاشق و معشوق تو
ایک دوسرے کو پیار ہو گئے۔ باقی رہ جانے والے
ساری دنیا کے لیے نشانہ عبرت بنا دیے گئے۔

روتی بلکتی رانی اپنے ماں باپ کو چھوڑ خان
کے حوالے کر دی گئی جو اسے لے کر راتوں رات ان
کا گاؤں چھوڑ گیا اور پھر اتنے سالوں میں وہ کبھی مڑ
کر اپنی گاؤں واپس نہ گئی۔ وہاں کون کس حال میں
تھا وہ کچھ نہیں جانتی تھی اور پھر وہ رانی سے امیر بن گئی
جس کا کوئی ماضی نہ تھا جو صرف خدمت گزار تھی۔

اسے بی جان کی خدمت پر مامور کر دیا گیا، خان کو
جب اپنی بیٹی خجستہ پر غصہ آتا وہ اسے گالیاں دیتے
ہوئے امیر کے جسم کی کھال ادھیڑ دیا کرتا۔ ایسے میں
اسے روکنے والا کوئی بھی نہ ہوتا، ان حالات میں
ساری دنیا سے بے زار لٹی پٹی امیر جانے کیسے خان
کے اکلوتے بیٹے گل جان کے دل کو بھا گئی۔ خان تو
شاید اسے اپنی بہو بنانے پر کبھی آمادہ نہ ہوتا اگر
مرتے دم بی جان ہاتھ جوڑ کر یہ خواہش خان کے
سامنے نہ کرتی، بس وہ ایک لمحہ تھا جب خان کا دل پسیج
گیا اور اللہ کو امیر کی بے بسی پر ترس آ گیا اس سوہنی
رب کی مہربانی سے آٹھ سال ایک کمرے میں قید
رہنے والی امیر جس کی زندگی کا مقصد صرف اور
صرف بی جان کی خدمت کرنا تھا۔ چار آدمیوں کی
موجودگی میں گل جان کے نام کر دی گئی۔

جس نے پہلی رات اس سے وعدہ کیا کہ وہ
اسے پنجاب اس کے گاؤں لے کر جائے گا اور ایک
دفعہ اس کے ماں باپ سے ضرور ملوا کر لائے گا مگر
شاید وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے، اس طرح گل

PakiBooks.Site

جان کا وعدہ صرف وعدہ ہی رہا اور اس دوران امیر
سات بچوں کی ماں بن گئی جو ہر سال پیدا ہوتے اور
صرف دو ماہ بعد ہی اسے جدائی کا داغ دے کر دنیا
سے چلے جاتے۔ سات میں سے صرف دو بچے باقی
رہ گئے جنہیں ایک سال کی عمر میں ہی خان نے اس
کی گود سے چھین لیا اور پھر وہ اپنی بچوں کی دید کو بھی
ترستی رہ گئی اور ایسے میں اس نے کبھی بھی اپنے بڑے
بھائی کو اچھے الفاظ میں یاد نہ کیا جب کبھی وہ گھر میں
خجستہ کا ذکر سنتی اس کے دل میں ابھرنے والی نفرت
مزید گہری ہو جاتی۔ یہ وہ ہستی تھی جس کی بدولت
اسے اپنا گھر، اسکول اور ماں باپ چھوڑنے پڑے،
جس کی وجہ سے اس کا بچپن دوسروں کے قدموں کی
دھول بن گیا اس کی ساری عمر تنہائی میں روتے
ہوئے گزر گئی اسے یقین تھا زندگی میں اگر کبھی خجستہ
اس کے سامنے آئی تو شاید وہ اسے کبھی معاف نہ
کر سکے گی قدرت نے اگر اسے کبھی موقع دیا تو وہ
اپنی تمام محرومیوں کا بدلہ بھی خجستہ سے ضرور لے گی۔

مگر اکثر وہ ہوتا نہیں جو ہم سوچتے ہیں اور وہ
ہو جاتا ہے، جس کی امید بھی ہم نے کبھی نہیں کی ہوتی
اور امیر کی زندگی میں تو شروع سے ایسا ہی ہو رہا تھا
اسے وہ ملا جس کی تمنا بھی اس کے دل نے نہیں کی
تھی اور جو دل نے چاہا وہ اس سے چھین لیا گیا اس کی
اپنی تو کوئی زندگی ہی نہیں تھی، اس نے جو جیا
دوسروں کے لیے ہی جیا جو گنوایا وہ بھی دوسروں کے
لیے، جو حاصل کیا وہ بھی دوسروں کے لیے اس کا اپنا
تو شاید کچھ بھی نہ تھا یہاں تک کہ اپنے پیٹ سے پیدا
کی جانے والی اولاد بھی اس کی نہ تھی۔

☆☆☆

آج اس کا آخری پرچا تھا، خوشی کے ساتھ
ساتھ وہ اداس اور پریشان بھی تھی، سب سے زیادہ
پریشانی تو موئی کے ہجر کی تھی وہ تو شاید اب کالج آتی
ہی موئی کے دیدار کے لیے تھی اب جو کالج ہی ختم
ہو گیا تو یہ دیدار یار کیسے ممکن ہوتا۔ ان ہی سوچوں
میں ابھی وہ گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا اماں اپنا پرانا
ٹرنک کھولے رنگ برنگ کپڑوں کا انبار لگائے بیٹھی
ہیں۔ یہ تمام وہ کپڑے تھے جو کسی زمانے میں راشیل
کی پسند ہوا کرتے تھے مگر اب اتنے سال بعد فیشن اور
کچھ راشیل کے خیالات دونوں بدل چکے تھے چنانچہ
اسے یہ سارے کپڑے عجیب گولا گنڈا ایسے لگ رہے
تھے پھر بھی وہ ماں کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی اس لیے
اس کے پاس جا کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیا بات ہے اماں! آج یہ بازار کیوں سجایا
ہوا ہے؟''

ایک ایک کپڑا اٹھا کر وہ اپنے پرانے پر شوق
انداز میں سوال کر رہی تھی، اس کی یہ ادا آسیہ کو خوشی
سے نہال کر گئی۔

''لگتا ہے امتحانات ختم ہونے کی خوشی میں
آپ مجھے کوئی نیا ڈریس بنوا کر دینے والی ہیں۔''

''اللہ خیر کرے بچہ ایک کیا، اب تو تمہارے
بہت سے نئے ڈریس بننے والے ہیں۔''

ایک ایک کپڑا سمیٹتی آسیہ نے یہ جملہ کچھ اس
طرح کہا کہ راشیل چونک اٹھی اور ماں کی قریب ہی
بیٹھتے ہوئے بولی۔

''لگتا ہے ماہیر بھائی کو اپنے لیے دلہن پسند
آ گئی ہے۔'' اس سے زیادہ وہ کچھ سوچ ہی نہ سکتی تھی
لہٰذا اپنے دل میں آئی بات فوراً لبوں پر لے آئی۔

''ہاں خیر سے اس کا رشتہ بھی ہو گیا ہے اور
ساتھ میں تمہارا بھی۔'' پہلا جملہ تو ٹھیک تھا مگر اگلا
جملہ راشیل کو تڑپا گیا۔

''میرا رشتہ؟'' حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں بچہ! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری اور
ماہیر کی شادی کر دی جائی اور یقین جانو یہ سب ماہیر
چاہتا ہے اس نے خود تمہارے ساتھ کی خواہش کی
ہے۔ خوش قسمت ہو تم جسے اتنا اچھا لڑکا ملا، بہت
محبت کرتا ہے وہ تم سے۔'' اپنے میں مگن آسیہ بولے
جا رہی تھی، یہ دیکھے بنا کہ اس کے ہر جملے کے ساتھ
راشیل کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتا جا رہا تھا اور یہ
ہی وقت تھا جب اپنے کسی کام سے نیچے آئے ماہیر

کے قدم کمرے کے دروازے کے باہر ہی رک گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اندر ہونے والی گفتگو سننے پر مجبور ہو گیا۔

''ایک منٹ اماں! پلیز خاموش ہو جائیں۔''

نان اسٹاپ بولتی آسیہ کے کان سے جیسے ہی راشیل کی بےزار کن آواز ٹکرائی وہ خاموش ہو گئی۔

''زندگی صرف ماہیر بھائی کی تو نہیں ہے جو انہوں نے پسند کیا انہیں دے دیا جائے۔ اس زندگی پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ان کا اور وہ مجھے شوہر کے روپ میں بالکل بھی پسند نہیں۔''

''آہستہ بول لڑکی آہستہ۔'' راشیل کا جملہ کاٹتی آسیہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، مبادا اس کی تیز آواز اوپر کسی فرد کے کان میں نہ پڑ جائے، نہیں جانتی تھی کہ جہاں تک پہنچنے سے وہ یہ گفتگو بچانا چاہ رہی ہے، وہاں تک یہ ساری گفتگو برابر پہنچ رہی ہے اس بات سے بےخبر آسیہ نے بیٹی کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''شریف لڑکی کی پہچان یہ ہے کہ شادی سے پہلے وہ کسی مرد کو شوہر کے روپ میں پسند نہیں کرتی۔ یہ وہ رشتہ ہے جو نکاح کے بندھن میں بندھنے کے بعد ہی اہم ہوتا ہے، اس سے پہلے جو کچھ ہے وہ سب سراب ہے اور دھوکا ہے۔''

''پلیز اماں! مجھے یہ سب مت سمجھائیں کیونکہ مجھے نہیں سمجھنا۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھے ماہیر سے شادی نہیں کرنا اور بس اب پلیز آپ مجھ سے بحث مت کریں ورنہ میں خود اوپر جا کر صاف انکار کر آؤں گی۔'' راشیل کی اکتائی ہوئی آواز جیسے ہی ماہیر کے کان سے ٹکرائی وہ ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا اس نے سوچا اس سے قبل کے بی جی باہر نکل کر اسے دیکھ کر شرمندہ ہو وہ دبے قدموں واپس پلٹا اور خاموشی سے اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ راشیل کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے، جو بات وہ جاننا چاہتا تھا آج اتفاق سے قدرت نے خود اس تک پہنچا دی۔ اب اسے اس انکار کی وجہ جاننے سے کوئی دل چسپی نہ تھی ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ خود اس رشتہ سے انکار کر دے تاکہ آسیہ بی جی کو پریشان نہ ہونا پڑے ورنہ یقیناً ان لوگوں کے احسانات تلے دبی آسیہ بی بی کو اس سے فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا اور اس کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو اس کی رضا کے بنا بھائی کی محبت پر قربان کر دے جبکہ ماہیر کو قربانی میں ملی عورت کا ساتھ قطعی قبول نہ تھا نہ ہی وہ رشتوں میں زبردستی کا قائل تھا۔

☆☆☆

آسیہ اور راشیل کے درمیان پچھلے کچھ دنوں سے ایک ان دیکھی خلیج حائل ہو گئی تھی جسے دونوں میں سے کوئی بھی پاٹنے کو تیار نہ تھا۔ آسیہ چاہ کر بھی یہ جان نہ پائی تھی کہ راشیل کے انکار کی وجہ کیا ہے، دوسری طرف راشیل سے موسیٰ نے تین چار دن کا وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی ماں سے بات کرے گا مگر ابھی تک اس کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ پا کر راشیل بھی خاموش تھی اور اس کی یہی خاموشی آسیہ کو کھل رہی تھی۔ خوف زدہ کر رہی تھی، وہ ڈر رہی تھی کہ کچھ ایسا نہ ہو جائے جو سالوں سے بنائی اس کی عزت خاک میں ملا دے۔

دونوں ماں بیٹیاں اپنی اپنی الجھن میں گھری تھیں جب ایک دن اچانک آنے والے موسیٰ کے فون نے راشیل کو زندہ کر دیا، وہ فوراً راشیل سے ملنا چاہتا تھا کیونکہ اسے ایک ضروری بات کرنا تھی اور وہ ضروری بات کیا ہو سکتی تھی۔ یہ راشیل بنا کہے بھی جان سکتی تھی، اب مسئلہ گھر سے تنہا نکلنے کا تھا۔ اماں کا موڈ آج کل ویسے ہی بہت خراب تھا، اب ان سے اجازت کیسے لے، ساری دوپہر اسی کشمکش و پیچ میں گزر گئی، جب دن ڈھلے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ بھاگم بھاگ ماں کے پاس جا پہنچی، اتنے دنوں بعد آسیہ اسے اپنے پاس دیکھ کر حیران تو بہت ہوئی مگر منہ سے بولی کچھ نہیں، جاننا چاہتی تھی کہ بیٹی کیا کہتی ہے۔ اس لیے خاموشی سے اپنی جگہ یہی وہ تیش رپا کرتی رہی جو آج شام ہی سامنے والی استانی کو پہنچائی تھی بالکل اس طرح جیسے وہ راشیل کی کمرے میں موجودگی سے واقف ہی نہ ہو بالآخر راشیل کو خود ہی بات کرنا پڑی۔

''اماں مجھے کل کالج جانا ہے میڈم نے بلوایا ہے کوئی اردو کانفرنس ہے اس میں شرکت کے لیے وہ مجھے بھی انوائٹ کر رہی ہیں۔''

''انہیں منع کر دو تمہیں تنہا گھر سے باہر بھیجنے کی اذیت اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ جانتی ہو جب تم گھر سے باہر جاتی ہو مجھے لگتا ہے کسی نے میری سانس بند کر دی ہو اور جب تک تم واپس گھر نہیں آ جاتیں، مجھے اپنا جسم مردہ محسوس ہوتا ہے۔''

''حد ہے اماں! میں کوئی انوکھی لڑکی ہوں جو گھر سے باہر پڑھنے نکلتی ہوں، ساری دنیا بھری پڑی ہے میرے جیسی لڑکیوں سے۔''

راشیل نے تنک کر جواب دیا کیونکہ وہ شروع سے ہی آسیہ کی ایسی باتوں سے چڑتی تھی کسی دوست کے گھر نہیں جانا۔ کالج سے تنہا باہر نہیں نکلنا اسے لگتا شاید یہ ساری پابندیاں اسی کے لیے ہیں ورنہ دنیا کی ہر لڑکی آزاد ہے۔

''میں دنیا کی ساری لڑکیوں کی ٹھیکے دار نہیں ہوں۔''

آسیہ حتمی لہجہ میں بولی اب ضروری تھا راشیل اپنا رویہ نرم کرے تاکہ ماں کو پیار و محبت سے پھسلایا جا سکتا۔

''پلیز اماں مومنہ بھی تو اپنی دوستوں کے گھر جاتی ہے، میں تو صرف کالج جانا چاہ رہی ہوں۔'' ماں کے گلے میں بازو حمائل کرتی وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''بے شک مومنہ ہر جگہ جا سکتی ہے کیونکہ وہ باپ بھائی والی ہے پھر اسے کسی سے کوئی خطرہ بھی نہیں جب کہ......''

اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر آسیہ اک دم خاموش ہو گئی جب کہ موسیٰ کے خیالوں میں گم راشیل کو اس طرح اچانک خاموش ہو جانے کا ذرا بھر احساس نہ ہوا۔

''میرا اگر باپ یا کوئی بھائی نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور۔'' رندھی آواز کے ساتھ بولتی وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی، جب آسیہ کو اپنے سخت رویہ کا احساس ہوا۔

''اچھا ٹھیک ہے، چلی جانا میں ماہیر سے کہوں گی ساتھ چلا جائے گا۔''

''آپ رہنے دیں میں نے اپنی دوست کے ساتھ جانا ہے۔'' بظاہر منہ بنائے وہ اپنے لہجہ کی خوشی چھپاتے ہوئے بولی۔

''ٹائم سے گھر واپس آ جانا، تم جانتی ہو نا اگر تمہیں ذرا سی دیر ہو جائے تو میرا کلیجہ منہ کو آ جاتا ہے۔''

''اچھا......''

ماں کی پوری بات سنے بغیر اچھا کہتی، راشیل جلدی سے اپنے کمرے کی جانب بھاگی تاکہ موسیٰ کو کل کی ملاقات کا گرین سگنل دے سکے۔

☆☆☆

وہ ساری رات ماہیر نے آنکھوں میں کاٹ کر گزار دی، آنکھ لگتی ضرور مگر چند ہی لمحوں بعد خود بخود کھل جاتی۔ راشیل کی باتوں نے اسے کئی دنوں سے بےچین کر رکھا تھا فی الحال تو شادی کے لیے اس نے بابا کو بہت سہولت سے منع کر دیا تھا کہ اسے جرمنی کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہے۔ وہاں سے واپس آ کر شادی کرے گا ابھی آپ لوگ راشیل سے کوئی بات مت کریں، اس کے اس طرح یک دم انکار نے نور کو چونکایا ضرور، مگر بولی کچھ نہیں کیونکہ وہ بی جی کی باتوں سے یہ اندازہ لگا چکی تھیں کہ وہ بھی راشیل کی طرف سے کچھ پریشان تھیں اس لیے انہیں کریدنے سے زیادہ بہتر تھا کہ خاموشی اختیار کر کے فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا جائے اور ایسا ہی نور نے کیا جبکہ ماہیر اپنی طرف سے ہر معاملہ سلجھانے کے باوجود خود الجھ گیا تھا۔

پچھلے ایک دو دن دنوں سے تو ایک انجانی سی بے چینی اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھی، جس کی وجہ سے اسے سمجھ میں نہیں آرہی تھی، ابھی بھی کروٹیں بدلتے ہوئے اسے کافی ٹائم ہو گیا جب نیند نہ آئی تو کمرے سے باہر نکل آیا، آہستہ آہستہ چلتا چھت کی منڈیر پر آن کھڑا ہوا۔ جب بے دھیانی میں نظر نیچے صحن میں جا پڑی، جہاں موجود راشیل یقیناً کسی سے فون پر بات کر رہی تھی بے شک وہ اندھیرے میں تھی پھر بھی چاند کی مدھم روشنی میں اس کے کان سے لگے سیل کی جھلملاتی ہوئی نیلی لائٹ اسے اوپر سے صاف دکھائی دے رہی تھی وہ یک دم چونک گیا۔ رات کے اس پل، اس طرح اندھیرے میں بیٹھی راشیل کا فون پر بات کرنا اسے کئی کہانیاں سنا رہا تھا۔ اسے سمجھ میں آ گیا کہ راشیل کے اس طرح صاف انکار کے پس پردہ کیا حقائق تھے، ضرور وہ کسی کو پسند کرتی تھی مگر کون؟ اور یہ بات بی جی کیوں نہیں جانتیں؟

ماہیر غصہ کے ساتھ ساتھ ڈر بھی گیا اس کا دل چاہا ابھی نیچے جا کر راشیل کو پکڑے اور سیدھا بی جی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دے تا کہ پتا تو چلے کہ وہ کون ہے۔ جس کے ساتھ نے راشیل کو اتنا بے وقوف کر دیا کہ وہ اندر کمرے میں ماں کی موجودگی کے باوجود اتنی دیدہ دلیری سے باہر صحن میں فون لیے بیٹھی ہے۔ کچھ دن قبل اس نے یہ دیکھا ہوتا تو وہ ایسا ضرور کرتا مگر اب بات اور تھی اس لیے وہ اپنا غصہ ضبط کرتا خاموشی سے منڈیر سے نیچے اتر آیا لیکن دل میں یہ عہد ضرور کیا کہ موقع ملتے ہی وہ بی جی سے بات ضرور کرے گا تا کہ کہیں انجانے میں وہ کسی بڑے نقصان کا شکار نہ ہو جائیں۔ نہیں جانتا تھا کہ ایسا موقع اسے اب نہیں ملنا کیونکہ وقت کی طنابیں کسی اور کے ہاتھ میں ہیں جو ہماری زندگی کے فیصلے کرتا ہے اور اس نے بھی فیصلہ کر دیا تھا کہ راشیل کی زندگی میں کیا لکھا جا چکا ہے یا شاید اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں راشیل نے اپنی تقدیر پر سیاہی پھیر دی تھی۔

☆☆☆

جب سے تو نے مجھے اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے
سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے

گاڑی میں گونجتی عابدہ پروین کی آواز اور اے سی کی خنکی میں موسیٰ کے جسم سے پھوٹتی کلون کی خوشبو نے راشیل کو اتنا مسحور کر رکھا تھا کہ اسے ٹائم کا اندازہ ہی نہ ہوا جب اچانک اس کی نگاہ گیئر تبدیل کرتے موسیٰ کے ہاتھ پر پڑی جس کے بازو پر سلور جگمگاتی گھڑی چار بجا رہی تھی وہ یک دم چونک اٹھی، گھبرا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کی مگر کالے شیشوں کے اس پار ڈھلتے دن کا اندازہ کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ موسیٰ کی جانب پلٹی اسے احساس ہوا وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے سفر میں ہے۔

وہ صبح گیارہ بجے سے موسیٰ کے ساتھ تھی، جس نے وعدہ کیا تھا کہ لنچ کے بعد وہ اسے گھر چھوڑ دے گا لیکن لنچ کرتے ہی اس کا پروگرام بدل گیا اور وہ اچانک ہی راشیل سے پوچھ بیٹھا۔

''میری امی سے ملو گی؟''

''کہاں ہیں وہ؟'' حیرت سے راشیل نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھا۔



''ظاہر ہے گھر ہی ہوں گی، آ جاؤ تمہیں اپنے گھر لے کر چلوں۔''

ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھاتا وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور موسیٰ کی امی سے ملنے کی راشیل کی دلی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ مارے خوشی موسیٰ سے یہ بھی پوچھنا بھول گئی کہ اس کا گھر کہاں ہے؟ اور پھر گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے لگا وہ موسیٰ کے سنگ ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ ایک عجیب سی سرشاری کا عالم تھا جس نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا اور مدہوش راشیل کو جب ہوش آیا تو پتا چلا شام کے چار بج چکے ہیں اور موسیٰ کا گھر ابھی بھی نہیں آیا تھا اب خیال آیا اس نے تو آج تک یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ موسیٰ رہتا کہاں ہے؟ لیکن اب پوچھے بنا کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ آس پاس دکھائی دیتے نظاروں سے اس کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ اس وقت وہ کہاں سفر کر رہی ہے اس لیے اس نے پلٹ کر موسیٰ کو دیکھا اور جلدی سے بولی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ابھی تک آپ کا گھر نہیں آیا۔'' موسیٰ نے اس کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

''آ جائے گا میرا گھر، اتنی جلدی کیا ہے میری جان۔'' سگریٹ کا کش لگا کر اس نے دھواں راشیل کے منہ پر چھوڑ دیا اور راشیل جو ہمیشہ سے موسیٰ کی اس ادا کی دیوانی تھی، اس سے کسی اور ہی خیال میں جکڑی، گھبرا اٹھی۔

''مگر موسیٰ! آپ کا گھر ہے کہاں ہم تو کب سے سفر کر رہے ہیں شاید دو گھنٹے سے اور مجھے تو یہ کوئی ہائی وے لگ رہا ہے؟ کہاں جا رہے ہیں ہم؟''

یکے بعد دیگرے اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے، اسے اندازہ ہوا کہ اس طرح تو گھر واپس جاتے جاتے اسے رات ہو جائے گی اور ایسے میں ''ماں'' وہ تو شاید میرے غم میں مر جائے گی۔ اسے لگے گا کہ میں جانے کہاں چلی گئی ہوں اور پھر ماما، ماہیر سب کتنے پریشان ہوں گے۔

''پلیز موسیٰ! آپ مجھے گھر واپس چھوڑ دیں کیونکہ میرے پاس سیل فون نہیں ہے اور نہ ہی میرے گھر والے جانتے ہیں کہ میں کہاں ہوں ایسے میں، میں اگر مزید دو، چار گھنٹے باہر رہی تو میری امی کو مارے گھبراہٹ کچھ ہو جاتا ہے۔'' راشیل نے دیکھا موسیٰ بنا اس کی کسی بات کا جواب دیے خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

''موسیٰ...... آپ میری بات سن رہے ہیں؟''

کبھی کھڑکی سے باہر اور کبھی موسیٰ کو دیکھتی راشیل ایک دم ہی چلا اٹھی۔

''بہرا نہیں ہوں، آہستہ بولو۔ ویسے بھی مجھے تیز آواز میں بولتی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔'' موسیٰ نے اس کے ماتھے پر جھولتی بالوں کی لٹ کو اپنی شہادت کی انگلی سے ہلکا سا چھوا اور مسکرا دیا۔

''میں پوچھ رہی تھی ہم کہاں جا رہے ہیں؟ آپ کا گھر کہاں ہے؟''

''ڈرو مت میری جان! نہ تمہیں اغوا کروں گا اور نہ ہی کھا جاؤں گا۔ صرف اپنی امو جان اور دا جی سے ملوا کر واپس گھر چھوڑ آؤں گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''پلیز موسیٰ! پانچ بجنے والے ہیں، مجھے کہیں نہیں جانا، آپ مجھے واپس میرے گھر چھوڑ دیں۔'' وہ ملتجی لہجہ میں بولی۔

''اب تو مشکل ہے، ہم کراچی سے کافی دور نکل آئے ہیں۔''

''کراچی سے دور......'' راشیل کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''ہاں...... کیونکہ میری فیملی کوئٹہ میں رہتی ہے، انہیں کراچی بالکل پسند نہیں۔ خاص طور پر دا جی جو پچھلے بیس سالوں سے کبھی کراچی نہیں آئے، کہتے ہیں یہ بے وفا شہر ہے کسی کو وفا نہیں دیتا بلکہ دھوکا دینے والوں کو اپنے دامن میں پناہ دے دیتا ہے لیکن میں تمہیں ان سے ملوا کر یہ ثابت کروں گا کہ وہ غلط کہتے ہیں کراچی بے وفا نہیں ہے اور نہ ہی یہ دھوکا دینے والوں کی پناہ گاہ ہے بلکہ بے وفا تو یہاں کے لوگ ہیں جو چند لمحوں کی محبت میں اپنے پیاروں کو چھوڑ جاتے ہیں کیوں سچ کہہ رہا ہوں نا میں؟''

وہ کیا کہہ رہا تھا راشیل کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کا تو یہ سوچ کر ہی خون خشک ہو گیا تھا کہ گوڈے گوڈے محبت میں ڈوبی مدہوشی کی رتھ پر سوار وہ نہ صرف اپنے پیاروں بلکہ شہر سے بھی دور ہو گئی ہے اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ اس کے پیچھے اس کی ماں اور گھر والوں کا کیا بنے گا؟ اپنی ماں کا خوف اسے آج سمجھ میں آیا کیوں وہ بیٹی کے ہونے سے خوف زدہ تھی۔ کیوں چاہتی تھی کہ وہ کبھی تنہا گھر سے باہر نہ جائے یہ خیال آتے ہی وہ سسکی لے کر رونے لگی مگر موسیٰ گونگے اور بہرے کی مانند خاموشی سے سامنے روڈ پر نگاہیں جمائے تیزی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور اس ایک ایک پل میں

راشیل اپنے گھر سے بہت دور ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

ماہیر کی موٹر سائیکل کی آواز سنتے ہی بی جی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئیں۔ ماہیر نے دیکھا وہ کافی پریشان تھیں، وہ ڈر گیا جلدی جلدی موٹر سائیکل کو دروازے کے پاس کھڑا کرکے وہ اترا اور بی جی کی جانب بڑھا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو، سب ٹھیک تو ہے نا؟"

"راشیل صبح سے کالج گئی ہے، ابھی تک واپس نہیں آئی۔"

"اوہ......"

جو خدشہ پچھلے کچھ دنوں سے ماہیر کو پریشان کررہا تھا وہ سچ نکلا۔ اسے افسوس ہوا کہ کیوں نہ بی جی کو پہلے خبردار کیا؟ کیوں نہ بتایا کہ راشیل رات کے اندھیرے میں چھپ کر کسی سے باتیں کرتی تھی مگر اب کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا، اس نے خاموشی سے یہاں وہاں دیکھا۔ گلی میں کوئی ان کی بات سن رہا ہو پھر بھی احتیاط ضروری تھی، اس لیے بنا کچھ کہے خاموشی سے بی جی کا ہاتھ تھامے، گھر کے اندر داخل ہوگیا جہاں سامنے ہی چارپائی پر پریشان حال نور بیٹھی تھیں جبکہ مومنہ شاید اوپر تھی۔

"آپ نے اسے فون کرکے دیکھا ہے؟" اپنی پینٹ کی جیب سے فون نکالتے موئی نے آہستہ سے سوال کیا۔

"اس کا فون گھر پر ہی رکھا ہے، کہہ رہی تھی فائن آرٹ کی ٹیچر نے بلایا ہے ان سے مل کے دو چار گھنٹے میں گھر آجاؤں گی۔ مجھے کیا پتا تھا وہ گھر ہی نہ آئے گی۔" بات کرتے کرتے آسیہ نے رونا شروع کردیا، ماہیر خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"جس دن یہ پیدا ہوئی تھی میں تب سے ہی ڈرتی تھی مجھے لگتا تھا کہ میرے کیے کا بدلہ تقدیر اس سے لے گی۔ سچ کہتے ہیں ماں باپ کا بھگتان اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔" روتے ہوئے بی جی کیا کہہ رہی تھیں ماہیر کو کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا جبکہ زمان جو اس وقت ہی وہاں آئے تھے، روتی ہوئی آسیہ کو کندھے لگا کر تسلی دینے لگے۔

"پریشان مت ہو، آجائے گی۔"

"وہ میری بیٹی کو لے گیا ہے لالا! میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس دن بازار میں کوئی اور نہیں وہ ہی تھا۔ میں اسے آج بھی لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں، بھلا کوئی اپنوں کو بھی بھول سکتا ہے، چاہے وہ کتنے ہی دشمن کیوں نہ ہوجائیں۔"

روتے ہوئے آسیہ زمین پر بیٹھ گئی، نور بھی اس کے ساتھ ہی نیچے آن بیٹھیں۔ انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اس عورت کو کیسے تسلی دے جو اس سے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے کو کھو جانے کے خوف میں مبتلا ہلکان ہورہی ہے اور سچ تو یہ تھا جیسے جیسے گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں آسیہ کے ساتھ ساتھ زمان، نور، مومنہ اور ماہیر کو بھی اپنی سانسیں بند ہوتی محسوس ہورہی تھیں۔ انہیں سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ اگر رات راشیل گھر نہ آئی تو کیا ہوگا؟ لیکن گزرے وقت نے انہیں سمجھا دیا کہ کسی کے نہ آنے سے کچھ نہیں ہوتا، سوائے اس کرب کے جو اس لمحہ وہاں موجود ہر شخص محسوس کررہا تھا۔

☆☆☆

اسے اس کمرے میں قید جانے کتنا ٹائم گزر گیا تھا، شاید ایک دن یا ایک رات یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ پریشانی میں اس کے حواس کام نہیں کررہے تھے، ابھی تک وہ ایک بات نہیں سمجھ سکی تھی کہ موئی نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ آج اسے یاد آرہا تھا کہ کیوں اس کی ماں، اس کے گھر سے باہر جاتے ہوئے اتنی خوف زدہ ہوتی تھی یقیناً اسی خوف کے پیچھے کوئی ایسی وجہ ضرور تھی جس کا تعلق موئی سے تھا۔ کیا اس کی ماں موئی کو جانتی تھی؟ کیا اسے یقین تھا کہ راشیل کی زندگی میں کوئی حادثہ رونما ہونے والا ہے؟ یہ وہ سوال تھے جنہوں نے راشیل کو بے چین کر رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ کافی دیر سے اس تنگ و تاریک کمرے میں ٹہل رہی تھی بالآخر اس کی ٹانگیں شل ہوگئیں۔

جب بیرونی دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی، یہ آواز آج کئی گھنٹوں بعد اس نے سنی تھی ورنہ موئی تو اسے جب سے یہاں چھوڑ کر گیا تھا شاید بھول ہی گیا تھا اور وہ بھوکی پیاسی پچھلے کئی گھنٹوں سے اس قید تنہائی کا شکار تھی۔ اسی سوچ میں گم تھی جب بیرونی دروازہ کھول کر موئی اندر داخل ہوا مگر وہ تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ وہیل چیئر پر ایک بوڑھا آدمی اور ایک عورت بھی تھی۔ آہستہ آہستہ وہیل چیئر دھکیلتے شخص کو موئی نے راشیل کے سامنے لا کھڑا کیا، جو انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ ساکت و سامت ہوگئی تھی۔

"یہ نجمتہ تو نہیں ہے؟" بوڑھے نے راشیل کو دیکھتے ہوئے موئی سے سوال کیا۔

"اس کی بیٹی ہے بابا! اپنی ماں ہی کی طرح آوارہ، محبت کے نام پر اپنے پیاروں کو دھوکا دینے والی، ماں کے کرتوتوں کی سزا۔ اسے خود اس کی اولاد نے ہی دے دی۔" اس سے قبل کہ موئی کوئی جواب دیتا اس کے ساتھ کھڑی عورت نفرت سے زہر اگلتی راشیل کے پاس آن کھڑی ہوئی اس کی باتیں سن کر راشیل کو حیرت ہوئی۔

"میری ماں کا نام نجمتہ نہیں ہے یقیناً آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، وہ تو آسیہ ہیں پلیز آپ لوگ مجھے گھر جانے دیں ورنہ میری امی نے خودکشی کرلینی ہے۔"

"کچھ نہیں ہوتا اسے، بہت ڈھیٹ عورت ہے وہ۔ باپ بھائی سب سے رشتہ توڑ کر جس سے ناتہ جوڑا تھا اسے بھی کھا گئی اور اب وہ تمہیں بھی کھا جائے گی۔" وہیل چیئر پر بیٹھے شخص نے نفرت سے منہ بناتے ہوئے زمین پر تھوکا۔

"مار کر اس کی لاش نجمتہ کو بھیج دو تاکہ اسے پتا چلے اولاد کی دوری کا دکھ کیسا ہوتا ہے اور اگر اولاد ایسی بے غیرت بھی ہو جو غیروں سے یاری میں اپنوں کی قربانی دے تو یقین جانو اس کے ماں باپ جیتے جی مرجاتے ہیں جس نے ایسی بیٹی پیدا کی اسے جینے کا کوئی حق نہیں۔"

یہ سب لوگ کیا کہہ رہے تھے راشیل کی سمجھ میں نہیں آیا جب وہ تیزی سے خاموش کھڑے موئی کی جانب بڑھی اور روتے ہوئے بولی۔

"پلیز موئی! مجھے میرے گھر واپس چھوڑ آؤ، یقین جانو میں کسی نجمتہ کو نہیں جانتی۔ تمہیں تمہاری امو جان کی قسم موئی! مجھے واپس چھوڑ آؤ۔"

"اسے جانتی ہو؟" اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی اسکرین آن کرکے موئی نے اسے جیسے ہی راشیل کے سامنے کیا وہ حیرت سے اچھل پڑی کیونکہ چادر اوڑھے نظر آنے والی عورت کوئی اور نہیں یقیناً اس کی ماں تھی جسے وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ یہ تصویر شاید اس وقت کھینچی گئی تھی جب آسیہ گھر سے باہر تنہا کسی کام سے گئی ہو۔ راشیل کے ذہن میں جھماکا ہوا، اسے کچھ ماہ قبل اپنی ماں کا خوف زدہ ہونا یاد آگیا۔

"کون ہو تم لوگ؟" موبائل اپنی نظروں کے سامنے سے ہٹاتی وہ موئی سے جواب طلب تھی، اسے اپنی ماں کا خوف اب سمجھ میں آرہا تھا۔

"اتنی کیا جلدی ہے سب پتا لگ جائے گا، ٹینشن نہ لو۔" موئی اس کی جانب دیکھتا ہوا مسکرایا۔

"اُف اللہ، وہ ہی ظالم مسکراہٹ جس نے آج اسے اس حال تک پہنچایا۔" راشیل نے نفرت سے اپنی نظریں پھیرلیں۔

"میں تمہارے لیے کھانا بھجوا رہا ہوں، کھالو پھر تمہیں واپس گھر چھوڑ آؤں گا۔"

وہیل چیئر دروازے کی سمت موڑتے ہوئے جیسے ہی وہ بولا، بوڑھا شخص چلا اٹھا۔

"ہم نے تم کو بولا ہے اس کو ماردو، یہ زندہ واپس نہیں جانا چاہیے۔ اس کی ماں کے پاس اس کا لاش جائے تاکہ اس خانہ خراب کی بچی کو پتا چلے، گھر کیسے برباد ہوتا ہے۔ اولاد کی بے غیرتی کا دکھ کیسا ہوتا ہے۔"

PakiBooks.Site

"داجی ......" موسیٰ نے ان کے کندھے پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھا اور بولا۔ "موت کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ اصل بدنامی تو وہ ہے جب تین دن بعد زندہ بیٹی لاش کی مانند اپنے گھر جائے، ان سوالوں کا جواب دینا ہی اصل بدلہ ہے جو اس کی گم شدگی کے حوالے سے لوگ کریں گے پھر اس کی ماں کو پتا چلے گا جوان بیٹی کا گھر سے غائب ہو جانا، کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔"

"تین دن ......" اس ساری گفتگو میں ایک یہ ہی لفظ تھا جو راشیل کے دماغ میں گھس کر اسے جیسے سُن کر گیا، وہ بے چین ہو اٹھی۔

"میں تین دن سے اپنے گھر نہیں گئی۔" اس نے حیرت سے دہرایا اور زوردار آواز میں رونے لگی جبکہ اس کی آہ و بکا پر دھیان دیے بنا کمرے میں موجود ہر شخص باہر نکل گیا۔ دروازہ ایک بار پھر سے بند کر دیا گیا اور پھر اس کمرے کی تنہائی میں روتی بلکتی راشیل کو خاموش کروانے والا کوئی فرد نہ رہا، ایسے میں اسے اپنی ماں بے طرح یاد آئی۔

"کاش امی! میں نے آپ کی بات مان لی ہوتی، کاش میں محبت میں باغی نہ ہوتی، کاش ......"

اب اس کے پاس سوائے اس کاش کے کچھ باقی نہ بچا تھا۔

☆☆☆

ڈھلتی شام کے سائے صحن میں اتر آئے تھے، صبح سے رزق کی تلاش میں نکلے پرندے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے جب بیرونی دروازے پر کسی نے ہلکے سے مخصوص انداز میں دستک دی۔ چارپائی پر نیم مردہ حالت میں پڑی آسیہ کے بدن میں گویا بجلی بھر گئی، وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی جبکہ مومنہ نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ باہر آخری سیڑھی پر سفید چادر اوڑھے راشیل کھڑی تھی، ستے ہوئے چہرے اور روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ لٹی پٹی راشیل، اس سے قبل کہ مومنہ کچھ کہتی وہ خاموشی سے اس کے قریب سے گزرتی اندر آ گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ سامنے چارپائی پر بیٹھی آسیہ پر پڑی، جو بیٹی کو اپنے سامنے دیکھتے ہی خوشی سے گنگ ہو گئی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں کے بند توڑ کر گالوں پر لڑھک رہے تھے۔

آہستہ آہستہ چلتی راشیل ماں کے قدموں میں جا بیٹھی، مومنہ نے دیکھا وہ بھی رو رہی تھی، آسیہ بھی رونے لگی۔ رونے کی آواز شاید اوپر والے پورشن میں بھی سنی جا چکی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی جو تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آتی نور کی نظر جیسے ہی راشیل پر پڑی وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ اس کے ساتھ ماہیر بھی تھا جو تیزی سے آگے بڑھا اور زمین پر بیٹھی راشیل کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟ جس کے ساتھ گئی تھیں اس نے رکھا نہیں جو دوبارہ لوٹ کر یہاں آ گئی ہو۔"

اپنے لیے کچھ دن قبل سنے گئے راشیل کے الفاظ آج اسے بری طرح یاد آ کر تڑپا گئے، جس کے ردعمل کے طور پر اس لمحہ اس کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت اور غصہ کی آگ تھی جو شاید اسی پل ساری دنیا کو جلا کر بھسم کر دیتی، اس کے کسی بھی سوال کے جواب میں راشیل خاموش تھی۔ ایسے جیسے اس کے لبوں کو کسی نے سی دیا ہو یا وہ اپنی قوت گویائی سے محروم ہو گئی ہو۔

"چھوڑو اسے ماہیر۔" نور نے آگے بڑھ کر بیٹے سے اس کا بازو چھڑوایا۔ "بی جی خود پوچھ لیں گی اس سے، تم اوپر جاؤ۔" بیٹے کے غصہ سے ڈرتی ماں نے اسے بازو سے پکڑ کر سیڑھیوں کی جانب دھکیلا مبادا وہ کوئی ایسی جذباتی حرکت نہ کر بیٹھے جو بعد میں سوائے پچھتاوے کے انہیں کچھ نہ دے۔

"اسے کہیں اماں! یہ یہاں سے چلی جائے ورنہ ایسا نہ ہو میں اسے مار دوں۔"

ماہیر ایسا نہیں تھا جیسے الفاظ آج وہ ادا کر رہا تھا، وہ تو خاصا تحمل والا، سلجھا ہوا لڑکا تھا مگر شاید کچھ دن راشیل کے گھر سے باہر رہنے نے اس کی غیرت پر کاری ضرب لگائی تھی جس کا ردعمل اتنا شدید تھا کہ وہ غصہ کی زیادتی سے اپنے حواس کھو بیٹھا۔

"تم اوپر جاؤ۔" زمان ماما جو کافی دیر سے سیڑھیوں پر کھڑے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے، دھیمی آواز میں چلائے ان کی آواز سنتے ہی ماہیر دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چلا گیا اور پھر ان کے اشارے پر ہی نور اور مومنہ بھی وہاں سے اٹھ گئیں تاکہ دونوں ماں بیٹی کو تنہا چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس وقت ان دونوں کے لیے ایک دوسرے سے بات کرنا بہت ضروری تھا، جس کے لیے تنہائی لازمی تھی۔

☆☆☆

"ہاں میرا اصلی نام خجستہ جان ہے۔"

دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتی آسیہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بیٹی پر نظر ڈالی، راشیل نے دیکھا اس لمحہ اس کی ماں کے چہرے پر دنیا جہاں کا کرب چھایا ہوا تھا۔



"موسیٰ، عبدالرحمٰن کا بیٹا ہے جسے میں نے اس دن ہی پہچان لیا تھا جب مارکیٹ میں دیکھا تھا کیونکہ وہ ہو بہو اپنے باپ جیسا ہے۔ شکل کے ساتھ عادتوں میں بھی ویسا ہی ہے، خشک سرد مزاج اور ظالم۔" آخری لفظ آسیہ کے سرسراتے لبوں سے ایسے نکلا کہ راشیل چونک اٹھی۔

"عبدالرحمٰن میرے چاچا کا بیٹا تھا جو میرے ابا کے ساتھ ہی ٹرک چلاتا تھا اور مجھ سے کوئی پندرہ سال بڑا تھا۔ ثریا اس کی بیوی تھی جو ہر وقت اپنے شوہر کے ظلم کا شکار رہتی۔ ظالم جب غصہ میں ہوتا اپنی بیوی کو کسی جانور کی طرح مارتا اور ایک دفعہ تو ایسی مار ماری کہ اس کی کمر کی ہڈی توڑ دی اور پھر جو وہ بستر پر پڑی تو مر کر دنیا ہی چھوڑ گئی۔"

"تو کیا موسیٰ کی ماں نہیں ہے؟" راشیل نے چونک کر ماں سے سوال کیا۔

"نہیں ......"

"تو پھر وہ کون تھی، اس کی امو جان ......؟"

جیسے جیسے کہانی آگے بڑھ رہی تھی راشیل کی حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"موسیٰ تو پانچ سال کا تھا جب ثریا نے عبدالرحمٰن کے ظلم کے سامنے ہار مان کر یہ دنیا چھوڑ دی۔ میں محض چودہ سال کی تھی اور میرا رشتہ عبدالرحمٰن سے طے کر دیا گیا جس کے پیچھے دو مقاصد تھے ایک تو کم عمر موسیٰ جس کی پرورش شاید کوئی دوسری عورت نہ کر سکتی کیونکہ جو بھی تھا عبدالرحمٰن اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتا تھا اور دوسرا میری بیمار ماں۔ اگر میں بیاہ کر کہیں اور چلی جاتی تو ماں کی خدمت کون کرتا؟" آسیہ نے راشیل کی کسی بھی بات کا جواب دیے بنا اپنی کہانی جاری رکھی جبکہ راشیل خاموش اس کے سامنے بیٹھی ایک ایک لفظ اپنی دل کے اندر اتار رہی تھی۔ اپنی ماں کے اندر کی گہرائی آج اس کے سامنے پرت در پرت اس طرح کھل رہی تھی کہ راشیل کا وجود پگھل رہا تھا۔

"مجھے عبدالرحمٰن سے نفرت تھی کیونکہ میں بھابھی ثریا کی ہم راز تھی پھر بتاؤ میں کیسے عبدالرحمٰن سے شادی کر لیتی؟" اپنی ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے وہ اچانک ہی راشیل کو مخاطب کر بیٹھی۔

"کیا سب کچھ جان کر کوئی لڑکی عبدالرحمٰن جیسے خرانٹ مرد کے ساتھ ساری زندگی بتانے کا سہانہ سپنا دیکھ سکتی تھی، نہیں نا۔" خود ہی سوال اور خود ہی جواب دے کر آسیہ جیسے مطمئن ہو گئی۔

"شومئی قسمت میں عبدالرحمٰن سے بچنے کی تدبیر ڈھونڈ رہی تھی، جب اماں کو علاج کے لیے پنجاب کے ایک گاؤں لے جانا پڑا، جہاں کے حکیم صاحب کا پتا بابا کو کسی دوسرے ٹرک ڈرائیور نے دیا تھا اور ظاہر ہے میرا ساتھ جانا ضروری تھا اور اس طرح وہاں میری ملاقات امتیاز سے ہوئی۔ سانولا سلونا امتیاز جو شہر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اتفاق سے ہی اپنے گاؤں آیا جہاں وہ مجھ سے ٹکرایا اور ہماری محبت کا ایسا آغاز ہوا کہ صرف ایک ماہ میں ہی مجھے ایسا لگا اگر یہ مجھے نہ ملا تو شاید میں مرجاؤں یا

ہوسکتا ہے یہ عبدالرحمٰن سے فرار حاصل کرنے کی میری لاشعوری کوشش بھی ہو۔ جو بھی تھا میں اپنی نادانی کے ہاتھوں سب کچھ بھلا کر امتیاز کے ساتھ بھاگ کر کراچی آ گئی جہاں ہم نے نکاح کرلیا۔" تھکی ہاری آسیہ نے دیوار سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں بھریں، وہ خاموش ہوگئی تو راشیل جیسے بے چین ہو اٹھی۔

ابھی تو کئی سوالوں کے جواب باقی تھے اگر اماں کا تعلق موسیٰ کے خاندان سے تھا تو ماما زمان کون تھے؟ اموجان کون تھیں؟ جانے کیوں راشیل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے انہیں کہیں دیکھا ہے، کہاں یہ اسے یاد نہ آ رہا تھا۔

"پھر اماں؟ پھر کیا ہوا؟" اس کی بے قرار آواز پر آسیہ نے اپنی بند آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"وہ ہی جو ہوتا ہے، امتیاز کو کچھ ہی دنوں بعد گاؤں سے یہ خبر ملی کہ میرے بدلے اس کی بہن خان کے حوالے کردی گئی ہے۔ رانی جو محض بارہ سال کی تھی، یہ سن کر میرا دل دہل گیا کہ اب یہ بچی عبدالرحمٰن کے نکاح میں دے دی جائے گی اور ظلم کی ایک نئی داستان شروع ہو جائے گی مگر ایسے وقت میں ہم دونوں کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہم مجبور تھے اگر امتیاز اپنے گھر والوں کی مدد کے لیے گاؤں جاتا تو دھر لیا جاتا اور پھر اسے جان سے مار کر لاش خان کو بھیج دی جاتی۔ شہر میں ہی میری پہلی ملاقات زمان لالا سے ہوئی جن کا تعلق ہمارے گاؤں سے تھا مگر وہ کئی سال قبل روزگار کی تلاش میں شہر منتقل ہو گئے تھے۔ وہ عبدالرحمٰن کو جانتے تھے اور پھر ہمیں زمان لالا نے بتایا کہ رانی کا نکاح میرے بڑے بھائی گل جان سے کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کیونکہ گل جان اپنی فطرت و عادات کے لحاظ سے عبدالرحمٰن سے بہت بہتر تھا۔ میری اور امتیاز کی زندگی کی پرسکون رواں دواں ندی میں اس دن ایک بار پھر سے طوفان آیا جب ایک رات آفس سے واپسی پر تمہارے بابا کو ایک تیز رفتار ٹرک نے کچل

دیا۔ اس خبر نے دکھ کے ساتھ ساتھ مجھے خوف زدہ بھی کر دیا کیونکہ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ امتیاز کو مارنے والا کوئی اور نہیں بلکہ میرا سگا باپ تھا جبکہ عبدالرحمٰن نے تو کبھی امتیاز کو دیکھا بھی نہ تھا پھر بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بھی اس قتل کی سازش میں میرے باپ کے ساتھ شامل ہو کیونکہ ان دونوں کے دماغ ایک ہی جیسے تھے، شاطر اور انتقام سے بھرے ہوئے اور پھر انہوں نے اپنے اندر کا یہ انتقام بھرا جذبہ موسیٰ کی رگوں میں بھی اتار دیا۔ نفرت کا وہ درس جو میرے باپ نے تا عمر عبدالرحمٰن کو دیا اس کے ذریعہ موسیٰ تک منتقل ہو گیا اور اسی نفرت و انتقام میں گھرا موسیٰ تم تک پہنچ گیا اور اسی دن سے میں ڈرتی تھی میری بچی! مجھے لگتا تھا میرے کیے کی سزا یہ لوگ تجھے دیں گے۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں، جن کا دل امتیاز کی موت کے بعد بھی ٹھنڈا نہ ہوا اور انہوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا حالانکہ زمان لالا ان کے ظلم سے مجھے بچانے کے لیے وہ گھر اور محلہ چھوڑ کر یہاں آباد ہوئے اور آفرین ہے اس مرد پر جس نے مجھے بہن منہ سے بول کر ایسا نبھایا کہ میں شاید مر کر بھی ان کا قرض نہیں اتار سکتی۔ میرے جسم کا رواں رواں زمان لالا کے احسان کا قرض دار ہے، اس لیے ہی تو میں چاہتی تھی تُو ماہیر جیسے عزت دار مرد کی بیوی بن لیکن افسوس میرے اندر چھپی خجستہ جان کی تمام تر برائی تمہاری رگوں میں بھی اتر گئی۔ تم بھی عشق کی آگ میں جل کر اپنی ماں کی عزت کو داؤ پر لگا آئیں۔" آسیہ سسکیاں لے کر رونے لگی جب راشیل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیا۔

"خجستہ جان کوئی بری عورت نہیں تھی اماں! برے تو وہ لوگ تھے جو ایک عورت کو انسان نہیں سمجھتے اور میری بات کا یقین کرو ماں! میں گھر سے بھاگی نہیں تھی، مجھے تو موسیٰ اپنی امی سے ملوانے لے کر گیا تھا۔ میں نے موسیٰ سے محبت کی تھی اماں! کوئی گناہ نہیں۔ موسیٰ کی ماں......" آسیہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے راشیل کو دیکھا اس کے سوال کے

ساتھ ہی راشیل کے ذہن میں جیسے جھماکا ہوا۔

"اوہ خدایا......" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ "امو جان...... یعنی موسیٰ کی امو جان میری پھپھو تھیں وہ تو بالکل بابا جیسی تھیں سانولی سلونی، ڈری سہمی، خوف زدہ سی لیکن ان کی آنکھوں میں بے انتہا نفرت تھی جو شاید ہم سب کے لیے تھی اور آپ یقین کریں اماں! یہ تین دن میں نے صرف ایک کمرے میں تنہا گزارے مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا البتہ خان جی کا کہنا تھا کہ مجھے مار کر لاش آپ کو بھیجی جائے مگر موسیٰ نے ان کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں، میں آپ کے سامنے زندہ موجود ہوں اور کاش اماں آپ یہ سب باتیں پہلے مجھے بتا دیتیں تو شاید ایسا نہ ہوتا۔"

ماں کے گلے لگ کر راشیل روتے ہوئے بول رہی تھی اور اس کے الفاظ نے جیسے آسیہ کے جلتے بدن پر پانی کی پھوار برسا دی۔ یہ جان کر وہ شانت ہوگئی کہ بیٹی مکمل طور پر سلامت گھر آئی ہے اور کسی ماں کے لیے اس سے بڑی بات کوئی نہیں ہوتی کہ اس کی بیٹی کی عزت محفوظ ہو۔

☆☆☆

کج شوق سی یار فقیری دا
کج عشق نے درد رول دتا
کج سجن نے کسر نہ چھوڑی سی
کج زہر رقیباں گھول دتا
کج ہجر و فرق دا رنگ چڑھیا
کج درد ماہی انمول دتا
کج ساڈی قسمت بد قسمت دی
کج پیار وچ جدائی رول دتا

موسیٰ کے سامنے راشیل کی ڈائری کھلی پڑی تھی جس میں لکھی منیر نیازی کی یہ غزل وہ جانے کتنی بار پڑھ چکا تھا اور ہر بار اس آخری مصرعہ پر آ کر وہ رک جاتا۔ اس دوران ایک بے چینی نے اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ راشیل پر کی گئی اپنی دو سالہ محنت اسے خجل کر رہی تھی، محض اتنے پرانے

انتقام کی آگ میں جل کر وہ جانے کیا کر بیٹھا، ایک تعلیم یافتہ شخص کا اتنا جاہلانہ انتقام اب اسے شرمسار کر رہا تھا۔ وہ سمجھ ہی نہ پا رہا تھا کہ وہ کیا کرے، جب امیر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اسے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امیر نے دیکھا وہ نڈھال اور تھکا ہوا تھا، وہ خود بھی اس دن سے پریشان تھی جب سے راشیل کو دیکھا تھا اسے دیکھ کر جانے اس کے کتنے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ اپنا میکا ایک بھولی بسری یاد بن کر اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا اور آج کتنے ہی دنوں بعد امتیاز بھائی کی یاد نے اس کی دل کو بے کل کر دیا تھا جبکہ اس دن سے خان بابا بھی بالکل خاموش تھے، جب سے راشیل کو دیکھا تھا اپنے کمرے میں ایک ساکت و بے جان لاش کی مانند جس کی آنکھوں کے سوا سارے جسم سے گویا جان نکل گئی ہو۔ امیر جب انہیں دیکھتی ایسا محسوس ہوتا وہ کسی کے انتظار میں تھے شاید وہ خجستہ جان کے منتظر تھے اور یہ ہی بات کرنے آج وہ موسیٰ کے پاس آئی تھی کیونکہ یہ وہ فرد واحد تھا جو اس کی ہر بات سمجھ سکتا تھا۔

"مجھے خجستہ جان سے ملنا ہے۔" بنا کسی تمہید کے وہ خاموش بیٹھے موسیٰ سے مخاطب ہوئی جو اس کی بات سن کر چونک اٹھا۔

"مگر داجی...... وہ تو شاید آپ کو جان سے مار دیں۔"

"نہیں موسیٰ! اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ میں پچھلے کئی دنوں سے اس ظالم شخص کی آنکھوں میں ایک انتظار دیکھ رہی ہوں، ایک کرب ہے جو انہیں بے چین کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ بھی اپنی بیٹی سے ملنا چاہتے ہیں مگر شاید ان کے اندر کی غیرت اور انا انہیں یہ سب کہنے سے روک رہی ہے۔ اس لیے تم مجھے خجستہ کے پاس لے چلو، میں اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں اس ظلم کی جو ہم سب نے مل کر اس کی بیٹی کے ساتھ کیا۔ محبت کے نام پر جو دھوکا تم نے اس معصوم بچی کو دیا جس کا اس ساری کہانی میں کوئی قصور

PakiBooks.Site

نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ خجستہ کی بیٹی تھی اور امتیاز اس کا باپ تھا۔ اپنے ماں باپ کے کیے کی سزا اس بے چاری کو محبت کے نام پر بھگتنا پڑی اور یقین جانو محبت کوئی گناہ نہیں لیکن اس بچی کے لیے یہ لفظ محض انتقام اور گناہ کی علامت بن کر رہ گیا ہوگا اور اگر آج ہم نے اس سے معافی نہ مانگی تو اس کے نزدیک محبت ہمیشہ کے لیے بے اعتبار ہو جائے گی وہ تاعمر کبھی کسی پر اعتماد نہ کر سکے گی۔ محبت اسے سوائے دھوکا کے کچھ محسوس نہ ہوگی۔

تمہاری اس حرکت نے اس کا اعتبار محبت کے تمام رشتوں سے شاید ختم کر دیا ہوگا اور اب اس کھوئے ہوئے اعتماد کا بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس سے ملیں۔'' موسیٰ کی سمجھ میں امیر کی ہر بات آ گئی کیونکہ ان سب باتوں کو سوچ کر وہ خود بھی بہت بے چین تھا، اسے لگا امیر اس کے دل کی تمام حالت جان گئی ہے، دل ہی دل میں فیصلہ کرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امو جان! ہمیں آج ہی شہر جانا ہوگا میں خود بھی راشیل سے مل کر اپنے کیے کی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

''میں گل جان کو بتا دوں تم اپنی تیاری کر لو۔''

موسیٰ کی رضامندی نے امیر کو دل سے خوش کر دیا ویسے بھی اسے راشیل بہت پسند آئی تھی، آخر وہ اس کے اکلوتے بھائی کی نشانی تھی اور اب اگر موسیٰ اس سے محبت کرتا تھا تو کوئی حرج نہ تھا کہ ان دونوں کا رشتہ طے کر دیا جائے اور یہ مشورہ اسے رات ہی گل جان نے دیا تھا جو امیر کو بہت پسند آیا تھا اور اسے امید تھی کہ موسیٰ بھی انکار نہیں کرے گا۔

☆☆☆

اس دفعہ رمضان کے مہینے میں وہ پہلے جیسی گہما گہمی نہ تھی جس کا سبب راشیل اپنی ذات کو سمجھ رہی تھی جبکہ ماما زمان، آنٹی نور اور مومنہ سب کا رویہ اس کے ساتھ پہلے جیسا ہی تھا سوائے ماہیر کو جو اس دن کے بعد کبھی بھی راشیل سے مخاطب نہ ہوا حالانکہ بنا کہے ہی وہ نیچے کا ہر کام پوری ذمہ داری سے ادا کرتا تھا لیکن اب ہمیشہ کی طرح افطار کے وقت راشیل امی کے ساتھ اوپر نہیں جاتی تھی۔ پہلے وہ اور مومنہ اوپر ہی اکٹھا افطار تیار کرتیں اور سب مل کر روزہ کھولتے لیکن اس سال امی تو روٹین کے مطابق اوپر ہی جاتی تھیں جبکہ وہ روزہ نیچے اپنے پورشن میں تن تنہا کھولتی تھی۔

شروع میں تو مومنہ اسے بلانے آئی مگر راشیل کے سختی سے کیے گئے انکار کے بعد اوپر بھی خاموشی ہو گئی جو بھی تھا اس سارے قصہ میں سب سے زیادہ نقصان اسی کا ہوا تھا۔ وہ ایک دم ہی سب کی نظروں سے گر گئی تھی ایسے میں اسے موسیٰ پر بے طرح غصہ آتا جس کی جھوٹی محبت نے اسے اتنا بے وقعت کر دیا، کاش وہ موسیٰ پر اندھا اعتماد نہ کرتی۔ رات کی تنہائی میں جب اسے موسیٰ کی یاد آتی وہ بے اختیار اللہ کے حضور جھک جاتی معافی مانگتی روتی اور گڑگڑاتی اسے افسوس ہوتا۔ ایک اندھی محبت نے اسے باقی رشتوں سے محروم کر دیا ماہیر جیسا نیک انسان اس کے قریب آتے آتے اس سے اتنا دور ہو گیا کہ اب شاید وہ زندگی میں کبھی اسے پا نہ سکے اور اس میں سارا قصور موسیٰ کا تھا جسے وہ چاہ کر بھی بددعا نہ دے سکتی تھی کہ شاید آج بھی موسیٰ کی محبت اس کے دل کے کسی کونے میں کہیں موجود تھی۔ پورا رمضان روکھا پھیکا رہا۔

اس نے عید کی کوئی تیاری نہیں کی تھی، نہ ہی اسے اب عید سے کوئی دلچسپی رہی تھی اس دن بھی وہ تنہا ہی نیچے تھی جب ماہیر عید کا راشن رکھنے کچن میں آیا۔ زمان ماما ہمیشہ کی طرح ابھی بھی سارا راشن خود ہی ان کے لیے لے کر آتے تھے۔ سارے شاپرز خاموشی سے سلیب پر رکھ کر جیسے ہی وہ واپس پلٹا راشیل کو نہ جانے کیا سوجھی جھٹ سے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی، ماہیر نے دیکھا اس کی



آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

''سوری ماہیر! میں بہت بری لڑکی ہوں، آپ سب کو میری وجہ سے شرمندہ ہونا پڑا پلیز ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں۔ یقین جانیں میں موسیٰ کے ساتھ اس دن گھر سے بھاگی نہیں تھی بلکہ......''

''خاموش ہو جاؤ، مجھے بی جی نے ساری بات بتا دی ہے اور مجھے یقین ہے جو انہوں نے کہا وہ سب حرف بہ حرف سچ ہی ہوگا کیونکہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ بہرحال مجھے خوشی ہے ایک ٹھوکر نے تمہیں اچھے اور برے انسان میں فرق سمجھا دیا اور اللہ کرے تم میں انسانوں کو پہچاننے کا ہنر آ جائے تاکہ آئندہ تمہارا رویہ کسی دوسرے کو دکھ اور تکلیف نہ پہنچائے۔'' ماہیر کے الفاظ اسے شرمندہ کر گئے۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

ماہیر کے نرم رویہ نے اسے خاصا حوصلہ بخشا اس لیے وہ فوراً اپنے مطلب پر آتے ہوئے بولی۔

''نہیں، کیونکہ میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ یقین جانو جن سے محبت کی جائے ان کی اچھائی کے ساتھ برائی کو بھی دل سے قبول کرنا ہی محبت کا حسن ہے، جس کے بنا محبت بے کار ہے۔''

یہ کہہ کر ماہیر وہاں رکا نہیں بلکہ راشیل کے پاس سے گزرتا تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھ گیا اور وہ پیچھے کھڑی سوچتی رہ گئی کہ کیا واقعی محبت، محبت کی برائیوں پر پردہ ڈال دیتی ہے پھر کیوں وہ موسیٰ کو اس طرح معاف نہیں کر پا رہی جیسے ماہیر نے اسے پل بھر میں معاف کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا ماہیر محبت کے اس مقام پر کھڑا تھا، جہاں شاید ابھی راشیل نہ پہنچی تھی اور نہ ہی کبھی پہنچ سکتی تھی جو بھی تھا ماہیر کے رویہ نے اسے خاصا مطمئن کر دیا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی جو اگلا دن ہوتے ہی وہ امی کے ساتھ بازار جا کر اپنا سوٹ اور چوڑیاں، مہندی خرید لائی۔

اس میں رونما ہونے والی اس تبدیلی نے آسیہ کے مردہ دل کو بھی زندہ کر دیا کیونکہ راشیل اس کی کل کائنات تھی جس کی طبیعت پر چھائی بیزاریت نے کئی دنوں سے آسیہ بی جی کے دل کو بھی بوجھل کر رکھا تھا مگر آج راشیل کی چہرے پر پھیلا سکون انہیں بھی مطمئن کر گیا اور پھر افطاری کی وقت انہوں نے دل سے اپنی بچی کے اچھے مستقبل کی دعا اور پورے ایک ماہ کے رمضان میں یہ پہلا دن تھا جب راشیل بھی اوپر ان کے ساتھ تھی۔ نماز کے لیے وہ تو نیچے آ گئیں جبکہ راشیل چھت پر چلی گئی تاکہ کل ہونے والی متوقع عید کا چاند دیکھ سکے جب بے دھیانی میں منڈیر سے جھانکتی راشیل کی نظر نیچے گلی میں پڑی اور وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی کیونکہ ان کے دروازے کے عین سامنے موسیٰ اپنی امو جان کے ساتھ کھڑا تھا۔

''یہ یہاں کیوں آیا ہے؟'' اس کے منہ سے بے اختیار ہی نکلا، مومنہ نے نیچے جھانکا اور راشیل کے جملے کا مطلب فوراً سمجھ گئی اور آہستہ سے بولی۔

''کیا یہ موسیٰ ہے؟''

راشیل نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے چلی گئی اور جیسے ہی صحن میں پہنچی سامنے نظر آنے والا منظر دیکھ کر اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔

امو جان، آسیہ بی جی کے گلے لگ کر رو رہی تھیں باوجود موسیٰ سے بے انتہا نفرت کے راشیل کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ آج اتنے سالوں بعد اپنی ماں کو ملنے والی خوشی ان سے چھیننا نہ چاہتی تھی اسی سوچ نے اس کے لبوں پر تالے ڈال دیے۔ موسیٰ اور امو جان اپنے ساتھ بے شمار تحفہ تحائف بھی لائے تھے جو عید کے حوالے سے ان دونوں ماں بیٹی کے لیے تھے مگر سچ تو یہ تھا کہ موسیٰ کی آمد نے راشیل کے دل کے کسی تار کو نہ چھوا۔ آج اسے احساس ہوا کہ محبت جب مر جائے تو پھر زندہ نہیں ہوتی، بالکل جیسے اس کے دل میں موجود موسیٰ مر گیا اور ان سب کے درمیان اسے اپنا وجود غیر

ضروری لگ رہا تھا۔

یہ ہی وجہ تھی ان سے مل کر وہ اوپر آ گئی کیونکہ اس لمحہ وہ چھت کی تنہائی میں تنہا بیٹھ کر رونا چاہتی تھی لیکن جیسے ہی وہ اوپر پہنچی نگاہ منڈیر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھے ماہیر پر پڑی جو اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا راشیل کی قریب آ گیا۔

''مبارک ہو، موئی آ گیا ہے۔ سنا ہے وہ اپنے کیے پر نادم ہے اور تم سے معافی مانگنے آیا ہے۔'' ماہیر کے الفاظ غیر متوقع تھے، راشیل نے چونک کر اسے دیکھا اور حیرت سے بولی۔

''آپ کو یہ سب کس نے بتایا جب کہ آپ تو ابھی تک اس سے ملے بھی نہیں ہیں۔''

''اس نے مجھے فون کیا تھا شاید تم اپنی کوئی ڈائری اس کی گاڑی میں چھوڑ آئی تھیں۔''

کالی شلوار قمیص میں ملبوس ماہیر اسے سوالیہ انداز میں تکتا ہوا پوچھ رہا تھا اور اس بات نے ایک بار پھر راشیل کو دل کھول کھول کر شرمندہ کیا۔

''پتا نہیں، مجھے یاد نہیں۔'' وہ جب بولی تو شرمندہ سی تھی۔

''میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا بہر حال اس ڈائری میں میرا فون نمبر تھا، جو موئی نے نکالا اور مجھ سے بات کی۔ وہ بی جی سے ملنے گھر آنا چاہتا تھا لیکن شرمندگی کے باعث آتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا کیونکہ میں بھی چاہتا تھا کہ بی جی اپنوں سے دوبارہ مل لیں تاکہ تم بھی اپنی محبت کو پا سکو اور یہ اس وقت ہی ممکن تھا جب ہم موئی کی فیملی کو دل سے قبول کر لیں۔''

''باقی جو کچھ آپ نے کہا وہ سب ٹھیک ہے لیکن ایک بات یاد رکھیں۔'' وہ جب بولی تو اس کا لہجہ بالکل پر سکون تھا۔ ''موئی میری محبت نہیں ہے اور اگر کبھی تھا تو وہ محبت اب مر گئی اور شاید کبھی زندہ نہ ہو کیونکہ جو مر جاتا ہے وہ دوبارہ نہیں جیتا۔ چاہے محبت ہو یا انسان اور میں نے موئی کی جذباتی محبت کو اپنے دل میں اچھی طرح دفنا دیا ہے اب اگر اس دل میں کوئی ہے تو وہ آپ صرف آپ...... مجھے نہیں پتا آپ کی محبت میرے دل میں کب اور کیسے پیدا ہوئی مگر سچ یہ ہے کہ یہ محبت ابدی ہے۔ ہمیشہ قائم رہنے والی اب مر کر ہی میرے دل سے الگ ہو گی۔''

اس کے الفاظ تھے یا کوئی جادو جو آہستہ آہستہ ماہیر کے دل میں اتر کر اسے زندگی بخش رہے تھے اسے آج احساس ہوا، اللہ اپنے بندوں کو کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ وہ ہی تو تھا جس نے راشیل کے دل میں ماہیر کی محبت کو اسی طرح اجاگر کیا کہ شاید ماہیر کبھی چاہ کر بھی نہ کر سکتا اور پھر راشیل کا ہاتھ تھام کر قدم بہ قدم سیڑھیاں اترتا سرشار سا ماہیر جب بی جی جان کے کمرے میں داخل ہوا تو سامنے کرسی پر بیٹھے موئی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ محبت کی یہ بازی وہ اپنے ہاتھوں ہار چکا ہے کیونکہ راشیل کے چہرے پر درج ماہیر کی محبت کسی اندھے کو بھی واضح طور پر نظر آ رہی تھی تو ثابت ہوا زندگی میں ہونے والا ہمارا ہر نقصان ہمیشہ دوسروں کا محتاج نہیں ہوتا۔

کئی دفعہ ہم خود بھی اپنی زندگی اپنے ہاتھوں کھو دیتے ہیں، جیسے موئی نے آج اپنے ہاتھوں راشیل کو خود کھو دیا پھر بھی اس کے دل سے بے اختیار ہی یہ دعا نکلی۔

''اللہ راشیل کو ہمیشہ خوش رکھے۔'' کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ راشیل کی خوشی ماہیر سے ہی وابستہ ہے اور وہ ہی اس کا نصیب ہے اور ہم چاہ کر بھی کسی کا نصیب نہیں چھین سکتے۔ موئی محبت کی جیتی ہوئی بازی ہار گیا جبکہ ماہیر ہاری ہوئی بازی جیت گیا، سب کا اپنا اپنا نصیب جس پر کسی کا اختیار نہیں۔

☆☆



www.PakiBooks.Site

"اشمل!"

وہ کچن میں برتن دھو رہی تھی جب رمشا کی پکار پہ چونک کر اس نے نل بند کر کے برتن رکھے اور لاؤنج میں چلی آئی۔

"کہاں رہ گئی تھیں۔ کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔" رمشا اسے دیکھتے ہی دہائی دینے لگی۔ وہ لاؤنج میں کپڑے پھیلائے بیٹھی تھی جو وہ رمضان سے پہلے اور کچھ روزوں میں شاپنگ کے دوران لیتی آئی تھی۔

"افطار کے برتن دھو رہی تھی۔" وہ ہاتھ خشک کرتی لاؤنج کے صوفے پر ٹک سی گئی۔

"اب تمہاری طرح تو ہے نہیں، فارغ فالتو، ہر گھڑی کام میں لگی رہتی ہے۔" انجم بیگم نے اس کے بکھرے پھیلاوے پر اک تنقید بھری نظر ڈالی۔

"جانتی ہوں آپ کی بہو بڑی سگھڑ ہے۔ بار بار جتایا مت کریں۔" وہ منہ بنا کر کہہ گئی تو انجم بیگم نے بھی سر جھٹکا۔

"اچھا یہ بتاؤ، کس لیے آواز دے کر بلایا ہے۔" اس سے پہلے کہ اسے لے کر دونوں کے بیچ کوئی تلخ کلامی ہوتی۔ اشمل نے حفظ ماتقدم کے طور پر پہلے ہی روک دیا۔

"یار یہ بلو سوٹ تم سلوا لو، میرے پاس عید کے لیے بہت سارے سوٹ ہو گئے ہیں۔" حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے رمشا نے بلو ڈیزائنر سوٹ کا پیکٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میں لے لوں......؟ لیکن کیوں......؟ ابھی زیادہ سوٹ ہو گئے ہیں تو بعد کے لیے اٹھا کر رکھ دو، پھر کبھی سلوا لینا۔" سوٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے بنا اشمل نے صلاح دی، اچھا خاصا مہنگا اور ڈیزائنر جوڑا تھا۔

"میں بعد میں بھی نہیں سلواؤں گی۔ مجھے سوٹ پسند نہیں آیا۔" رمشا نے ناک چڑھا کر سوٹ کا پیکٹ اشمل کی گود میں دھر دیا۔

"پاگل ہو، اتنا تو پیارا سوٹ ہے اور پھر اس سے ملتا جلتا سوٹ تائی جان میرے لیے بھی لائی ہیں۔ میں وہ بھی سلوا رہی ہوں۔ یہ تم ہی سلوا لو۔" اشمل نے انکار کرنے کے ساتھ صلاح بھی دے دی۔

"تمہیں نہیں سلوانا ہے تو بول دو۔ میں کام والی کو دے دوں گی۔"

"توبہ ہے رمشا!" اشمل نے سوٹ رکھ لینے میں ہی عافیت جانی اور وزدیدہ نظروں سے انجم بیگم کو دیکھنے لگی جو ناک پر موجود چشمہ اوپر نیچے کر کے محدب عدسے کے پیچھے سے اکلوتی بیٹی کو گھور رہی تھیں۔

"ہاں، ماں کی پیار سے لائی ہوئی چیز اتنی ہی تو غیر اہم ہے کہ پسند نا آنے پر کام والی کو دے دو...... اشمل تم ہی یہ جوڑا سلوا لو، اور اب سے میری توبہ جو میں تمہارے لیے محبت سے کچھ پسند کر کے لے آؤں۔" انجم بیگم نروٹھے لہجے میں کہہ کر اٹھیں اور یہ جاوہ جا۔

بہت بری بات ہے رمشا۔ کیا تھا جو تم تائی جان کا دل رکھنے کے لیے ہی سوٹ سلوا کر پہن لیتیں۔ وہ خوش ہو جاتیں۔ کتنے پیار سے لے کر آئی تھیں ہم دونوں کا سوٹ۔"

انجم بیگم خفگی کا تاثر دیتی چلی گئیں تو اشمل ناصحانہ انداز میں اسے سمجھانے لگی۔

یار تمہیں تو پتا ہے میں کتنی چوزی ہوں۔ جو چیز پسند نا آئے اسے استعمال کرنا تو دور کی بات، دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ خود اپنی لائی ہوئی اکثر چیزیں واپس کرواتی رہتی ہوں۔"

رمشا نے اپنی مجبوری بیان کی جو کسی حد تک ٹھیک ہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی تھی۔ کسی کی لائی چیزیں اسے کم ہی پسند آتی تھیں حتیٰ کہ گفٹ بھی۔ اکثر دوستوں سے ملنے والے گفٹ کسی نا کسی کو بانٹ دیتی تھی۔ جیسے ابھی ماں کا پیار سے لایا ہوا جوڑا اٹھا کر اس نے اشمل کو تھما دیا تھا۔

"تائی جان کو دکھ ہوا ہے۔ ان کا دل رکھنے کے لیے ہی سلوا لیتیں۔" اسے افسوس ہو رہا تھا۔

"ماں ہیں میری، نہیں ٹوٹا ان کا دل، ابھی منا لوں گی۔" رمشا نے لاپروائی سے کہا۔

"صبح ٹیلر کو کپڑے دینے جاؤں گی۔ تم بھی اپنے کپڑے نکال لینا۔ ساتھ ہی دے دیں گے۔"

رمشا نے صبح کا پلان بتایا تو وہ سر ہلا کر اتفاق کر گئی۔ اس کا دل انجم بیگم کی طرف لگ گیا تھا کہ شاید وہ خفا ہوں گی۔ لیکن جب تھوڑی ہی دیر بعد رمشا انجم بیگم کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھی انہیں منا رہی تھی۔ اور انجم بیگم جھوٹی خفگی سے اسے پرے کر رہی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر اس کے لبوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں میں پانی بھی آ گیا۔ جسے چھپانے کو اس نے کئی بار غیر محسوس طریقے سے پلکیں خشک کیں۔ مگر ضبط محال ہوا تو بہانے سے اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگی۔ تنہائی پا کر آنسو تیزی سے عارضوں پر پھیل گئے۔

"اشمل! رو کیوں رہی ہو؟"

علی زریون اس لمحے نماز عشا اور تراویح سے فارغ ہو کر لوٹا تھا۔ بلیک کرتا شلوار میں بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ اشمل کو روتے دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بے طرح گھبرا کر تیزی سے آنسو خشک کرنے لگی۔

"کیا ہوا، کسی نے کچھ کہا تم سے؟" وہ فکر مندی سے اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کر کے گلاس کے اس پار دیکھنے لگا۔ جہاں رمشا، انجم بیگم کے ساتھ چپکی بیٹھی غالباً انہیں منا چکی تھی۔

"کوئی بات نہیں ہوئی۔ کیا بات ہو گی۔" بے ربط ہو کر وہ الٹا اسی سے پوچھ بیٹھی۔

"پھر رو کیوں رہی ہو؟" وہ بے یقین نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی۔ پھر بھی آنکھوں میں آنسو بے وجہ تو نہیں ہو سکتے تھے۔

"بس ایسے ہی آنسو آ گئے۔ آپ ہال میں چل کے بیٹھیں میں کھانا لگاتی ہوں۔" وہ پاس سے گزرنے لگی تھی جب علی زریون نے بازو سے پکڑ کر اسے دیوار سے لگا دیا۔

"جب تک رونے کی وجہ نہیں بتاؤ گی، جانے نہیں دوں گا۔" وہ دو ٹوک لہجے میں کہہ کر اسے ہراساں کر گیا۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے گلاس وال کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں ہی ایل ای ڈی کی طرف متوجہ تھیں۔ گو کہ ان کی پشت ان دونوں کی طرف تھی مگر ان کی نظر پلٹ بھی سکتی تھی۔

اس خیال سے ہی اشمل خفیف سی ہو کر علی زریون کی طرف بے بس نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔ گلابی سوٹ میں گھنے بالوں کو چھوٹے سے کیچر میں قید کیے باقی کے بال بائیں شولڈر پر پڑے ہوئے تھے۔ گلابی عارض اور رونے کی وجہ سے مزید گلابی ہوتی ناک کو وہ محبت سے لبریز تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں خود پر جمی دیکھ کر شرم کی سرخی اشمل کے چہرے پر پھیل گئی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ بس یونہی رونا آ گیا۔ مما کی یاد آ گئی لامحالہ اس نے جلدی سے سچ اگل دیا تاکہ وہ سامنے سے ہٹے اور اسے جانے کا موقع ملے۔

"مس کر رہی ہو تو کال کر لو۔" اس کی صلاح پر وہ پر درد مسکراہٹ سجا گئی۔ ہر بار کال کر کے پہلے سے زیادہ اذیت ہوتی تھی۔ انہیں فرصت ہی کہاں ہوتی تھی اس سے بات کرنے کی...... پھر سر جھٹک کر بولی۔

"اب اگر آپ کو مجھ پر یقین آ گیا ہے تو میں کچن میں جا سکتی ہوں۔" وہ اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اجازت ہے" وہ ایک طرف ہو کر راستہ دیتے ہوئے مسکرا دیا۔

"چلو میں بھی کچن میں چل کے تمہاری مدد کر دوں۔ تاکہ مجھ پہ بھی الزام لگ جائے زن مریدی کا۔" وہ شریر لہجے میں کہہ رہا تھا اور اشمل اس کے سامنے بے ساختہ ہاتھ جوڑ گئی۔

PakiBooks.Site

''معاف رکھیں مجھے۔ میں کوئی طعنہ افورڈ نہیں کر سکتی۔'' اس کے چہرے پہ شرمگیں تاثرات اور دل فریب مسکراہٹ دیکھ کر علی زریون بھی مسکراتا ہوا لاؤنج کی طرف چلا گیا تھا وہ بھی کچن کو ہولی۔

''رمشا اٹھ کر مدد ہی کر دو اشمل کی، میز لگانے میں۔'' انجم بیگم نے اسے اکیلے میز لگاتے دیکھا تو پہلو میں گھسی بیٹھی بیٹی کو پرے دھکیل کر اشمل کا ہاتھ بٹانے پر اصرار کرنے لگیں۔

''کرنے دیں اسے اکیلے...... آخر اس نے اس گھر کو سنبھالنا ہے۔ اچھی بات ہے۔ ابھی سے عادت بنے گی۔ میرا کیا ہے۔ میں تو مہمان ہوں۔ چند ماہ کی۔''

رمشا اور پھیل کر بیٹھ گئی تو انجم بیگم اسے گھورتی خود ہی اٹھ گئیں۔

''کام کاج کی پروا نہیں۔ گز بھر کی زبان ہے اس لڑکی کی بس۔'' انجم بیگم بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر خود ہی مدد کرنے آ پہنچیں، اشمل تک بھی رمشا کا جملہ پہنچا تھا۔ اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ رمشا کی مزاج آشنا تھی۔ جانتی تھی وہ بہت موڈی ہے۔

''دیکھا بھائی، کتنی محبت ہے ساس بہو میں۔'' رمشا علی زریون کو آنکھ سے اشارہ کرتی درحقیقت انجم بیگم کو چھیڑ رہی تھی۔

''دیکھ ہی رہا ہوں۔'' وہ بھی اس کے انداز پر مسکرا دیا۔ ''مما! پپا کو جلدی بلا کر اپنی بہو کو رخصت کروالیں۔ اور شاندار سا ولیمہ بھی ارینج کر لیں۔''

رمشا بیٹھے بیٹھے ہانک لگا رہی تھی۔ علی زریون اور انجم بیگم کے سامنے ایسی بات پر اشمل کا سر مزید جھک گیا تھا۔

''یہ رمشا، بہت منہ پھٹ ہے۔ بولنے سے پہلے سوچتی نہیں ہے۔'' وہ سوچ کے رہ گئی۔

''تمہارے ہوتے تو کبھی رخصت نا کرواؤں بہو کو۔ تم جیسی کام چور نند نے تو میری بہو پر حکم چلا چلا کر اس کی زندگی ہی اجیرن کر دینی ہے۔ تمہیں نکالوں گی اس گھر سے تب ہی اشمل کو رخصت کرواؤں گی۔'' انجم بیگم نے صاف کہہ دیا۔

رمشا اپنے ماموں زاد سے منسوب تھی شادی عید کے بعد تھی۔ کھانا لگ چکا تھا۔ علی زریون کے ساتھ رمشا بھی آ کر کرسی کھینچنے لگی۔

دیکھ لو بھئی، میں تو چاہ رہی تھی تمہیں جلدی رخصت کروالاؤں مگر تمہاری ظالم ساس کو ہی سانس نہیں آ رہی۔ بہو کی رخصتی کا سن کر۔''

رمشا ہمدرد بنی، اشمل کے ساتھ انجم بیگم کو بھی چھیڑ گئی۔ علی زریون کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ انجم بیگم نے رمشا کے اک دھپ رسید کیا تھا۔ اشمل کی جھینپی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

☆☆☆

اشمل بڑی خوب صورت، خوش مزاج بچی تھی، اس کی والدہ ثانیہ اور والد احمد میں کبھی نہیں نبھ سکی تھی۔ ثانیہ، احمد صاحب کی تنگی سے نالاں رہتی تھیں جس کی وجہ سے انہیں جی پار مار کے جینا پڑتا تھا۔

احمد صاحب واجبی تعلیم کے باعث کہیں آفس نہیں لگ سکے تھے۔ جس کی وجہ سے معمولی تنخواہ میں بیوی کے ساتھ گزر بسر کرتے وہ ان کی خواہشات پوری نہیں کر پاتے تھے۔ جب کہ ان کے بڑے بھائی مرتضٰی اعلا پوسٹ پر فائز تھے۔ ان کے گھر نا صرف خوش حالی تھی بلکہ انجم بیگم کا پہننا اوڑھنا اور گھر میں آسائشات دیکھ کر ثانیہ آئے دن احمد سے لڑتی رہتی تھیں۔

مرتضٰی اور انجم بیگم نیک فطرت رکھتے تھے۔ احمد کے مالی حالات کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔ تب ہی دونوں کسی نا کسی بہانے سے کوئی نا کوئی چیز بطور تحفہ دے دیا کرتے تھے۔ مگر ثانیہ کو اور زیادہ چاہیے تھا۔

اشمل کی پیدائش بھی ہو گئی لیکن ان کے جھگڑے ختم نا ہوئے۔ مرتضٰی اور انجم کے بچے اولیول اسکول میں جانے لگے اور اشمل معمولی اسکول میں۔

انجم اور مرتضٰی نے اشمل کی پڑھائی کا خرچا اٹھا کر اس کا داخلہ بھی اپنے دونوں بچوں علی زریون اور رمشا کے ساتھ کروانا چاہا تھا۔ مگر احمد مزید ثانیہ کے طعنے نہیں سننا چاہتے تھے کہ وہ بھکاری ہیں اور ان کے بھائی، بھابھی انہیں بھیک دان کرتے رہتے ہیں۔ احمد نا مانے تو وہ دونوں بھی چپ ہو گئے۔

اشمل پانچویں میں تھی۔ جب اک دن معمولی سی بات پر شروع ہونے والی لڑائی اس قدر بڑھی کہ احمد صاحب نے غصے میں ثانیہ کو تین طلاق دے دی۔ اشمل جو بچپن سے اس ماحول کا حصہ رہ کر ڈری سہی فضا میں پروان چڑھ رہی تھی اس حادثے سے مزید ہراساں ہو گئی۔ ثانیہ رو دھو کر اپنے والدین کے گھر چلی گئیں۔

انجم بیگم اور مرتضٰی نے احمد صاحب کو بہت برا بھلا کہا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ چھوٹی سی اشمل کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ انجم بیگم اسے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں لیکن احمد صاحب اپنی بیٹی کی ذمہ داری خود اٹھانا چاہتے تھے۔

عدت کے بعد ثانیہ نے پیسے والے سے شادی کر لی تھی۔ شروع شروع میں وہ اشمل کو فون کر لیتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ اس میں بھی کمی آنے لگی۔ اور شادی کے بعد تو وہ بھول ہی گئیں کہ ان کی ایک بیٹی پہلے شوہر سے ہے۔ ان کے تین بچے ہو گئے تو انہیں اشمل کی یاد بھی بھولنے لگی۔ کبھی کبھی وہ خود ہی کال کر لیتی تھیں اور ہر بار مزید دکھی ہو جاتی تھی کہ ان کے شوہر کو پسند نہیں تھا کہ وہ سابقہ شوہر کی بیٹی سے تعلق رکھے۔ خواہ فون پہ ہی۔ وہ ان کی غیر موجودگی میں بات کرتی تھیں یا کبھی بچوں کے کام کا بہانہ بنا دیتی تھیں۔ اور اشمل ان کے لہجے اور انداز میں ممتا کی گرم جوشی ڈھونڈتی ہی رہ جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ اشمل کو بھی سمجھ میں آنے لگا تھا کہ ان کی خوش گوار زندگی میں اشمل کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

چھوٹی سی اشمل اور طویل زندگی کی آڑ میں احمد صاحب نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا۔ نعیمہ ان کی دوسری بیوی تھیں۔ جنہوں نے آتے ہی گھر میں اپنا سکہ ایسا جمایا کہ احمد بھی ان کی مٹھی میں ہو گئے۔

انجم بیگم اور مرتضٰی کو اشمل سے بہت لگاؤ تھا۔ نعیمہ کے آنے اور ثانیہ کی شادی کی خبر کے بعد انجم نے اشمل کو ساتھ رکھنا چاہا تھا۔ مگر احمد کو ایک بار پھر گوارا نہ ہوا کہ ان کے جیتے جی ان کی بیٹی بھائی کے گھر پلے۔

انجم اور مرتضٰی کے دو بچے تھے۔ بڑا علی زریون اور اس سے چھوٹی رمشا جو اشمل کی ہم عمر تھی اور دونوں میں خوب دوستی تھی۔ علی زریون کو اشمل بچپن سے پسند تھی۔

نعیمہ روایتی سوتیلی ماں تھیں۔ شروع میں تو انہوں نے احمد صاحب اور دنیا دکھاوے کو اپنے کردار میں رنگ گھولنے کے لیے اشمل سے جھوٹی محبت کے مظاہرے کیے۔ مگر جب ان کے اوپر تلے کے چار بچے آ گئے تو اشمل فقط آیا بن کے رہ گئی۔ پڑھائی کے ساتھ وہ گھر کے کام بھی کرنے لگی' ساتھ ہی بہن بھائیوں کی دیکھ بھال' انہیں نہلانا' کھلانا پلانا' پڑھانا جیسے اس کی ذمہ داری بن گئی۔ احمد سب دیکھتے تھے مگر کچھ کہتے نہیں تھے کہ ان کی نظروں میں وہ اپنے بہن بھائیوں کی ہی خدمت کر رہی تھی۔ اس میں کون سی کوئی معیوب بات تھی۔ جس کے لیے وہ کوئی ایکشن لیتے۔ سوتیلے بہن' بھائیوں کی خدمت کرتے اس کا اپنا بچپن کہاں کھو گیا؟ وہ جو پڑھائی میں بے حد اچھی تھی۔ پڑھنے کے لیے وقت نا ملنے پہ اس کے مارکس کم آنے لگے پھر بھی احمد صاحب کو احساس نا ہوا۔ الٹا نعیمہ، پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا کی اٹھتے بیٹھتے گردان کر کے اس کی پڑھائی کا سلسلہ رکوانے کے درپہ ہوئیں تو اس نے ڈرتے ڈرتے انجم بیگم سے اپنے حالات بیان کیے۔ انہوں نے احمد صاحب کو احساس دلایا۔ یوں پڑھائی کا سلسلہ بند ہونے سے رک گیا۔ لیکن نعیمہ کو اشمل کا انجم بیگم کو سامنے لانا اچھا نہیں لگا۔ احمد' بھابھی کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس لیے نعیمہ کھل کر ان کے خلاف کچھ نہ بول سکیں۔

وقت بدلتا رہا۔ اشمل کالج میں آ گئی تھی۔ اب وہ اپنی ذمہ داریوں کے بیچ پڑھائی کے لیے وقت نکال

لیتی تھی۔ اشمل کے لیے جب اچھا رشتہ آیا۔ اور نعیمہ نے اسے اپنی بیٹی کی طرف موڑ دیا تو انجم بیگم کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ نعیمہ ساری زندگی اسے نوکر بنا کر گھر بٹھا کر رکھنا چاہتی ہیں۔

انجم بیگم اک بار پھر اس کی ڈھال بن گئیں۔ اب کے نعیمہ بھی کھل کر سامنے آگئیں کہ وہ ان کے گھر کے معاملات میں دخل نا دیں اور یہ کہ لڑکے کی فیملی نے ان کی بیٹی کو پسند کیا ہے۔ بھلے وہ اشمل کو دیکھنے آئے تھے۔ انجم بیگم نے احمد صاحب سے اصرار کیا کہ وہ اسی وقت اشمل کو ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔ تاکہ نعیمہ کی بیٹیوں کے رشتے میں کوئی رکاوٹ نا آئے۔

احمد صاحب بھائی اور بھابھی کے مطالبے پر چپ رہ گئے لیکن نعیمہ نے نیا ڈرامہ شروع کردیا کہ وہ جوان لڑکی کو کیسے جانے دیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ان کی لن ترانیوں سے اپنے بیٹے علی زریون سے اسی وقت نکاح طے کردیا تھا۔ نعیمہ مزید جل گئیں کہ علی زریون کے لیے انجم بیگم کو ان کی بیٹیاں نظر نا آئیں۔ احمد صاحب بھی بھائی بھابھی کی فرمائش پر خوش ہوگئے کہ علی زریون انہیں بھی بہت پسند تھا۔

علی زریون جو اشمل کی محبت میں پور پور ڈوبا ہوا تھا۔ یوں آسانی سے دلی مراد پالینے پر بے حد خوش تھا۔

اک خوب صورت سی شام میں دونوں کا نکاح ہوگیا۔ انجم بیگم اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ نعیمہ نے اس عمل کا بھی بائیکاٹ کیا کہ رخصتی اور ولیمے کی تقریب انجم بیگم، رمشا اور اشمل کے امتحانات کے بعد کرنا چاہتی تھیں۔ مرتضیٰ صاحب کو بھی کام کے سلسلے میں کئی ماہ شہر سے باہر رہنا تھا۔ ان ہی اسباب کے بنا پر رخصتی کی تاریخ چند ماہ بعد کی رکھی گئی تھی۔

نعیمہ چاہتی تھیں کہ اشمل مزید ان کی خدمت کرے اور کسی طرح موقع نکال کر وہ علی زریون سے طلاق دلوادیں۔ مگر انجم بیگم کے فیصلے پر وہ بازی ہار بیٹھی تھیں۔ یوں ماں باپ کے ہوتے ہوئے اشمل تن کے جوڑوں میں لاوارثوں کی طرح انجم بیگم کے ساتھ ان کے گھر آگئی۔ جہاں رمشا تھی جو اس کی بے حد اچھی دوست تھی۔ اس کے حق کے لیے ساری زندگی بولنے والی انجم بیگم تھیں۔ جن کی بے لوث محبت نے اسے رلنے سے بچالیا تھا۔ وہ اس کا ماضی تو نہیں بدل سکتی تھیں مگر اس کا حال اور مستقبل انہوں نے خوش گوار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور آنکھوں میں محبت بسائے علی زریون تھا جس کی منکوحہ کی حیثیت سے وہ اس گھر میں رہ رہی تھی۔

ڈھکے چھپے لفظوں میں وہ پہلے ہی اپنی پسندیدگی سے آگاہ کرچکا تھا۔ اور اب جب وہ اس کی منکوحہ تھی تو وہ اپنے دلی جذبات اس پر عیاں کرگیا۔

اشمل درحقیقت خود کو خوش قسمت تصور کرنے لگی تھی۔ بچپن اور لڑکپن سوتیلی ماں کے زیر سایہ صعوبتوں میں گزار کر یہ پل اسے اپنا انعام لگتے تھے لیکن ساتھ ہی اس کا دل اداس ہوجاتا تھا۔ والدین کی علیحدگی نے اسے کن کن حالات سے گزارا تھا۔

احمد باپ تھے مگر نئی بیوی کو پا کر اس سے غافل ہوگئے تھے۔ اس کے حق میں کبھی بولنا بھی چاہتے تھے تو نعیمہ کے ڈر سے چپ رہ جاتے تھے۔ ثانیہ اپنی زندگی میں مگن تھیں۔ والدین کی محبت سے بھرے پل اس کے حصے میں نہیں آئے تھے...... کیا تھا جو اس کے والدین الگ نا ہوتے ...... کیا ہوتا جو ثانیہ اسے فراموش نا کرتیں۔ کیا تھا جو نعیمہ اسے بھی اپنے بچوں میں شمار کرتیں!

انجم بیگم اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ رمشا آج بھی بہترین دوست تھی اور علی زریون اب پہلے سے زیادہ اس کی پروا کرتا تھا۔

☆☆☆

ان کے فائنل پیپرز شروع ہو کر ختم ہوگئے تھے۔ مرتضیٰ بھی اپنے سارے کام نبٹا کر لوٹ آئے تھے۔ یوں دو دو شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں کہ انجم بیگم اور مرتضیٰ بہتر سے بہترین چیزیں رمشا کے لیے پسند کررہے تھے۔ کیونکہ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور وہ اس میں بھی سو سو نخرے کرکے ہر چیز اپنی پسند سے لے رہی تھی۔ فریج سے لے کر پائیدان تک اس نے اپنی مرضی سے لیا تھا۔ اور ان سب کی خریداری میں اس نے انجم بیگم اور اشمل کو بے حد خوار کیا تھا۔ انجم بیگم چند اک بار جا کے آئندہ جانے سے توبہ کرگئیں تو اشمل کی شامت آگئی۔ رمشا ہر جگہ اسے گھسیٹ رہی تھی۔ اور وہ بھی وہ خوش دلی سے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہیں کہیں دل بھی دکھ رہا تھا۔

اس کی شادی بھی رمشا کے ساتھ ہورہی تھی۔ بھلے نکاح ہوگیا تھا۔ وہ سسرال میں ہی رہ رہی تھی۔ مگر ابھی باقاعدہ رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ انجم بیگم اور مرتضیٰ نے احمد اور ثانیہ کو الگ الگ شادی کی تاریخوں سے آگاہ کردیا تھا۔ مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ ثانیہ تو مجبوری کا رونا رو رہی تھیں۔ احمد صاحب نے سب سن کر فون بند کردیا تھا۔

”مجھے بے حد حیرت ہوتی ہے۔ مرتضیٰ احمد صاحب آپ کا بھائی ہے۔ کس قدر بے حس ہے۔ اسے بیٹی کے جذبات و احساسات کی ذرا پروا نہیں کہ ایک لڑکی شادی کے موقع پر ماں باپ کے لیے کیسے جذبات رکھتی ہے۔ نعیمہ نے تو مت ہی مار رکھی ہے۔ آہ! کاش ثانیہ نے ہی سمجھداری دکھائی ہوتی تو آج اک گھر بکھرا ہوا نا ہوتا۔“

انجم بیگم، احمد کی خاموشی پر دل کی بھڑاس نکالنے کے ساتھ، ثانیہ کے لیے افسوس کرنے لگیں۔ جنہیں پیسا تو مل گیا تھا مگر وہ دوسرے شوہر کی مرضی کے بنا سانس تک نہیں لے سکتی تھیں۔

”چھوڑو، تم کوئی امید نا رکھو اس کی طرف سے“ مرتضیٰ نے سمجھایا۔

”میں کوئی امید نہیں رکھ رہی احمد کی طرف سے مجھے تو اشمل کے جذبات کی پروا ہو رہی ہے۔ جیسے ہماری رمشا اپنا جہیز اکٹھا کرنے میں سو نخرے کررہی ہے۔ اس بے چاری کے بھی تو سو ارمان ہوں گے۔ ہم جہیز کا لالچ نہیں رکھ رہے لیکن احمد کو تو احساس ہونا چاہیے کہ بیٹیوں کو کیسے رخصت کرتے ہیں کیا اپنی بیٹیوں کو بھی اسی طرح رخصت کرے گا۔“

انجم بیگم کا غصہ کم نہیں ہوا۔

”میں نے شادی کی تاریخیں بتائیں تو کہا بھائی صاحب کارڈ بھیج دیجیے گا۔ ہم آجائیں گے۔“ مرتضیٰ صاحب نے بتایا تو انجم بیگم نے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

”یوں مہمانوں کی طرح آنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔“ وہ جل کر بولیں۔

اور یہ سب سنتی اشمل دکھی دل اور اداس آنکھوں پر اختیار کھو بیٹھی، ایک لڑکی اس کے ارمان، اس کے والدین کو فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ انہیں سمجھتے۔ شادی اور رخصتی کے وقت لڑکیاں ویسے ہی عجیب احساسات میں گھر جاتی ہیں۔ نئے رشتے انہیں ہراساں کرتے ہیں۔ پرانے رشتوں کے چھوٹنے کا دکھ ہوتا ہے۔ نئی زندگی کے لیے ہزار وسوسے ہوتے ہیں...... لاکھوں کا جہیز اور گھر گاڑی لے جانے والی لڑکیوں کے دل میں بھی کسک ہوتی ہے۔ کہ آیا ان چیزوں کی برتری، بھرم کے باوجود وہ سسرال میں معتبر ہوسکیں گی؟

جب کہ اس کے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ یتیم لڑکی کی طرح اس کی رخصتی کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ جس میں میکے کا نام و نشان تک نا تھا۔ انجم بیگم اس کے لیے خوب صورت بری بنارہی تھیں مگر سسرالی نوادرات میکے کی کمی تو پوری نہیں کرسکتے تھے۔

رمشا جس مان و محبت سے لڑ لڑ کر جہیز لے رہی تھی علی زریون سے گاڑی کی ڈیمانڈ کررہی تھی۔ اس کے حصے میں تو کچھ نہیں تھا۔ نا بھائی کا مان، نا ماں، باپ کا سایہ۔

آنکھوں کو رگڑتی وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی لیکن دھندلائی آنکھوں سے بری طرح علی زریون سے ٹکرا گئی۔

”سنبھل کے لڑکی!“ وہ بے ساختہ اسے تھام کر گرنے سے بچا گیا۔ وہ جلدی سے الگ ہوئی۔

”تم روئی ہو؟“ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ لٹوں کو کان کے پیچھے کرتی وہ نظریں چرا گئی۔

"ادھر دیکھو، میری طرف۔" بائیں رخسار پر انگلی رکھ کر وہ اس کا رخ اپنی طرف کر گیا۔ وہ پلکیں جھکائے کھڑی رہی۔

"تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو؟"

اکثر ہی اس کی پلکیں نم رہنے لگی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ سوال کر گیا۔

"تمہارے آنسوؤں کی وجہ کیا ہے۔ اگر تمہیں یہ رشتہ دل سے منظور نہیں تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا...... تم اک بار کہہ دو۔ میں سب کچھ ختم کر......"

"پلیز چپ ہو جائیں۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے وہ تڑپ کر بول اٹھی۔ آنسو تیزی سے بہہ نکلے۔ وہ مزید کچھ کہنے کے قابل نا رہی تو آنسو بہانے لگی۔

"جب سے رخصتی کی بات ہوئی ہے تمہاری اداسی بڑھ گئی ہے۔ ہر وقت روتی نظر آتی ہو۔ کیا بات ہے آخر...... بتاتی کیوں نہیں...... اگر اس رشتے میں تمہاری مرضی شامل نہیں تو بھی بول دو...... میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ لیکن تم اس طرح رو دھو کر زبردستی میری زندگی میں شامل ہو گی تو یہ اذیت میری برداشت سے باہر ہو گی۔ میں نے پورے خلوص سے تمہاری چاہ کی تھی۔ اور تم بہت آسانی سے میری منکوحہ بن گئیں لیکن اب تمہارا یہ انداز مجھے تشویش میں مبتلا کر رہا ہے۔"

وہ پوری سچائی سے کہہ رہا تھا۔ ہزار وسوسے اس کے لہجے میں آ گئے تھے۔ اگر جو اشمل کچھ ایسا ویسا کہتی تو شاید وہ برداشت ہی نا کر پاتا۔ تب ہی اسے جھنجوڑ گیا۔ وہ کوئی جواب نا دے پائی۔ کہتی بھی تو کیا ہر بار مما یاد آ رہی ہیں کہہ کر بھی تھک گئی تھی۔

اسی اثناء میں لاؤنج میں رکھا فون بجنے لگا تھا۔ اسے نظروں میں رکھتے اس نے کال ریسیو کی تھی۔

"اشمل سے بات ہو سکتی ہے؟"

سلام دعا کے بعد دوسرے طرف سے سوال ہو تو علی زریون چونک گیا۔ مقابل مرد تھا۔

"جی ہو سکتی ہے۔ آپ کون؟"

"میں فہد ہوں۔ ذرا جلدی کروا دیں پلیز۔"

دوسری طرف سے شائستہ لہجے میں کہا گیا تھا۔ اسے عجیب نظروں سے دیکھتے پاس کھڑی اشمل کی طرف اس نے فون بڑھا دیا تھا۔

"تمہارا فون!" وہ عجیب سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ حیرانی سے اس کی شکل دیکھتے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے گئی۔

"السلام علیکم! اشمل بات کر رہی ہیں۔"

مقابلہ شائستہ لہجے میں دریافت کر رہا تھا۔ غیر متوقع طور پر مردانہ آواز سن کر اس کی نظریں بے ساختہ علی زریون پڑ اٹھ گئیں۔ جو اسے باتیں کرتا چھوڑ کر پلٹ گیا تھا۔

"میں آپ کا کالج فرینڈ حرا کا بھائی فہد ہوں۔ ایکچوئلی میں نے حرا کی سرپرائز نگ برتھ ڈے پارٹی ارینج کی ہے۔ اس لیے حرا کے سیل سے اس کی دوستوں کا نمبر لے کر کال کر رہا ہوں۔ تمام سہیلیاں آئیں گی تو حرا بہت خوش ہو گی۔

مقابل اس کے لہجے کی حیرانی جان کر وضاحت کر گیا تو اس کی حیرت بھی رفع ہوئی۔

"آپ کل کی پارٹی میں آئیں گی نا مس اشمل؟"

وہ مدعو کرنے کے بعد استفسار کر رہا تھا کہ کہیں اس کا سرپرائز کا پلان ٹھپ ہی نا ہو جائے۔

"میں کوشش کروں گی۔" اس نے جان چھڑا کر جلد ہی فون رکھ دیا۔ اس کی نگاہ علی زریون کے کمرے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ جانے کیا الٹا سیدھا سوچ رہا تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں سحری کی تیاری میں لگ گئی۔

افطار کے بعد نماز مغرب، پھر چائے پھر عشا کی نماز اور تراویح کے بعد کھانے میں اتنا وقت ہو جاتا تھا کہ سحری کی تیاری بھی کچن سمیٹتے ہوئے کر لیتی تھی۔

رمشا ذرا موڈی تھی۔ جب موڈ ہوتا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ ورنہ اپنی تیاریوں میں لگی رہتی۔ ماسی کے

علاوہ اوپری کاموں کے لیے بھی ملازمہ تھی۔ پھر انجم بیگم بھی ہاتھ بٹا دیتی تھیں۔ اشمل کو زیادہ مشکل نہیں ہوتی تھی۔ وہ سمجھ دار لڑکی تھی لیکن حساسیت کی وجہ سے اکثر جذبات کے ہاتھوں بہہ کر اداس ہو جاتی تھی۔ اور اس کی اداسی کو علی زریون کچھ اور ہی معنی پہنانے لگا تھا۔

سحری کے وقت میں وہ روٹھا روٹھا تھا۔ اشمل نے چور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ سحری کر کے نماز کے لیے چلا گیا تھا۔ اگلا دن بھی اس کیفیت میں گزرا تو اشمل کو بے چینی لاحق ہو گئی۔ وہ پہلے ہی محبتوں کی گرمی اور اپنائیت بھرے رشتوں کی ترسی ہوئی تھی۔ ایسے میں علی زریون نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ بھی قابل محبت ہے۔ اس کے رشتے سے بندھ کے وہ معتبر ہو گئی تھی۔ اور اب جب وہ خاموش ہو گیا تو اس کا بے چین ہونا لازمی امر تھا۔ افطاری کے بعد نماز مغرب سے لوٹ کر سب کے درمیان بیٹھنے کے بجائے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس کی پشت کو دیکھتی وہ خاموشی سے چائے کی ٹرے میز پر رکھ گئی۔

"اشمل! آج کی سحری میں بناؤں گی تم آرام کر لو، دن سے لگی ہوئی ہو۔"

رمشا نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔

"یہ آج کیسے احساس ہو گیا کہ وہ تھک گئی ہو گی......" انجم بیگم نے جھوٹی خفگی سے دیکھا تو رمشا ڈھٹائی سے مسکرا دیں۔

"کرنا ہی پڑا۔ جانتی ہوں اب بھی احساس نا کیا تو آپ نے چوٹی سے پکڑ کر مجھے کچن میں کھڑا کر دینا ہے کہ آپ کی بہو لگی ہوئی ہے۔" وہ چڑانے سے باز نا آئی۔

"ہاں تو کہوں گی۔ میرے لیے تم دونوں برابر ہو۔ اک کے ساتھ زیادتی کیسے برداشت کروں۔"

انجم بیگم نے تائید کی تو رمشا "دیکھا" والے تاثرات سجا کر ہنس دی۔

"اشمل! بیٹا، علی کی چائے کمرے میں دے آؤ، ساتھ ہی سر درد کی گولیاں بھی لے جاؤ، کہہ رہا تھا سر میں درد ہے۔ آرام کرے گا۔"

علی زریون کی چائے کو دیکھ کر وہ شش و پنج میں پڑی تھی۔ جب انجم بیگم نے اسے ہدایت کرنے کے ساتھ میڈیسن باکس سے سر درد کی گولیاں بھی نکال کر دیں۔

"تائی جان میں......!"

وہ تنہائی میں اس کے کمرے میں جانے کے خیال سے تذبذب کا شکار نظر آ رہی تھی۔

"ہاں تو، کیا ہوا......؟ غیر تھوڑی ہے۔ شوہر ہے تمہارا۔" انجم بیگم نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جھجک رہی ہے تب ہی احساس دلایا کہ وہ نامحرم کے پاس جانے کو نہیں کہہ رہیں۔ وہ جھجکتی ہوئی دونوں چیزوں اٹھانے لگی تھی۔

"دل چاہے تو سر بھی دبا دینا۔" پیچھے سے رمشا کی کھلکھلاتی آواز آئی تو اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ آئی۔

کسی شام آ میرے محرما!
کبھی رازِ ہستی بیاں کروں
میری روح کا وہ جو کرب ہے
تیری روح پہ میں عیاں کروں
میرے خانۂ دل کو وحشتیں
تیرے دل پہ ساری نہاں کروں
کبھی خود کو کھینچ سا پھیر دوں
کبھی تجھ کو ورد زباں کرو
کسی شام آ میرے محرما!
میں خود کو تجھ میں فنا کروں

دروازے پر دستک دے کر وہ چند ثانیے کھڑی رہی۔ اندر سے جواب موصول ہونے کے بجائے دروازہ کھل گیا تھا۔ غالباً وہ آرام کی غرض سے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا یا سر میں کچھ زیادہ درد ہو رہا تھا کہ آنکھیں سرخ اور چہرہ ستا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی موجودگی کو اس نے حیرانی سے دیکھا تھا۔ پھر

ہاتھ میں موجود چھوٹی سی ٹرے میں تک دیکھ کر بھی سانس بھر کے ایک ہو گیا۔

”تائی جان نے سر درد کی گولیاں بھیجی ہیں۔ آپ کھالیں۔“ اس کے سنجیدہ تاثرات کو دیکھ کر وہ بمشکل بولی۔

”جی بہتر“ اس نے خشک لہجے میں کہہ کر ٹرے تھام لی۔ ”اور کوئی بات“ ٹرے تھما کر بھی وہ انگلیاں مروڑتی کھڑی رہی تو اسے ناچار پوچھنا پڑا۔ اب وہ اس کے منہ پر تو دروازہ بند نہیں کر سکتا تھا۔

”آپ ناراض ہیں، مجھ سے......؟“ وہ جھجکتی ہوئی استفسار کر رہی تھی۔ وہ دہلیز سے ہٹ کر کمرے میں آ گیا تھا۔ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اسے دیکھنے لگا جواب بھی دہلیز پہ کھڑی تھی اور جواب طلب نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”نہیں۔“ مختصر کہہ کر وہ اجنبی بن گیا تھا۔

”فہد، حرا کا بھائی ہے۔ حرا میری کلاس فیلو ہے۔ اچھی دوستی ہے۔ اس کے بھائی کو نہیں جانتی۔ حرا کے منہ سے کئی بار اس کے بھائی کا نام سنا ہے۔ وہ حرا کے لیے برتھ ڈے سرپرائز پارٹی رکھ رہے تھے تو اس لیے کال کی۔ ! میں ان سے کبھی ملی نا کبھی بات ہوئی۔“

وہ خود ہی صفائی دینے کھڑی ہو گئی تھی۔ علی زریون خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے تم سے کوئی صفائی نہیں مانگی۔ نا ہی تفتیش کی کہ کس کی کال تھی؟ کون تھا؟“

وہ سنجیدگی سے کہہ کر رخ پھیر کر اپنی کتابوں سے بھری ریک کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی دو قدم اندر آئی تھی۔

”لیکن میرا فرض ہے کہ میں آپ کو ساری سچائی سے آگاہ کروں۔ اور آپ سے کوئی بھی بات پوشیدہ نا رکھوں۔“

”مرضی ہے، آپ کی...... میں نے پابند نہیں کیا۔“ وہ نروٹھے لہجے میں کہہ کر ایک کتاب نکال کر اس کے صفحات پلٹنے لگا۔ اعلا درجے کی لاتعلقی پر اشمل کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اس کی ناراضی دور کرے۔

”آپ ناراض نا رہیں مجھ سے...... مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ مجھ سے آپ کی ناراضی برداشت نہیں ہو رہی۔“

وہ بالآخر خود کو مضبوط پوز کرتی اشمل کا ضبط جواب دے گیا۔ لہجہ گلوگیر ہوتے ہوئے چہرہ آنسوؤں سے بھیگنے لگا۔

”تمہیں پروا ہے میری ناراضی کی؟“

ہاتھ میں پکڑی کتاب دھپ سے بند کر کے ریک پر پٹخی۔ آواز پر اس کا نازک دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ہراساں نظروں سے اس کے غصیلے چہرے کو دیکھنے لگی۔

”کس بات کا رونا ہے جو ختم نہیں ہو رہا تمہارا۔ میں نے ہمیشہ اپنے جذبات تم پر عیاں کیے۔ لیکن تم نے کبھی اشارہ بھی نہیں دیا کہ تم بھی میرے لیے ایسے جذبات رکھتی ہو اور اب جب کہ میری دعائیں قبول ہو گئیں تو تمہارا رونا دھونا میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ رشتہ تمہارے لیے زبردستی کا سودا ہے تو بول کیوں نہیں دیتیں...... سن کر مجھے دکھ ہی ہوگا نا، مگر وہ دکھ اس اذیت سے تو کم ہوگا جو میں اس وقت محسوس کر رہا ہوں کہ تم ہمارے رشتے سے خوش نہیں ہو...... جوں جوں رخصتی کے دن قریب آ رہے ہیں تمہاری اداسی بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر تمہاری زندگی میں کوئی ہے تم کسی کو پسند کرتی ہو تب بھی مجھے بتا دو...... میں خود تمہاری راہ سے ہٹ جاؤں گا۔“

اس کے بازو کو جھنجوڑتے وہ طیش میں آ گیا تھا۔ اشمل حیرانی سے بنا پلکیں جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی محرومی کا ماتم کر رہی تھی اور وہ جانے کیا کیا منفی باتیں سوچ چکا تھا۔ آخری بات پہ اس کے ہاتھ کی سختی میں کمی آ گئی تھی۔ اسے بلا کا غصہ آیا تھا۔ اپنے بازو سے علی زریون کے ہاتھ اس نے جھٹک کر ہٹائے تھے۔

”برسوں سے دھوکا دے رہے ہیں آپ میری محبت کے اور اتنا ہی جانتے ہیں مجھے کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔“ بے حد تلخ نگاہ اس پر ڈال کر وہ غصے سے بولی تھی۔

”ہاں میں نے کبھی آپ کی محبت کا جواب نہیں دیا۔ اک ایسی لڑکی جس نے بچپن سے اپنے ماں، باپ کو جانوروں کی طرح لڑتے، گالیاں دیتے دیکھا ہو اس کم سن لڑکی کے جذبات سمجھ سکیں گے آپ......؟ کم سن لڑکی کا گھر ٹوٹ گیا۔ ماں باپ اپنی اپنی جنگ میں اسے ہار گئے......

ماں پیسہ اور نیا شوہر پا کر اسے فراموش کر گئی...... ایسی لڑکی، جس کا باپ کم عمری میں ہی سوتیلی ماں لا کر اسے اپنے ہی گھر میں نوکر بنا دے۔ اس کی مرضی، پسند، ناپسند کو سوتیلے بہن بھائیوں پر قربان کروایا جائے...... وہ لڑکی اپنے حق کے لیے کچھ بولنے کی ہمت رکھتی ہے......؟ اسے حق ہے کہ وہ کسی کے محبت بھرے جذبات کا جواب محبت سے دے سکے؟“ اشک بہاتی وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔ اور وہ ساکت اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”میری زندگی میں آپ کی محبت ہی روشنی کی ایک کرن تھی۔ لیکن میں اسے قبولیت کا درجہ بخشنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ قسمت نے آپ کا نام مجھ سے جوڑ دیا۔ شاید قدرت کو بھی میری بے زبانی کا احساس ہو گیا تھا کہ میں کبھی اپنے حق کے لیے نہیں بول سکوں گی...... آپ جیسا ہم سفر...... تائی جان جیسی مہربان ساس، شفیق باپ کا روپ لیے تایا جان...... اور رمشا جیسی دوست کو نند کے روپ میں پا کر میں رب العزت کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے۔ بے شک آپ سب نے مجھے بے حد مان اور محبت دی...... مجھے کبھی کسی نے احساس نہیں دلایا کہ میں کن حالات میں رخصت ہو کر آئی ہوں......

اک لڑکی کی شادی، رخصتی کی باتیں سن کر کیا احساسات ہوتے ہیں یہ آپ نہیں سمجھ سکیں گے علی زریون، جو انسان سدا لازوال رشتوں کے درمیان رہا ہو، وہ میری ٹوٹی پھوٹی شخصیت کا سراغ نہیں لگا سکتا...... باپ کی بے حسی، ماں کی لاتعلقی قدم قدم یہ احساس دلا رہی ہے کہ میں پیدا کرنے والوں کی حقیقی محبت سے محروم انسان ہوں...... محبت کرنے والے انسان مر جاتے ہیں نا تو صبر آ جاتا...... لیکن جب والدین اپنی اپنی دنیا میں مگن اپنی اولاد سے لاتعلق ہو کر اسے فراموش کر جائیں۔ تب کتنی اذیت ہوتی ہے یہ آپ نہیں جان پائیں گے...... میرے سر پر نا کبھی باپ کا شفقت بھرا لمس رہا نا ماں کی فکر مند محبت...... اور اس پر ستم یہ کہ ان عظیم ہستیوں کی شان میں اف تک کی اجازت نہیں......“

وہ اپنے جذبات و احساسات اس کے سامنے رکھ کر سسک کر رو پڑی تھی...... اپنی بات مکمل کر کے پلٹنا چاہ رہی تھی، جی بھر کے اکیلے میں رونا چاہ رہی تھی لیکن اس کے ارادے بھانپ کر علی زریون نے پہلے اس کا بازو تھام لیا تھا۔ اور اب سنجیدگی سے اس کے بھیگے چہرے کو دیکھ رہا تھا اس کے لفظوں کی سچائی اس کے چہرے پر رقم تھی۔ مجبور و بے بس لڑکی جو اپنوں کے ہوتے ہوئے اپنوں کی محبت و توجہ سے محروم تھی۔ ٹھیک کہا تھا اس نے مردوں پر صبر آ جاتا ہے لیکن زندوں کی لاپروائی انسان کو پل پل مارتی ہے۔ کاٹتی ہے۔ اپنوں کی بے حسی پر تڑپاتی ہے۔ اس کے جذبات و احساسات کس نہج پر تھے اور وہ الٹا سیدھا سوچ رہا تھا۔ اسے رمشا کی تیاریاں، اس کی فرمائشیں یاد آنے لگے۔ چند دن کے فرق سے دونوں شادیاں تھیں۔ رمشا کے ناز نخرے اٹھانے والے ماں، باپ، بھائی تھے۔ اس کا تو کوئی نہیں تھا۔ کچھ لڑکیاں حقیقتاً! بہت محروم نصیب لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ محبت لٹا کر اپنا آپ وار کر بھی خونی رشتوں سے انہیں خراج نہیں ملتا۔ اب جب کہ اس کے جذبوں تک رسائی حاصل ہوئی تو یہ نازک سی لڑکی اسے دل کے مزید قریب محسوس ہونے لگی۔

”بتا نہیں سکتی تھیں کہ یہ پریشانی ہے۔“ محبت سے دیکھتے وہ نرم لہجے میں گلہ کر رہا تھا۔

”کیا بتاتی کہ جس لڑکی کو اپنے ہی باپ کے

PakiBooks.Site

گھر میں اسٹور میں سونے کو جگہ ملتی تھی، آپ کے عالی شان گھر کے خوب صورت بیڈروم میں اب چین سے سوتی ہے تو بھی اسٹور میں گزری راتوں کو فراموش نہیں کرپاتی، جب اکیلے اسے ڈر لگتا تھا تو کوئی اسے اپنے ساتھ کا سہارا دینے والا نہیں ہوتا تھا...... جب لائٹ چلی جاتی تھی تو اندھیرے کے ڈر سے ساری ساری رات تکیے میں منہ چھپائے کانپتی رہتی تھی...... اور کون کون سے ماضی کے دکھ بتاؤں آپ کو جو مجھے حال میں خوش نہیں ہونے دیتے۔''

گزرے لمحوں کی اذیت کے رنگ اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ علی زریون اک لمحے تک کچھ بول نا پایا۔ بس خاموشی سے اسے اپنے وجود کا مان بخشنے کے لیے قریب کرلیا کہ کچھ دکھوں کی کہانی جان کر ان کے لیے تسلی کے حروف چھوٹے لگنے لگتے ہیں۔

''اب سے، گزرا کل یاد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جو ہے آج ہے۔ تم اپنی مرضی سے نئی داستان لکھو...... ماضی کو فراموش کردو'' وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ اس کے بازو ہٹا کر وہ بے ساختہ دروازے کی اور دیکھنے لگی۔

''بیوی ہو کر اتنا گھبرا رہی ہو؟'' بدگمانی کے بادل چھٹے تو وہ مسکرانے لگا۔

''میں جا رہی ہوں۔'' چہرے پر آئے بالوں کو کان کے پیچھے کرتی اس کی حرکت پر خفیف سی ہوگئی تھی۔

''اوکے جاؤ لیکن جلدی سے تیار ہو جاؤ تمہیں میرے ساتھ ابھی باہر جانا ہے۔'' اجازت دیتے اس نے پروگرام بھی سیٹ کردیا۔

''باہر......؟'' لیکن کیوں اور آپ کے ساتھ......؟'' وہ اچنبھے سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''تمہارے لیے اک سرپرائز لے رکھا ہے۔ سوچا تھا شادی کے بعد دوں گا لیکن تم نے ابھی اتنا اموشنل کردیا کہ پلان چینج کرنا پڑا۔'' وہ شوخی سے کہہ رہا تھا۔

''ایسے ہی بتا دیں سرپرائز، کیا ضروری ہے باہر جانا'' وہ تذبذب کا شکار تھی یوں پہلے کبھی علی زریون کے ساتھ اکیلے کہیں نہیں گئی تھی۔

''محترمہ مسز! سرپرائز بھی کبھی بتاتے ہیں...... ! جاؤ تیار ہو جاؤ، میں مما کو خود بتا دیتا ہوں۔''

وہ اس کی مشکل جان گیا تھا تب ہی انجم بیگم کی اجازت کا حوالہ دے گیا۔ وہ الجھن بھرے انداز میں پلٹ گئی۔

''اگر جو میں جانے سے انکار کروں تو...... پتا نہیں تائی جان میرے بارے میں کیا سوچیں۔''

وہ دوبارہ پلٹ کر پوچھ رہی تھی۔ علی زریون کو اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت پر ہنسی آرہی تھی۔ ساتھ ہی دکھ بھی ہو رہا تھا۔ لوگوں کے رویوں کو سوچ سوچ کر اس نے اپنے لیے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس کی اپنی خوشی کس میں ہے۔

''کوئی کچھ نہیں سوچے گا۔ تم میری بیوی ہو۔ میری ذمہ داری ہو۔ اب سے تم پر اٹھنے والے سوال کا جواب میں دوں گا...... تم پرسکون ہو کر بس تیار ہو جاؤ۔''

اس کے مضبوط لب و لہجے پر اشمل جیسے پرسکون ہوگئی تھی۔ بلو سوٹ میں بالوں کو برش کرکے بالوں کی چوٹی بنا کر لاؤنج میں آئی تو علی زریون کو ان کے درمیان خوش گوار مزاج میں باتیں کرتے دیکھ کر جھجک کر رک سی گئی۔ وہ بھی تیار ہو چکا تھا۔

یہ دھلا ہوا منہ لے کر باہر جاؤ گی۔ پہلی بار میاں کے ساتھ باہر جا رہی ہو۔ ذرا سا سرخی پاؤڈر تو لگا لو لڑکی۔''

رمشا نے ہاتھ پکڑ کر اسے مقابل بٹھا کر اپنا قریب رکھا پرس کھینچ لیا۔ پرس میں ہاتھ ڈال کر اس نے دو چار چیزیں سرعت سے نکالیں اور لگی اس کے منہ پر ڈینٹ پینٹ کرنے۔ وہ پہلے ہی اس کے جملوں سے سمٹی جا رہی تھی۔ انجم بیگم کی مسکراہٹ اور علی زریون کی شریر نظروں پر مزید شرمندہ ہوگئی۔

رمشا کے مشاق ہاتھوں نے جھٹ پٹ فاؤنڈیشن کے ساتھ بلشر اور لپ گلوس لگا کر اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ دبی زبان سے منع کرتی رہی لیکن رمشا کون سا اس کی سننے والی تھی۔

''کبھی کبھی خوب صورت بالوں کو کھلا بھی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ یہ بے چارے بھی سانس لے سکیں۔''

چوٹی کھول کر رمشا نے جھٹ برش پھیر دیا تو لمبے بال اس کی پشت اور شولڈر تک پھیل گئے۔ اس نے لاچار نظروں سے ارد گرد دیکھا۔

''رمشا شادی سے پہلے اشمل کو ٹرینڈ کر کے جانا۔ بالکل خیال نہیں رکھتی یہ لڑکی اپنا۔'' انجم بیگم نے بھی کہا تو وہ سر جھکا گئی۔

''شکر ہے۔ آپ نے کسی چیز میں تو میری بڑائی مانی۔'' رمشا تعریف پر چہکنے لگی۔

''جاؤ لڑکی مزے کرو۔ ویسے تمہیں بھیجا تو میں نے سر دبانے کے لیے تھا۔ تم تو پٹی ہی پڑھا آئیں۔ میرے بھائی کو......''

رمشا کی شوخی پر علی زریون بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ انجم بیگم بھی مسکرا کر رمشا کی پیٹھ پر دھپ لگا بیٹھیں اٹھتے ہوئے اس کے قدم مزید من بھر کے ہوگئے۔ لاؤنج سے نکل کر اس نے اشمل کا ہاتھ تھام لیا تو وہ خاموشی سے اس کے سنگ چلنے لگی۔

☆☆☆

''کیسا لگا اپنا گھر......؟'' وہ اسے اک اک چیز چیک کروا رہا تھا۔ اور وہ شوق سے دیکھ رہی تھی۔

''اپنا گھر......؟'' اس کی کجراری آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا تھا۔

''یہ گھر تمہارے لیے لیا ہے۔ سرپرائز تھا اس لیے تمہارے نام پر ٹرانسفر نا کروا سکا۔ جلد ہی یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔ کل کو جب تم مجھ سے لڑو گی تو دھمکی تو دے سکتی ہو کہ اپنے گھر جا رہی ہوں۔''

وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ مسکرا بھی نا سکی۔ اس کی کم مائیگی کو وہ کتنی خوب صورتی سے دور کر گیا تھا۔

''میں نہیں دوں گی کبھی دھمکی، نا کبھی چھوڑوں گی آپ کو۔'' وہ سنجیدگی سے اعتراف کر گئی تو اس کے اندر ڈھیروں سکون پھیل گیا۔

''جانتا ہوں، میری پگلی بھلے منہ سے اقرار نا کرے مگر محبت بہت کرتی ہے۔'' وہ بے ساختہ اس کے شانے پر بازو پھیلا گیا۔

''کوئی نہیں۔'' وہ شرما کر جھٹلا گئی۔

''تائی جان یا کسی کو برا نا لگے۔ آپ کو اتنا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا گھر وہی ہے جہاں آپ سب ہیں۔''

وہ دل کا خدشہ زبان پر لے آئی۔ کہ زمین، جائدادیں اکثر رشتوں کو کھا جاتے ہیں۔

''کوئی کیوں اعتراض کرے گا۔ میں جو چاہوں اپنی بیوی کو تحفہ دوں...... کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ سب کے علم میں ہے کہ میں نے اپنی عزیز بیوی کے لیے گھر لیا ہے۔ تم فضول سوچوں سے دور رہا کرو۔ کہا نا۔ اب سے تمہاری طرف آنے والے ہر سوال کا جواب میں دوں گا۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

وہ شجر سایہ دار بنا اپنی ذات کا یقین دلا رہا تھا۔ اس کا تفکر بھی کسی حد تک دور ہو گیا تھا۔ واپسی میں ڈنر اور شاپنگ کرنے کے دوران اسے دیر ہونے کی فکر ستا رہی تھی مگر وہ جلدی کے موڈ نہیں تھا۔ ہر چیز لے کر ہی لوٹا تھا۔

☆☆☆

رمشا کے سسرال سے عیدی آئی تو پھر جانے کی بھی تیاری ہونے لگی۔ اس میں بھی رمشا نے ہر چیز اپنی پسند سے سو سو نخرے کر کے سسرالیوں کے لیے بھیجی۔ انجم بیگم کی لائی چیزیں واپس کروائیں جس پر انجم بیگم نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ وہ اب سے بھی رمشا کے لیے کچھ پسند نہیں کریں گی۔ گو کہ عید کے لیے اس کے پاس کئی سوٹ تھے۔ انجم بیگم نے شاپنگ کروائی تھی۔ علی زریون نے ساری چیزیں

خراب ہے بابا کی۔''
وہ مجرموں کی طرح اعتراف کر گئی کہ واقعی اس سے بڑی غلطی ہو گئی ہے۔
''اپنوں سے ملنا، جلنا، فون پہ باتیں کرنا، آپ کو پسند نہیں، چچی جان...... اب منادی تو نہیں کروائی آپ نے کہ ہمیں علم ہو جاتا کہ چچا جان کی طبیعت ناساز ہے آپ تو ہمیں اپنا سمجھتی ہی نہیں چچی جان بھر اس بے چاری سے گلہ کیوں کر رہی ہیں۔ جو لاعلم ہے...... اب سے یہ میری ذمہ داری ہے۔ کبھی بھی میری، اشمل کی ضرورت پڑے، بتائیے، حاضر نا ہوں تو الزام لگائیے......''

علی زریون کے بھگو کر جوتا مارنے پر نعیمہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

''اپنوں کو بتانے کی ضرورت کب ہوتی ہے، وہ تو خود باخبر ہوتے ہیں۔'' نعیمہ نے بھی ہارنا نہیں سیکھا تھا۔

''اپنوں کے پاس سفلی کا کالا علم جو نہیں ہے چچی جان، بتانا تو پڑے گا۔''

علی زریون کے سنجیدگی سے دیے جواب پر رمشا کو ہنسی تو بہت آئی مگر وہ ضبط کر کے اشمل کو ٹھوکا دے کر اس کے کان میں گھس گئی۔

''دیکھو ذرا اپنے میاں کو، کیسے تمہاری طرف داری کر رہا ہے۔'' وہ بے ساختہ اسے ہی دیکھے جا رہی تھی جو اس کا محرم تھا۔ جو لفظوں سے نہیں عمل سے محبت جتاتا تھا۔

☆☆☆

روزے بخیر و خوبی گزر رہے تھے۔ ساتھ ہی شادی کی تیاریاں بھی زور پکڑ گئی تھیں۔ بالآخر چاند نظر آ گیا۔ اور نئی صبح عید کی نوید لے کر آ گئی۔ عید کا دن کچھ سستی اور کچھ مہمانوں کی آؤ بھگت سے گزر گیا اور بالآخر شادی کا دن بھی آ ہی گیا۔

محرومیوں بھرا ماضی چھوڑ کر اس نے خوشیوں بھرے حال اور مستقبل میں قدم رکھ دیا۔ شادی میں صرف دنیا دکھاوے کو مہمان بن کر آئے تھے۔ ثانیہ کے بچوں کے پیپرز چل رہے تھے۔ اک ہی شہر میں رہتے ہوئے انہوں نے شادی میں آنے سے معذرت کر لی تھی۔ دلہن بنی اسٹیج پر بیٹھی وہ ملول ہوتی تو علی زریون چپکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر مسکرانے پر زور دیتا۔

گزرتے وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ کتنا اچھا ہم سفر ہے۔ اس کا ماضی نہیں بدلا تھا۔ نا ہی ماضی کے لوگ بدلے تھے۔

اس کے احساسات بھی نہیں بدلے تھے جو ہمہ وقت آس لگائے بیٹھے رہتے تھے کہ شاید اب انہیں احساس ہو جائے۔ شاید اب وہ پلٹ آئیں۔ مگر وہ انجان تھی کہ کچھ لوگ بے حسی کی کوکھ سے ہی جنم لیتے ہیں اور اسی میں دفن ہو جاتے ہیں۔ انہیں احساس دلانے والا سر پٹخ پٹخ مر ہی کیوں نا جائے۔ وہ بے حسی کی نگری سے نہیں پلٹتے......

ان کی شادی کو سال ہونے والا تھا۔ ننھا ارسم ان کی دنیا کو مکمل کرنے آ گیا تھا۔ دادا، دادی کی آنکھ کا تارا تھا تو ان دونوں کا قرار، رمشا کا پہلا پیار...... رمشا بھی اپنے سسرال میں خوش تھی اس کی ڈلیوری عید کے بعد متوقع تھی۔ پتا ہی نہیں چلا تھا اور رمضان المبارک اک بار پھر آ گئے تھے۔ پھر سے وہی سحر و افطار کی رونقیں تھیں۔ کمی تھی تو رمشا کی جو سسرال میں تھی۔ اور کچھ نیا تھا تو ارسم کے ساتھ ان سب کا پہلا رمضان۔

''یہ لڑکی نا پاگل کر دے گی مجھے...... پہلے روزے سے عیدی کب لے کر آئیں گی کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔''

وہ ارسم کو فیڈر پلا رہی تھی جب انجم بیگم رمشا کی کال سے فارغ ہو کر اسے بتانے لگیں۔ وہ بھی مسکرا دی۔ رمشا اسے بھی کئی بار فون کر کے چیزیں لکھوا چکی تھی کہ عیدی میں یہ بھی ہو، وہ بھی ہو۔

فیڈر رکھ کر ارسم کو کندھے سے لگا کر تھپک رہی تھی تا کہ ڈکار لے لے...... تب ہی اس کے نمبر پر

دلوا دی تھیں لیکن اس کا دل پھر بھی جانے کیوں اداس تھا۔

اور جب غیر متوقع اس کے نام پارسل آیا تو احمد صاحب کا نام دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔ عید اور عید سے جڑی عیدی، بیٹیوں کے لیے کتنی خوشیوں، کا سامان لے کر آتے ہیں یہ کوئی اس سے پوچھتا۔ ثانیہ کو تو وہ بھولے سے بھی کبھی تہواروں پر یاد نہیں آئی تھی۔ ہاں باسی عید پر ان کا پیغام آ جاتا تھا وہ بھی سرسری سا، جیسے سب کو کر رہی ہوں اور اسے بھی ساتھ کر دیا ہو۔

پارسل سے نکلتے سوٹ، چوڑیوں، مہندی، جوتوں اور جیولری کو وہ ساتھ لگا لگا کر دیکھ کر خوش ہو رہی تھی اور سب اس کی خوشی دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

''میرے پاپا اتنے برے نہیں جتنا میں سوچتی ہوں۔'' خود کو باور کرواتی وہ رات ان کا نمبر ملا گئی۔ تا کہ ان کا شکریہ ادا کر سکے۔ اور جب شکریہ کے جواب میں احمد صاحب نے حیرانی کا اظہار کر کے کوئی بھی پارسل کے بھیجنے سے لاعلمی کا اظہار کر کے انکار کیا تو اس کا سارا جوش، خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ احمد صاحب فون بند کر چکے تھے۔ اور وہ سیل فون کان سے لگائے اک لمحے میں جان گئی کہ یہ حرکت کس کی ہے۔

اگلے ہی لمحے وہ علی زریون کے دروازے پر کھڑی تھی۔

''خیریت ہے مسز......! اس وقت کیسے یاد آئی......؟'' وہ شوخی سے دروازے کے فریم میں جم گیا۔

''اندر تشریف لائیے، اپنا ہی کمرا سمجھیں۔'' وہ شریر ہو رہا تھا۔

''پارسل آپ نے بھیجا ہے نا، تا کہ باپ کی طرف سے ملنے والی عیدی پا کر میں خوش ہو جاؤں؟'' وہ سنجیدگی سے دریافت کر رہی تھی اور بات اک دم سے کھل جانے پر علی زریون کے لبوں سے مسکراہٹ اک پل کو غائب ہو گئی۔

''مجھے آپ کی نیت پر کوئی شک نہیں۔ لیکن آئندہ سے ایسی کوئی حرکت نا کیجیے گا کہ سچ کھلنے پر میں مزید ٹوٹ جاؤں کیونکہ کچھ لوگ جھوٹ بول کر بھی خوشی نہیں دے سکتے۔''

ٹوٹے بکھرے لہجے میں وہ احمد کا لہجہ یاد کر رہی تھی صفا چٹا انکار کر کے انہوں نے کیسے جھٹ سے فون بند کر دیا تھا۔ پیچھے سے نعیمہ کی آواز آ رہی تھی کہ اب بیٹی کو کیوں یاد آ رہی ہے۔

علی زریون نے اسے خوشی دینے کو احمد صاحب کے نام کا سہارا لیا کہ میکے کی طرف سے آنے والی عیدی پا کر لڑکی خوش ہوتی ہے لیکن افسوس کے احمد صاحب جھوٹ بول کر بھی اسے خوشی نا دے سکے۔ اپنی بات کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ علی زریون کو بھی افسوس ہونے لگا کہ اسے احمد صاحب کو اعتماد میں لے لینا چاہیے تھا۔ لیکن جانے وہ اشمل کو جھوٹی خوشی دینے پر بھی راضی ہوتے یا نہیں۔

☆☆☆

انجم بیگم نے افطار ڈنر پر احمد صاحب نعیمہ ان کے بچوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ اس نے کئی چیزیں دونوں کی پسند کی بنائیں۔

انجم بیگم کو بھی وقتاً فوقتاً احساس دلاتی رہی کہ یہ نا بنوائیں، کسی کو پسند نہیں، انجم بیگم نے بھی اس کی ہدایت کی روشنی میں کام کیا تھا۔ وہ لوگ افطار سے چند منٹ قبل آئے تھے کہ اذان شروع ہو گئی۔ دونوں ہی اجنبی بنے ہوئے تھے۔ بہن بھائی بھی الگ تھلگ تھے۔ ان سے مل کر اس کا دل مزید بوجھل ہونے لگا۔ احساس و محبت کی گرمی ڈھونڈے سے نہیں مل رہی تھی۔ حالانکہ وہ مہینوں بعد مل رہی تھی۔

''یہاں آ کر تم تو بھول ہی گئیں باپ کو......

پچھلے دنوں اتنی طبیعت خراب تھی ان کی...... وہ تو میری بیٹیوں نے راتیں جاگ جاگ کر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں تو بخار ٹوٹا ان کا...... تمہیں تو باپ کی پرواہ کوئی نہیں...... مست ہو نکاح کر کے۔''

نعیمہ نے جی بھر کے سنایا تھا۔ سب ہی ایک پل

PakiBooks.Site

رمشا کی کال آنے لگی۔

"رمشا کی کال ہے۔"...... وہ اسکرین کی طرف دیکھتے مسکرائی۔

"لاؤ ارسم کو مجھے دو...... سن لو بے چین روح اب کیا کہہ رہی ہے۔ سوچ ہی ہوں کل ہی عیدی لے کر پہنچ جاؤں، کم از کم اس کی روز، روز کی دس فرمائشی کالز سے تو جان چھوٹے گی۔"

انجم بیگم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کال کس لیے تھی۔ وہ مسکرا کر کال ریسو کر گئی اور انجم بیگم کا اندازہ درست ثابت ہوگا۔

"اشمل، یار مما جب شاپنگ پر جائیں تو تم بھی ساتھ چلی جانا۔ اور دیکھو کچھ نا بھولنا، چھوٹے دیور کا جوڑا بھی ضرور لینا۔ اور اس کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ بھی لے لینا...... اعتکاف میں بیٹھے گا نا، بھلے ماموں کا گھر، سسرال ہے لیکن سسرال تو سسرال ہے نا...... اور مما میرے لیے چار جوڑے لا رہی ہیں۔ دو تین جوڑے داماد کے لیے بھی مزید لینے کو کہہ دو...... الحمدللہ پیسوں کی کی تو کوئی تنگی نہیں نا ہمارے گھر......" رمشا بہت بے چین لگ رہی تھی۔

"تم فکر نا کرو۔ ہم بہت اچھی عیدی لے کر آئیں گے۔ کھوگی تو تمہارے اور رامس بھائی کے دس جوڑے بھی رکھ لیں گے۔ سارے سسرالیوں کا جوڑا ان کے لیے گفٹ، میوے بھی لے چکے ہیں۔ بس آنے سے پہلے فروٹس اور فریش کھجلہ، پھینیاں منگوا لوں گی۔"

اشمل نے تفصیلات بتا کر تسلی دی۔

"لو اور سنو دس جوڑے...... پوچھنا ذرا عیدی منگوا رہی ہے یا جہیز کے جوڑے دوبارہ تیار کروا رہی ہے۔ پہلے تو ماں کی لائی ہوئی چیزوں میں سو سو کیڑے نظر آتے۔"

پاس بیٹھی انجم بیگم ارسم کو کندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے اونچی آواز سے کہہ رہی تھیں۔

"ماں سے دور ہو کر ہی تو احساس ہوتا ہے بھلے جتنی اچھی سسرال ہو۔ جتنا اچھا میاں ہو لیکن لڑکی کے میکے سے اک مٹھائی کا ڈبا بھی آئے تو سسرال میں میکے کی واہ واہ ہوتی ہے کہ لڑکی لاوارث نہیں اس کا والی وارث ہے اور عیدی کا میں بار بار اس لیے کہہ رہی کہ دیورانی کی عیدی آئی تو وہ اکڑی گھوم رہی ہے۔ میرے سسرال والے ذرا تحفے لے کر خوش ہونے والوں میں سے ہیں۔ وہ بھی خوش ہو جائیں گے اور میرے میکے کی دھاک بیٹھے گی تو میری ہی عزت سسرال میں بڑھے گی۔ دیورانی کے گھر سے معمولی چیزیں آئیں تو سب نے ناک منہ دکھایا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری سبکی ہو۔ مما کو سمجھا دینا۔ تم سمجھ رہی ہو نا اشمل!"

انجم بیگم کی باتیں سن کر رمشا کہہ رہی تھی۔

اور اس کے اندر درد کے تار جھنجھنا رہے تھے۔

"سچ ہی تو کہہ رہی تھی وہ...... گو کہ آج تک اسے کسی نے احساس نہیں دلایا تھا کہ اس کے میکے سے آج تک اک سوئی نہیں آئی۔ مگر کوئی کہے نا کہے اس کے اندر یہ بات پن کی طرح چبھتی تھی۔



اس کی پہلوٹھی کی اولاد کو دیکھنے کے لیے اس کی ماں کو فرصت نہیں ملی تھی۔ آنے کی بات نازک وقت میں بیٹی کو ذہنی اور روحانی طور پر ماں کی کمی کس قدر محسوس ہوتی ہے وہ اس سے انجان تھیں۔ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے، انہوں نے اس خیال کی بھی دھجی اڑا دی تھی۔ ہاں تصویریں واٹس ایپ کر دو کہہ کر فرض پورا کر دیا تھا۔ احمد صاحب غیروں کی طرح ارسم کے ہاتھ پر چند سو رکھ گئے تھے۔ منہ دکھائی کے نام پر...... ایسے وقت میں لڑکی کے میکے سے لڑکی اور اس کے بچے کے لیے کتنی تیاریاں ہوتی ہیں کیا کچھ آتا ہے۔ کیسا سلوک ہوتا ہے وہ اس سے انجان تھی۔

ہاں علی زریون نے ہر چیز حد سے بڑھ کر کی تھی۔ ارسم کا تحفہ ملنے پر اس نے ڈائمنڈ کا سیٹ گفٹ کیا تھا۔ وہ آج بھی اتنا اچھا تھا جتنا کبھی پہلے......

رمشا کی عیدی اس نے مزید اچھی بنائی تھی اور جب دے کر لوٹی تو رمشا رات فون کر کے اس سے

محبت و لگاوٹ کا اظہار کر رہی تھی کہ اس نے اچھی چیزیں بھیج کر اس کا مان بڑھا دیا۔

اور اسی شام اپنے نام کا پارسل پا کر وہ اک پل کو حیران ہوئی اگلے پل علی زریون کا نام دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ شخص ہمیشہ ہی اسے خوش کرنے کے جتن کرتا رہتا تھا۔ اندر سے سوٹ، میچنگ کی تمام چیزیں نکلیں تو وہ اس کی محبت پر سرشار ہو گئی۔ اپنے تیئں وہ اس کی محرومیوں کا ازالہ کرنا چاہ رہا تھا۔

"بہت شکریہ! عیدی بہت اچھی ہے۔"

رات کو ارسم کو سینے پر لٹائے اس سے کھیل رہا تھا تو وہ بھی چپکے سے آ کر پہلو میں لیٹ گئی۔

"مہربانی آپ کو چیزیں پسند آئیں۔" وہ مسکرا کر اسے قریب کر گیا۔

"کیوں کرتے ہیں آپ ایسی حرکتیں؟" وہ ناز سے سوال کر رہی تھی۔

"کیونکہ محبت کرتا ہوں تم سے...... میں نہیں چاہتا۔ میری بیوی کا دل کسی بھی وجہ سے ملول ہو۔"

"مجھ جیسی لڑکیاں تو بے شمار ہوں گی جو خوشیوں کے تہواروں میں کہیں مرحوم والدین کی کمی پر روتی ہوں گی تو کوئی میری طرح زندوں کی بے حسی پر کلستی ہوں گی۔ لیکن مجھ جتنی خوش قسمت لڑکیاں بہت کم ہوں گی۔ جنہیں آپ جیسا اچھا شریک سفر ملا ہو۔ بہت شکریہ میری زندگی میں آنے کا...... میری زندگی میں خوشی کا وجود آپ کے دم سے ہے...... اک مہربان ہم سفر کسی نعمت سے کم نہیں۔"

وہ بہت عقیدت و محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس نے اس کی پیشانی پر اپنی محبت ثبت کر دی تھی۔

ارسم کی کھلکھلاتی آواز میں غوں غاں ارسم کی محبت بھری نظر اس کی دنیا مکمل ہو گئی تھی۔ علی زریون نے اس کی محروم زندگی میں خوش گوار رنگ بھر دیے تھے۔

"اس بار چاند رات کو باہر چلو گی؟"

"کیوں، اس بار کیا خاص بات ہے؟" جاننا چاہتی ہوں۔

"ایویں، آوارہ گردی کریں گے۔ شاپنگ، ڈنر، پھر تم مہندی لگوا لینا......" وہ پلان سنا رہا تھا۔

"اور ارسم صاحب......!" یاد دلایا کہ اس پروگرام میں اس کا کہیں ذکر نہیں تھا۔

"اسے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ ماں کے پاس چھوڑ دوں گا۔ وہ دیکھ لیں گی۔ اب آ گیا ہے تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ اس کی ماں کو چند گھنٹوں کے لیے بھی اکیلا لے کر گھوم پھر نا سکوں۔ کیوں بھئی...... لے جاؤں تمہاری ماں کو اجازت ہے؟"

وہ شوخی سے کہتے بیٹے کے نخرے اٹھا رہا تھا۔ بیٹا بھی خوب اچھلنے لگا تھا۔

"دیکھا کتنا خوش ہو رہا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔ ظالم ماں سے آزادی ملے گی۔ تھوڑا بڑا ہوا تو دیکھنا خود کہے گا آپ کی بیوی کے ساتھ میرا گزارا نہیں۔ دوسری مما لا کے دو۔" وہ چھیڑ رہا تھا۔

"ہاں تو بیٹے کی فرمائش پر لے آئیے گا۔ دونوں کے مزے۔" وہ ہنستے ہوئے اس کے بال کھینچ گئی۔

چاند رات کو شاپنگ کرتے، چاٹ، دہی بڑے انجوائے کرتے باہر ڈنر کر کے واپسی میں مہندی لگوا کر لوٹی ارسم کو انجم بیگم سلا چکی تھیں۔ صبح عید تھی۔ خوشیاں تھیں، لیکن ہزار خوشی کے بعد بھی اس کے اندر سے اپنوں کی بے حسی کا دکھ نہیں مٹتا تھا۔ علی زریون بہترین ہم سفر تھا۔

ہر گھڑی اس کی خوشیوں کے لیے سامان پیدا کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔ جن لڑکیوں کے میکے میں کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں ہوتا سسرال میں ہزاروں خوشیاں پا کر بھی عید کی خوشیوں میں وہ اپنی آنکھوں کا گیلا پن ضرور چھپاتی ہیں...... اس کی آنکھیں بھی نم تھیں لیکن لب مسکرا رہے تھے۔

☆☆

نگہت عبداللہ

ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز وطرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

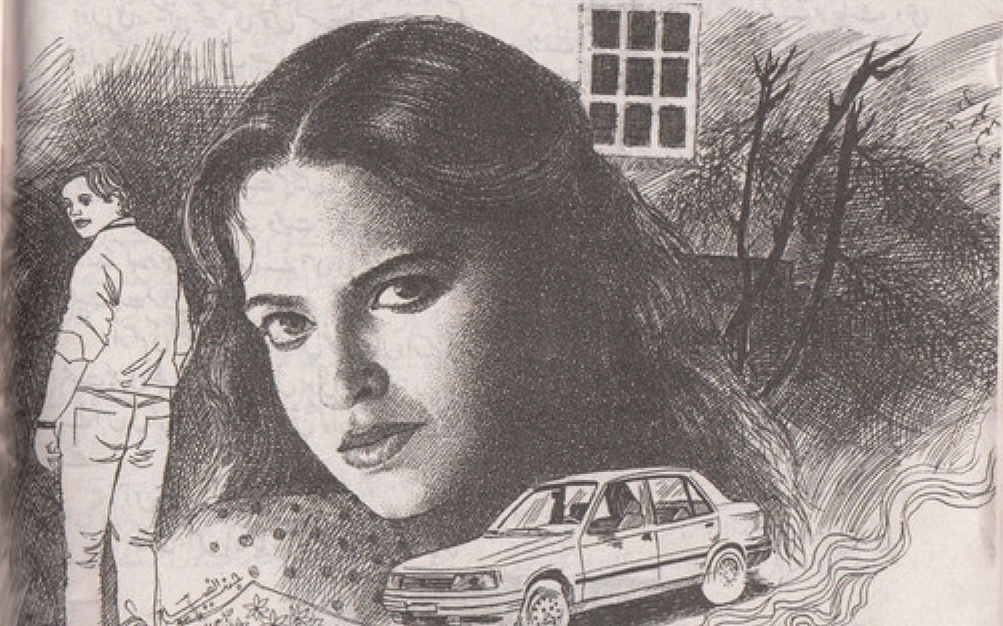
حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جاب مل جاتی ہے لیکن اس کے باس حسان صاحب کی بیٹی ربیکا اس کو پسند کرنے لگتی ہے جو وقتاً فوقتاً حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔

تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے، سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے اب بھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زوبی کا بے بی لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضامند نہیں ہے۔





گویا کے سوزے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خزینہ اسے باس تیمور دل نظر آتی ہے لیکن وہ خزینہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزینہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منا لے گا۔ خزینہ تیمور کی محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حمیدہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خزینہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

آٹھویں قسط

ابھی اجالا نہیں پھیلا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ مدھم روشنی میں بے خبر سوئے تیمور غزنی کو دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ پالینے کی سرشاری کیفیت تھی اور وہ اس کیفیت میں ڈوبے رہنا چاہتی تھی کہ اذان کی آواز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے پوری اذان سنی پھر احتیاط سے بستر چھوڑ دیا۔ اور شاور لے کر اپنی نئی زندگی کا آغاز نماز سے کیا پھر کچن میں آ کر سارے کچن کا جائزہ لیا۔ ہر شے موجود تھی۔ اس نے اطمینان سے ہو کر چولہے پر چائے کا پانی رکھا پھر ٹرے میں کپ رکھے تھے کہ تیمور غزنی کی اچانک آواز پر اچھل پڑی۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو......؟''

''اف آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔''

''سوری۔'' وہ بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولا۔ ''میں پوچھ رہا تھا یہ صبح صبح تم......''

''چائے بنا رہی ہوں کیا آپ صبح چائے نہیں پیتے۔'' اس کے پوچھنے پر وہ نادم سا ہو کر کہنے لگا۔

''پیتا تو ہوں لیکن کچھ اچھا نہیں لگ رہا...... آئی مین ایک تو یہاں استقبال کے لیے کوئی نہیں تھا دوسرے......''

''بس آپ کو یہ سب سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ٹوک کر کپ میں چائے ڈالنے لگی تو وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''میں نے فل ٹائم میڈ کی بات کی ہے۔ دو تین دن میں آ جائے گی۔''

''اچھی بات ہے۔ اب چلیں، پہلے چائے پی لیں۔''

''اوکے میم!'' اس کے دلکش انداز پر وہ مزید گھائل ہو گئی۔

پھر ٹیرس پر اس کی ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے اسے خود پر رشک آ رہا تھا۔ زیادہ تیمور غزنی ہی بول رہا تھا۔ بالکل نارمل انداز تھا۔ نہ والہانہ پن نہ وارفتگی۔ جیسے برسوں سے اس کی یہ ہی روٹین ہو شاید اسے اپنے جذبوں پر اختیار تھا یا وہ اظہار کا قائل نہیں تھا۔ خزینہ یہ ہی گمان کر رہی تھی۔ اس کے باوجود رات میں بھی وہ منتظر رہی تھی اس کی طرف سے کوئی خوب صورت بات جو ہمیشہ کے لیے اس کی سماعتوں میں محفوظ ہو جائے اور ابھی بھی ایک نظر کا سوال تھا جو اسے لجا دے۔ لیکن اس کی وہی اول روز والی باتیں تھیں۔ میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ سارے مان دے کر بھی وہ اسے تشنہ چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

پھر ابھی وہ ناشتا بنانے کا سوچ رہی تھی کہ شہرینہ اور فاخرہ، حمزہ کے ساتھ ناشتا لے کر آ گئیں۔ وہ بے اختیار فاخرہ کی بانہوں میں سمائی تھی۔ پھر اس سے تعارف کرانے لگی۔

''غزنی! یہ میری چچی جان ہیں اور یہ ان کا بیٹا حمزہ۔''

''السلام علیکم۔ تیمور غزنی نے سلام کر کے خاصی گرم جوشی سے حمزہ سے مصافحہ کیا پھر شہرینہ کو دیکھا تو وہ ہنس کر بولی۔

''میں شہرینہ ہوں۔''

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر آپ تشریف رکھیں ناں۔'' اس نے محظوظ ہو کر نشست کی طرف اشارا کیا تو شہرینہ فاخرہ کو دیکھنے لگی۔

''پہلے ناشتا لگا دو بیٹا!'' فاخرہ نے کہا تو خزینہ نے پہلے انہیں بٹھایا پھر شہرینہ کے ساتھ مل کر ناشتا لگا دیا۔ خاصا پر تکلف ناشتا تھا۔ تیمور غزنی گو کہ اتنے ہیوی ناشتے کا عادی نہیں تھا لیکن اس نے کسی پر ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی تکلف کیا تھا۔

ناشتے کے بعد تیمور غزنی حمزہ کے ساتھ میٹنگ روم میں بیٹھا تو وہ فاخرہ اور شہرینہ کو اپنے کمرے میں لے

آئی۔

''سکھی رہو بیٹا۔ سدا سہاگن رہو۔'' فاخرہ نے فرط محبت سے پھر اسے گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی تو اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ان کے ہاتھ تھام کر بولی۔

''سچ چچی جان! مجھے صرف دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

''ہماری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی بیٹا۔'' ماشاءاللہ تمہارا میاں بہت اچھا ہے۔ اللہ تمہاری جوڑی سلامت رکھے۔ اس نے تمہارے لیے اتنا کچھ کیا ہے تو ان شاءاللہ اپنے ماں باپ کو بھی منا لے گا۔'' فاخرہ کی آخری بات پر وہ قدرے پریشان ہوئی کیونکہ حمیدہ بیگم نے تو سب کو کوئی اور ہی داستان سنائی تھی۔

''مجھے رات حمیدہ بھابھی نے سب بتایا ہے۔ خیر اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ لڑکا اچھا ہے آگے بھی سب اچھا ہوگا ان شاءاللہ۔'' فاخرہ کی ہر بات دعا پر ختم ہو رہی تھی۔

''بس چچی جان اب آپ امی کو بھی جا کر اطمینان دلا دیجیے گا کہ خزی تو لگتا ہی نہیں کہ اس گھر میں نئی آئی ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ہمیشہ سے یہیں رہ رہی ہو۔'' شہرینہ کی بات پر وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

''امی پریشان ہو رہی تھیں کیا؟''

''پریشان نہیں بیٹا! بس تھوڑی فکر مند تھیں۔ ماں ہیں ناں۔'' فاخرہ نے اسے تسلی دی پھر شہرینہ سے کہنے لگیں۔ ''چلو بیٹا حمزہ سے کہو اب چلنے کی بات کرے۔''

''کیوں چچی جان ابھی بیٹھیں ناں۔ آرام سے جائیے گا۔''

''بس بیٹا! ادھر تمہاری امی انتظار میں ہوں گی۔ اب تم آنا۔'' فاخرہ نے پیار سے خزینہ کا گال چھو کر کہا تو شہرینہ پوچھنے لگی۔

''کب آؤ گی خزی؟''

''دیکھو! اگر غزنی کا کوئی اور پروگرام نہیں ہوا تو پھر شام میں آؤں گی اور سنو امی کا خیال رکھنا۔'' اس نے کہا تو شہرینہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

''چلیں چچی جان اب یہ نصیحتیں کرنے والی ہو گئی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں شادی کو اور......''

''اچھا بس۔'' وہ اسے ٹوک کر فاخرہ کے ساتھ کمرے سے نکلی تو آگے حمزہ جانے کو تیار کھڑا تھا۔

☆☆☆

فاخرہ اور شہرینہ کو چھوڑ کر حمزہ آفس جانے کو تیار ہو گیا۔ گو کہ وہ بہت لیٹ ہو گیا تھا لیکن جانا ضروری تھا کیونکہ آج شیروانی والوں کے ساتھ میٹنگ تھی اور ربیکا نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ اسے میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔ وہ اس لڑکی سے عاجز ہونے کے باوجود اس کی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے بھاگم بھاگ آفس پہنچا تو آگے ربیکا اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

''سوری میں......'' وہ دیر سے آنے کی معذرت کرنا چاہتا تھا کہ ربیکا ہاتھ اٹھا کر بولی۔

''یہ سب بعد میں ابھی ادھر چلیں سب لوگ آ چکے ہیں۔''

''میں فائل لے لوں۔'' اس نے اپنے روم کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ کی فائل وہاں رکھ دی گئی ہے۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھی تو وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔

میٹنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک نظر میں سارے کا جائزہ لے لیا اس کے بعد یوں انجان بن گیا جیسے اس سارے معاملے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ جس پر ربیکا بار بار اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی اور پروجیکٹ پر بات کرنے کو اکساتی رہی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ جبکہ اندر ہی اندر خود کو اگلے مرحلے

کے لیے تیار کر رہا تھا کہ میٹنگ کے بعد ربیکا اس کا کیا حشر کرنے والی تھی اور جیسا اس نے سوچا تھا بالکل ویسے ہی جب وہ اپنے روم میں داخل ہوا تو ربیکا انتہائی غصے میں اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

''کانگریچولیشن میم! آپ کی میٹنگ کامیاب رہی۔'' اس نے فوراً خوش دلی سے مبارک باد دی تو وہ دانت پیس کر بولی۔

''لیکن تم ناکام ہو گئے۔''

''میں......!'' معصومیت سے اپنی طرف اشارا کیا تو وہ مزید بھڑک گئی۔

''بننے کی ضرورت نہیں ہے حمزہ! مجھے بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے تمہیں وہاں اسٹیچو بن کر بیٹھنے کو نہیں بلایا تھا۔ تمہیں پروجیکٹ پر بات کرنی تھی۔''

''ہاں لیکن......''

''کیا لیکن؟''

''میرا مطلب ہے ماسٹر مائنڈ لوگوں کے سامنے میری کہاں سنی جاتی۔ حسان صاحب، شیروانی صاحب، حسن شیروانی، ان کے سامنے میں تو بہت معمولی آدمی ہوں۔ ہاں اگر منیجر یا جنرل منیجر کی سیٹ پر ہوتا تب شاید۔'' وہ ذرا سے کندھے اچکا کر خاموش ہو گیا جبکہ وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''سوری یار! آپ ایسے تو مت دیکھو۔ میرا دل بند ہوا جا رہا ہے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مسکین شکل بنائی تو وہ ہونہہ کے انداز میں سر جھٹک کر بولی۔

''بیٹھ جاؤ......''

''تھینک یو......'' وہ فوراً بڑھ کر اپنی چیئر پر بیٹھ گیا تو ربیکا نے بھی اس کے سامنے چیئر سنبھال لی اور اپنے غصے پر قابو پانے کے بعد کہنے لگی۔

''دیکھو حمزہ پہلے تو تم اپنے دل اور دماغ سے یہ خیال نکال دو کہ تم معمولی آدمی ہو۔ جن کے سامنے تم خود کو معمولی تصور کر رہے تھے مستقبل قریب میں تم ان سب کو پیچھے چھوڑنے والے ہو۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ تمہیں اپنے ٹیلنٹ پر بھروسا ہونا چاہیے۔''

''ہے...... مجھے اپنے ٹیلنٹ پر بھروسا ہے۔ لیکن یہاں ٹیلنٹ نہیں پیسا بولتا ہے۔'' وہ زور دے کر بولا تھا۔

''ٹیلنٹ منواؤ گے تو پیسا خود چل کر آئے گا سمجھے۔'' وہ زچ ہوئی تھی۔

''سمجھ گیا بابا سمجھ گیا...... اب پلیز کوئی اور بات کرو یا پھر مجھے کام کرنے دو۔'' اس نے کہہ کر سامنے رکھی فائل کھولنی چاہی کہ ربیکا فائل پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔

''دو دن کہاں غائب تھے؟''

''میری کزن کی شادی تھی۔''

''شہرینہ کی......!'' ربیکا کو یہ نام بھولتا نہیں تھا۔ جبکہ حمزہ کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔ جواب دینے کے بجائے دراز کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگا جس سے ربیکا یہ ہی سمجھی کہ وہ شہرینہ کی شادی سے دل برداشتہ ہو رہا ہے۔ جب ہی میٹنگ میں بھی ذہنی طور پر مفلوج نظر آ رہا تھا۔ کچھ بھی تھا وہ بہرحال اطمینان سے ہو گئی تھی۔ اور اسی اطمینان سے کرسی کی پشت سے کمر ٹکاتے ہوئے بولی۔

''تو تم شہرینہ کی شادی میں مصروف تھے۔'' حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا کر بولا۔

''شہرینہ کی بہن خزینہ کی شادی تھی۔''

PakiBooks.Site

''او......'' ربیکا کے ہونٹ سکڑ گئے۔ پھر انجان بننے کی سعی میں ناکام ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ اس کی کیفیت سے اندر ہی اندر محظوظ ہو کر کہنے لگا۔

''میرا خیال ہے مجھے نئے پروجیکٹ کی فائل پھر سے دیکھ لینی چاہیے۔ تاکہ اگلی میٹنگ میں اسٹیچو بن کر نہ بیٹھا رہوں۔''

''ہم......'' ربیکا ذرا سا سر ہلا کر اس کے روم سے نکل گئی تو شکر کی سانس کھینچتے ہوئے وہ باقاعدہ ہنسا تھا۔

☆☆☆

شدید گرمی اور حبس کے بعد اب موسم قدرے خوش گوار ہو گیا تھا۔ غالباً ہواؤں نے رخ بدل لیا تھا۔ اس نے حمیدہ بیگم کے کمرے میں جھانک کر دیکھا وہ نماز کے بعد تسبیح میں مصروف تھیں۔

''امی صحن میں آ جائیں۔ اچھی ہوا چل رہی ہے۔'' اس نے کہا تو حمیدہ بیگم نے یونہی سر ہلا دیا۔ وہ سمجھ گئی وظیفہ مکمل کر کے ہی کمرے سے نکلیں گی۔ اس لیے اس نے چائے کا بھی نہیں پوچھا اور اپنا سیل فون لے کر صحن میں آ بیٹھی۔ پہلے سوچا حمزہ کو کال کرے لیکن پھر خزینہ کا نمبر ملا دیا۔

''ایک منٹ شہرینہ! میں ابھی تمہیں کال کرتی ہوں۔'' خزینہ نے کال ریسیو کرتے ہی کہا اور لائن کاٹ دی۔

''شکر اپنا بیلنس بچ گیا۔'' وہ ہنسی پھر اس کی کال کا انتظار کرتے ہوئے آسمان پر رینگتے بادلوں کو دیکھنے لگی۔ شام بھی دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ اور وقت بھلا کہاں ٹھہرتا ہے۔ شاید زندگی ٹھہر جاتی ہے۔ وہ اسی فلسفے میں الجھنے لگی تھی کہ خزینہ کی کال آ گئی۔

''کہاں مصروف ہو؟'' اس نے کال لیتے ہی پوچھا۔

''کہیں نہیں بس غزنی جا رہے تھے تو میں انہیں سی آف کر رہی تھی۔'' خزینہ نے بتایا تو وہ بے ساختہ پوچھ گئی۔

''کہاں گئے ہیں غزنی بھائی؟''

''اپنے پیرنٹس کے پاس۔ اب کل دن میں ہی آئیں گے۔ خیر تم بتاؤ امی کیا کر رہی ہیں۔'' خزینہ نے اس کے مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر بات کا رخ موڑ دیا۔

''امی حسب معمول عصر کے بعد کا وظیفہ اور اب مغرب پڑھ کے ہی بات کریں گی، سچ خزی میں تو بہت بور ہو گئی ہوں۔ تم آ جاؤ ناں۔ ویسے بھی وہاں اکیلی ہو گی۔''

''نہیں میڈ آ گئی ہے۔ اچھی باتونی عورت ہے اور ہاں سنو میں کل سے ڈرائیونگ انسٹیٹیوٹ جوائن کر رہی ہوں۔'' خزینہ اب جیسے فرصت سے بات کر رہی تھی۔

''ویری گڈ!'' وہ خوش ہو کر بولی۔ ''پھر تو تم مجھے خوب گھماؤ پھراؤ گی۔''

''ہاں کبھی کبھی۔'' خزینہ نے قصداً بے نیازی برتی تو وہ چیخ کر بولی۔

''بڑی بے مروت ہو بلکہ اب ہو گئی ہو۔''

''نہیں میں شروع سے ایسی ہوں۔'' خزینہ محظوظ ہو رہی تھی۔

''اچھا مجھے نہیں پتا۔ میں تو شاید تمہیں جانتی ہی نہیں ہوں۔'' اس کے روٹھے انداز پر خزینہ زور سے ہنسی تھی۔

''ہاں ہاں ہنس لو۔ تمہارے ہنسنے کے دن ہیں۔'' ہنوز روٹھا انداز تھا۔

''کیا ہو گیا ہے شیری۔ اب میں تم سے مذاق بھی نہیں کر سکتی۔'' خزینہ اسے ٹوک کر کہنے لگی۔ ''لگتا ہے کچھ زیادہ بور ہو گئی ہو۔ اچھا ایسا کرو۔''

''سوری میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہے۔'' وہ فوراً بولی تھی۔

"تو کچھ پڑھ لو۔ میرے ریک پر اچھی اچھی کتابیں رکھی ہیں۔ جو تمہیں ضرور پڑھنی چاہئیں۔" خزینہ نے کہا تو وہ اکتا کر بولی۔

"اچھا دیکھوں گی۔"

"ٹھیک ہے امی سے کہنا میں ایک دو دن میں آؤں گی، خدا حافظ۔" خزینہ نے فون بند کر دیا تو وہ بھی اٹھ کر اندر آ گئی اور بلا ارادہ خزینہ کے ریک میں سجی کتابیں دیکھنے لگی۔ لیکن جلد ہی اکتا کر وہاں سے ہٹ گئی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے نماز پڑھ کر روٹی ڈالی پھر کھانا ٹرے میں رکھ کر حمیدہ بیگم کے کمرے میں لے آئی۔

"نماز پڑھی تم نے؟" حمیدہ بیگم نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"جی......!" وہ بیٹھی تو بتانے لگی۔ "خزینہ کا فون آیا تھا امی۔ کہہ رہی تھی ایک دو دن میں آئے گی۔"

"اکیلی تھی؟" حمیدہ بیگم کو یہی فکر ستاتی تھی۔

"نہیں بتا رہی تھی کل وقتی ملازمہ کا انتظام ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ رہے گی۔" حمیدہ بیگم بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

تیمور غنی نے خزینہ سے یہی کہا کہ وہ کام کے سلسلے میں دو تین دن کے لیے اسلام آباد جا رہا ہے جبکہ اسے سوات کا خان جانا تھا جہاں سارہ اس کی منتظر تھی لیکن جب وہ گھر آیا تو آگے سارہ اور سونیا آپی موجود تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر حیران ہوا۔

"آپ......؟"

"کیا کریں بچے بیمار ہو گئے تھے، اس لیے ہم نے آنے کی کی۔" سونیا نے کہا تو وہ سارہ کو دیکھ کر مسکرایا۔

"لگتا ہے تمہیں وہاں کی آب و ہوا راس آ گئی۔ چلو پھر چلتے ہیں بلکہ وہیں چل کر رہتے ہیں۔" سارہ اس کی شوخ نظروں سے بلش ہو کر اسے گھورنے لگی۔ تو سونیا ہنس کر بولی۔

"تمہیں بہت مس کر رہی تھی۔"

"میرا بھی یہی حال تھا اور میں آج سر کے بل وہاں پہنچنے والا تھا۔ خیر اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے۔" وہ پرسکون ہو گیا۔

"ہاں اب پلیز تم مجھے گھر چھوڑ آؤ بچے پریشان ہو رہے ہیں۔ گھر جا کر ہی سیٹ ہوں گے۔"

"کیوں آپ کے خان بہادر نہیں آئیں گے۔" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"نہیں دیر ہو جائے گی اور انہوں نے ہی کہا ہے میں تمہارے ساتھ گھر چلی جاؤں۔" سونیا کہہ کر بچوں کو پکارنے لگی تو وہ سارہ کو دیکھ کر بولا۔

"چلو چھوڑ آئیں آپی کو۔"

"سوری تیمی مجھے پہلے ہی سفر نے تھکا دیا ہے۔ تم جاؤ۔" سارہ نے معذرت کی تو سونیا فوراً بولی۔

"ہاں ہاں سارہ تم آرام کرو۔ تیمی بس ابھی مجھے چھوڑ کر آ جائے گا۔ چلو تیمی...... اچھا ماما میں پھر آؤں گی۔"

"ارے آپ تو ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہو گئیں۔" وہ سونیا کی عجلت دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا رہا؟" گاڑی مین روڈ پر آتے ہی سونیا نے پوچھا تو وہ نہ اس کی عجلت سمجھا تھا نہ اب سمجھا۔

"کیا رہا مطلب......؟"

"میں تمہاری شادی کا پوچھ رہی ہوں۔"

PakiBooks.Site

www.PakiBooks.site

"او......" وہ ہنسا۔ "یہ آپ گھر میں ہی پوچھ سکتی تھیں۔"

"ہاں دل تو میرا یہی چاہ رہا تھا لیکن مجھے تمہاری خیریت مطلوب تھی۔" سونیا نے کہا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"بس دعا کریں آگے بھی خیریت رہے۔"

"تم ابھی کا تو بتاؤ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔"

"نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوا اور میں سمجھتا ہوں آئندہ بھی مسئلہ نہیں ہوگا کیونکہ خزینہ بہت کوآپریٹو ہے۔" وہ خزینہ کو صرف عملی طور پر دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ دل کا معاملہ نہیں تھا۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ سچ تیمی اگر بابا اتنے اسٹرک نہ ہوتے تو میں ابھی تمہارے ساتھ چلتی۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں بابا زیادہ عرصے گھر کا سونا پن برداشت نہیں کر پائیں گے۔ ماما تو ابھی بھی محسوس کرتی ہیں لیکن بابا کی وجہ سے کچھ نہیں کہتیں۔" سونیا بولے جا رہی تھی اس کی آخری بات پر وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

"ماما نے کچھ کہا آپ سے......؟"

"نہیں میں نے خود انہیں احساس دلانے کی کوشش کی تھی تو پتا چلا وہ بھی بابا سے ڈرتی ہیں۔"

"چلیں اب تو......" وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گیا۔ پھر سونیا کو اس کے گھر چھوڑ کر وہ فوراً ہی واپس آ گیا تھا۔

سارہ شاور لے کر فریش ہو چکی تھی اور اس کے انتظار میں بیٹھی تھی اور اس کی وارفتگیاں اس کے لیے ہی تو تھیں۔ جانے کیسا نشہ تھا اس کی محبت میں کہ وہ ساری دنیا بھول جاتا تھا۔ ابھی بھی ایک پل کو بھی اس کا دھیان اس لڑکی کی طرف نہیں گیا جسے وہ کہہ آیا تھا کہ کام کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہا ہے اور گو کہ اب اسے کہیں نہیں جانا تھا اس کے باوجود اگلے تین دن وہ اس کی طرف گیا ہی نہیں۔ چوتھے دن آفس سے اس نے خزینہ کو فون کیا کہ وہ لنچ اس کے ساتھ کرے گا۔ اس کے بعد خود اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کر گیا ہے۔ یعنی اس دوران اس نے خزینہ سے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا تھا۔ تب وہ اس وقت آفس چھوڑ کر اس کے پاس چلا آیا۔

"ارے۔ آپ نے تو کہا تھا لنچ پر آئیں گے۔" خزینہ اسے دیکھ کر کھل گئی تھی۔

"تو کیا چلا جاؤں۔" وہ دروازے میں رک گیا۔

"کہاں جائیں گے؟" خزینہ اسے اسیر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ بڑے آرام سے بولا۔

"کہیں بھی۔"

"جی نہیں اب کہیں نہیں جانا اندر آئیں اور یہ بتائیں کہاں سے آ رہے ہیں؟" وہ دروازہ چھوڑ کر کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ابھی تو آفس سے آ رہا ہوں۔"

"اسلام آباد سے کب آئے؟"

"او گاڈ یعنی اب مجھے اپنے پل پل کی رپورٹ آپ کے حضور پیش کرنی ہوگی۔" وہ دہائی دیتا اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

"آر یو سیریس۔" اس نے خائف ہونے کی ایکٹنگ کی تو وہ ہنس پڑی۔

"تھینک گاڈ۔ اب بتاؤ تمہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"نہیں۔ بس وہ سامنے والی خاتون بار بار پوچھتی رہی کہ تمہارا میاں کب آئے گا۔" خزینہ نے بتایا تو وہ فوراً بولا۔

''اچھا میں جاتے ہوئے اس سے مل کر جاؤں گا۔''

''کیوں......؟''

''پوچھوں گا اسے مجھ سے کوئی کام ہے۔'' وہ بظاہر سنجیدہ تھا۔

''کوئی کام نہیں ہے بس لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ آپ کو زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بگڑ کر بول رہی تھی۔ پھر جب اس کے ہونٹوں میں دبی مسکراہٹ دیکھی تو سٹپٹا گئی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''میں بہر حال اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''کیا سمجھ گئے ہیں......؟''

''یہی کہ میری بیوی کو میرا کسی عورت سے بات کرنا پسند نہیں ہے۔ اور میں تمہیں بتا دوں کہ میرا دل صرف ایک عورت کی محبت میں دھڑکتا ہے۔ جو میری ہمسفر ہمنوا ہے۔'' وہ دیکھا اسے رہا تھا نظروں میں سارہ سمائی تھی اور وہ بے خبری میں ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

☆☆☆

حمزہ آفس سے نکلا تو آسمان پر گہرے بادلوں کو دیکھ کر اس کا دل خوش ہو گیا۔ ساتھ ہی شہرینہ کا خیال آیا تھا۔ کتنے دنوں سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور اب اس کا دل مچل گیا تھا۔ فوراً بائیک اسٹارٹ کر کے بھگانا چاہتا تھا کہ ایک دم بادل برس گئے۔ وہ رکا تو نہیں لیکن اسپیڈ کم کرنی پڑی۔ بہر حال موسم انجوائے کرتے ہوئے وہ شہرینہ کے گھر پہنچا تو آگے گیٹ پر بڑا سا تالا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ حیران ہوا کہ حمیدہ بیگم اور شہرینہ کہاں جا سکتی ہیں۔ ادھر ادھر دیکھا گلی میں کوئی نہیں تھا۔

اس نے بائیک چھجے کے نیچے لا کر جیب سے موبائل نکالا اور شہرینہ کو کال ملائی۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ اس نے دو تین بار ٹرائی کیا' جواب ندارد۔ تب انتہائی مایوس اور بددل سا ہو کر اس نے گھر کی راہ لی۔ تمام راستہ جتنے خوش کن خیالات میں گزرا تھا اب طبیعت اسی قدر بیزار ہو گئی تھی۔ شہرینہ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ اس نے کال ریسیو کیوں نہیں کی۔ دل ہی دل میں اس سے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو آگے وہ دشمن جاں صحن میں بیلا کے ساتھ بارش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اس کی آمد سے بے خبر دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گول گول گھوم رہی تھیں کہ اچانک شہرینہ کی اس پر نظر پڑی تو زوردار چیخ کے ساتھ اندر بھاگ گئی۔

بیلا بھائی کو دیکھ کر سمٹنے لگی تو وہ انجان بن کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ دل پر چھایا سارا غبار پل میں دھل گیا تھا۔ جلدی جلدی کپڑے بدل کر فاخرہ کے کمرے میں آیا تو وہاں حمیدہ بیگم کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ صبح ہی تو فاخرہ نے بتایا تھا۔ کہ حمیدہ بیگم کی عدت ختم ہو گئی ہے آج وہ یہاں آئیں گی۔

''السلام علیکم تائی جان۔'' اس نے سامنے آ کر سلام کیا۔

''خوش رہو آ گئے۔ بارش تو زوروں کی برس رہی ہے۔'' حمیدہ بیگم نے کہا تو وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''شکر ہے تائی جان۔ گرمی بھی تو زوروں کی پڑ رہی تھی۔''

''ہاں بس اللہ کرے بارش کے بعد حبس نہ ہو۔''

''نہیں ہو گا ان شاء اللہ۔ اماں کہاں ہیں؟''

''ابھی کچن میں گئی ہے شاید چائے بنا رہی ہے۔'' حمیدہ بیگم نے بتایا تو وہ انجان بن کر پوچھنے لگا۔

''کیوں بیلا کہاں ہے......؟''

''لڑکیاں تو بیٹا بارش دیکھ کر پاگل ہو گئی ہیں۔ میں نے کہا بھی فاخرہ سے ابھی چائے رہنے دو لیکن......''

PakiBooks.Site

''میں دیکھتا ہوں۔'' اصل میں تو اسے اس پاگل لڑکی کو دیکھنا تھا جو اسے دیکھتے ہی بھاگ کر جانے کہاں جا چھپی تھی۔

''آپ کیا کر رہی ہیں اماں۔'' اس نے کچن میں داخل ہوتے ہی پوچھا تو فاخرہ اسے دیکھ کر بولیں۔

''شکر بیٹا تم آ گئے۔ میں تو ہول رہی تھی۔''

''اچھا بس آپ اندر تائی جان کے پاس بیٹھیں۔ لڑکیاں چائے وائے بنا لیں گی اور ہاں باہر سے کچھ منگوانا ہے تو بتائیں میں فوراً لا دیتا ہوں۔'' اس نے کہا تو کچن میں آتے ہوئے بیلا بول پڑی۔

''ہاں ہاں بھائی لا دیں۔ پکوڑے، سموسے، چکن رول وغیرہ وغیرہ میں بس چائے بنا لیتی ہوں۔''

''ہائیں ہائیں۔'' فاخرہ روکتی رہ گئیں لیکن وہ عجلت میں نکل گیا تھا۔ اور چائے بننے تک جو جو بیلا نے کہا تھا اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لے کر آ گیا۔

مدتوں بعد اس گھر میں خوش گوار سی رونق اتری تھی۔ ماحول نے بھی کافی رنگ بدلے تھے۔ کبھی سینہ موضوع بنی کبھی خزینہ۔ آخر میں حیدر علی اور احمد علی کو یاد کرتے ہوئے دونوں خواتین آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ ادھر بادل جم کے برس رہے تھے۔ حمزہ نے دیکھا بیلا اور شہرینہ سر جھکائے افسردہ بیٹھی تھیں۔ گو کہ اس کا اپنا دل ابو اور تایا جان کے ذکر سے بھر آیا تھا لیکن لڑکیوں کا خیال کر کے ماحول بدلنے کی غرض سے ان دونوں کو مخاطب کر کے بولا تھا۔

''چلو لڑکیوں رات کے کھانے کی تیاری کرو اور کچھ اچھا سا بنانا۔''

''نہیں بیٹا! اب کھانے وانے کی گنجائش نہیں ہے۔ ابھی اتنا کچھ کھا لیا ہے۔'' حمیدہ بیگم نے لوازمات سے بھری ٹرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تائی جان، کھانا بننے تک سب ہضم ہو جائے گا، یہ نکمی لڑکیاں تین چار گھنٹے تو لگائیں گی کچن میں۔ چلو اٹھو۔'' اس نے بیلا کو اشارا کیا تو اس کے ساتھ شہرینہ بھی اٹھ کر چلی گئی۔ پھر وہ کچھ دیر بیٹھا اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔ کچن سے آتی شہرینہ کی آواز سن کر وہ ایک نئے احساس میں گھر گیا کہ آج رات تائی جان کے ساتھ وہ بھی یہیں قیام کرنے والی تھی۔ اس خیال نے اسے جانے کس جزیرے میں دھکیل دیا تھا جہاں ہر سو چاندی بکھری تھی۔ وہ اس منظر میں ڈوب رہا تھا کہ اچانک اس کے موبائل کی بزر نے سارا طلسم توڑ دیا۔

''شٹ۔'' وہ بادل ناخواستہ کمرے میں آیا اور موبائل اٹھا کر دیکھا، ربیکا کی کال تھی۔ برا سا منہ بناتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔

''لیس میم......''

''کہاں ہو حمزہ......؟'' ربیکا نے جتنی لگاوٹ سے پوچھا وہ اسی قدر بیزاری سے بولا تھا۔

''بڑی مشکل سے گھر پہنچا ہوں۔ آئی مین ابھی ابھی۔''

''او......'' وہ غالباً مایوس ہوئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے انجان بن کر ٹوکا۔

''کچھ نہیں میں نے اس لیے فون کیا تھا کہ اگر تمہیں گھر جانے میں پرابلم ہو رہی ہو تو میں تمہیں چھوڑ دیتی۔''

''تھینک یو ربیکا۔'' اس نے کہہ کر نہ صرف لائن کاٹی موبائل بھی پاور آف کر دیا تاکہ بعد میں کہہ سکے کہ بیٹری ڈاؤن ہو گئی تھی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ یہ کیا معاملہ تھا کہ دل جب من چاہی خوشی کو پوری شدت سے محسوس کرنا چاہتا تھا تو وہ لڑکی ربیکا اسے درمیان سے کھینچ لاتی تھی۔ وہ اگر حسان صاحب کے ساتھ ایگریمنٹ نہ کر چکا ہوتا تو اس وقت اسے بے نقط سناتا بلکہ اس کی کال ہی اٹینڈ نہ کرتا۔ بہر حال اس کے اچھے خاصے موڈ کا ستیاناس ہو گیا تھا کہ پھر موسم کی جولانیاں بھی اسے اپنی طرف نہیں کھینچ سکیں۔ منہ سر لپیٹ کر سو گیا تھا۔

www.PakiBooks.Site

رات دس بجے بیلا نے دسترخوان لگانے کے بعد اسے اٹھایا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ بے وقت کیسے سو گیا تھا۔ جب منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلا تب ساری بات یاد آتے ہی خود پر جھنجلانے لگا کہ خواہ مخواہ اس لڑکی کی وجہ سے اپنا موڈ خراب کیا اور اتنا خوب صورت وقت بھی دسترس سے نکل گیا۔ کھانے کے دوران وہ اپنے آپ سے روٹھا رہا۔ نہ ادھر ادھر دیکھا نہ کوئی بات کی۔ پھر بیلا سے چائے کا کہہ کر برآمدے میں آ بیٹھا۔

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ بس ہلکی کن من جاری تھی۔ ساتھ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مزے دے رہے تھے۔ وہ بادلوں کے ساتھ چاند کی آنکھ مچولی دیکھتے ہوئے پھر کسی جزیرے پر اترنے کو تھا کہ ساعتوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

"چائے لیجیے جناب۔" اس نے چونک کر دیکھا تو شہرینہ چائے کا مگ اسے تھما کر پوچھنے لگی۔

"کس کے خیالوں میں گم تھے؟"

"ہے ایک پری سچ مچ لگتا ہے جیسے آسمان سے اتر کر آئی ہو اور مزے کی بات یہ ہے کہ مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ حالانکہ میں اس سے ہاتھ جوڑ کر کہہ چکا ہوں کہ بی بی میں انگیج ہوں لیکن وہ مانتی ہی نہیں بضد ہے کہ میں اس کے ساتھ پرستان چلوں۔ سوچ رہا ہوں چلا ہی جاؤں۔" وہ مزے لے کر بولتے ہوئے بار بار کن انکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا جو باقاعدہ دانت پیس رہی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے جانا چاہیے مجھے۔" اس نے پوچھا تو وہ تڑخ کر بولی۔

"میرے ہاتھوں زندہ بچو گے تو جاؤ گے۔"

"ہاہاہا..... حمزہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

"پاگل ہو گئے ہو۔ امی ابھی سوئی ہیں۔"

"او....." اس نے فوراً ہونٹ بھینچے پھر آواز دبا کر بولا۔ "چلو میرے کمرے میں۔"

"اپنی پری کو لے جاؤ۔" وہ کہہ کر بھاگ گئی تو اس کے ردعمل پر وہ کتنی دیر محظوظ ہوتا رہا تھا۔

☆☆☆

رات بھر وقفے وقفے سے مینہ برستا رہا تھا۔ صبح آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں اکا دکا بادل اڑتے پھر رہے تھے۔ وہ چائے کا کپ لیے ٹیرس پر نکل آیا۔ کائنات دھل کر نکھر آئی تھی۔ پیڑ، پودے، پھول، کلیاں اس کی نظریں کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں رہی تھیں۔

"تیمی....." سارہ شاید اسے ڈھونڈ رہی تھی۔

"یہاں آجاؤ سارو۔" اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا پھر وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"واؤ....." سارہ اجلے ماحول میں آتے ہی کھل گئی۔ "کتنا اچھا لگ رہا ہے نا تیمی۔"

"ہم....."

"مری میں ایسا موسم نہیں تھا یا شاید تم ساتھ نہیں تھے جبھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔" سارہ بھی اظہار کے معاملے میں کنجوسی نہیں کرتی تھی۔

"یہ ہی بات ہے۔ نیکسٹ سیزن میں ہم ساتھ چلیں گے۔" اس نے سارہ کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"تب تو تیمی بچہ بھی ہمارے ساتھ ہو گا ناں۔"

"ان شاء اللہ....." اس نے بمشکل چائے کا گھونٹ حلق سے اتارا تھا۔

"مجھ سے اب صبر نہیں ہوتا تیمی۔ تم نے خواہ مخواہ زوبی کا بے بی لینے سے منع کیا۔" سارہ جب اس موضوع پر آتی تھی تو پھر اس کا دھیان بٹانا بہت مشکل ہوتا تھا۔



"میں نے خواہ مخواہ منع نہیں کیا تھا۔ زوبی کا بچہ لینے میں بہت پرابلم ہو سکتی تھی۔" وہ سنبھل کر بیٹھ گیا کہ اسے مطمئن کرنا تھا۔

"کیسی پرابلم......؟"

"پرابلم یہ ہوتی کہ زوبی تمہیں اپنا بے بی دے تو دیتی لیکن وہ اسے کبھی تمہارا نہ ہونے دیتی۔ آئی مین ہر دوسرے دن فون کرتی یا خود آ کر پوچھتی کہ بے بی کیسا ہے تم اسے کون سا ملک دیتی ہو کیسے نہلاتی کیسے سلاتی ہو۔ ایسے نہیں ایسے کیا کرو وغیرہ وغیرہ اور اس کی ایسی باتوں سے تمہیں بھی یہ ہی لگتا کہ بے بی تمہارا نہیں ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا کہ تم بھی تنگ آ کر کہتیں اپنا بے بی لے جاؤ۔ ہے ناں......؟" اس نے بہت طریقے سے اسے سمجھاتے ہوئے پوچھا۔

"تو کیا جو بے بی تم لاؤ گے اس کے پیرنٹس ایسا نہیں کریں گے۔" اس نئی بات نے سارہ کو قدرے پریشان کر دیا تھا۔

"نہیں میں نے سب طے کر لیا ہے۔ جو بچہ ہمارے پاس آئے گا وہ صرف ہمارا ہو گا۔" اس نے اتنے یقین سے کہا کہ سارہ خوش ہو کر بولی۔

"سچ تیمی۔" پھر پوچھنے لگی۔ "وہ دن کب آئے گا؟"

"آجائے گا لیکن دیکھو بچے میں مصروف ہو کر مجھ سے غافل مت ہو جانا۔ میں بالکل برداشت نہیں کر پاؤں گا۔" وہ اسے بہلا کر خوش ہو رہا تھا۔

"برداشت تو تمہیں کرنا پڑے گا۔ ویسے ہو گا کیا بیٹا یا بیٹی۔" سارہ اچانک متجسس ہوئی تھی۔

"تمہاری کیا خواہش ہے؟"

"اوں......" سارہ سوچ کر بولی۔ "جو بھی ہو بیٹا...... بیٹی۔"

"ہاں جو اللہ کو منظور ہو گا۔ چلو اب جلدی سے ناشتے کا کہو مجھے آفس بھی جانا ہے۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

گو کہ آفس جانے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ لیکن اب وہ اپنے موڈ پر نہیں چل سکتا تھا، کیونکہ آفس نہ جانے کا مطلب تھا پھر اسے سارا وقت گھر پر یا گھر سے باہر سارہ کو دینا پڑتا جبکہ خزینہ کے لیے وہ دن کا ایک وقت مقرر کر چکا تھا اور اس فکس وقت میں ڈنڈی مارنا اسے کسی طرح مناسب نہیں لگتا تھا۔ اس لیے نا چاہتے ہوئے بھی اسے آفس جانا پڑا اور روزانہ کی طرح اس نے پہلے ضروری کام نمٹائے اس میں بھی کافی وقت نکل گیا پھر باقی منیجر کے حوالے کر کے ٹھیک ایک بجے اپارٹمنٹ کا رخ کیا تھا۔

بادل ابھی بھی آسمان پر ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔ خزینہ لاؤنج میں گلاس ونڈو کے پاس کھڑی جانے کس سوچ میں گم تھی کہ ڈور بیل سنائی ہی نہیں دی۔ میڈ نجمہ جسے وہ نجمہ خالہ کہتی تھی نے دروازہ کھولا تھا اور جب تیمور غزنی نے قریب آ کر سلام کیا تب چونکنے کے ساتھ آپ ہی آپ اس کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے۔ تم ٹھیک تو ہو۔" تیمور غزنی نے انگلی سے بالوں کی لٹ اس کے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے پوچھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"بالکل ٹھیک ہوں جناب۔"

"اچھا کیا سوچ رہی تھیں؟" وہ جب داخل ہوا تھا تو اسے گہری سوچ میں دیکھا تھا۔

"سوچ رہی تھی اس کھڑکی سے ہوا کا گزر کیوں نہیں ہوتا۔" وہ واقعی یہی سوچ رہی تھی۔

"ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔" تیمور غزنی نے کھڑکی کے قریب ہو کر آگے بالکونی میں پھر اس سے آگے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اس کے بعد اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ "اصل میں یہ ہوا کے رخ پر نہیں ہے۔ اگر تمہیں پرابلم ہوتی ہے تو اپارٹمنٹ چینج کر لیتے ہیں۔"

"ارے۔" وہ ہنسی۔ "آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے یہ بہت آسان ہو۔"

”مشکل بھی نہیں ہے۔“

”پھر بھی نہیں۔ میں انتظار کرلوں گی کبھی تو ہوائیں رخ بدلیں گی۔“ وہ ترنگ میں کہتی وہاں سے ہٹ گئی تو وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”تم نے بتایا تھا آنٹی اور شہرینہ آئیں گی۔ آئیں نہیں؟“

”ہاں کل تو وہ چچا جان کے ہاں تھیں اب دیکھیں یہاں کب آتی ہیں۔ میرا خیال ہے حمزہ کے ساتھ ہی آئیں گی کیونکہ گھر تو اسی نے دیکھا ہے۔“

”ہمم تم اسپیشلی انہیں انوائٹ کرلو ناں۔“ اس نے کہا تب ہی نجمہ خالہ نے گھنٹی بجا کر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ تو دونوں ڈائننگ پر آگئے۔

”تمہاری ڈرائیونگ کہاں تک پہنچی۔“ غزنی نے اچانک خیال آنے پر پوچھا۔

”بس اب پریکٹس کی ضرورت ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اب تمہارے لیے گاڑی آجانی چاہیے۔ کون سی گاڑی لوگی؟“ وہ کھانے سے ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔

میں نے پہلے آپ سے کسی چیز کی فرمائش کی ہے جواب کروں گی۔“ اس نے جتایا نہیں تھا سیدھے سادے انداز میں بولی تھی۔ تیمور غزنی کندھے اچکا کر کھانے میں مصروف ہوگیا۔ تو قدرے رک کر وہ پوچھنے لگی۔

”ماما اور بابا کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔“ وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ گیا۔ گویا ماما پاپا سے متعلق اور کوئی بات نہیں ہوگی اور اسے ابھی کوئی اور بات کرنی بھی نہیں تھی لیکن اس کا دامن بچانا محسوس کرتی تھی۔



حمیدہ بیگم پہلی بار خزینہ کے گھر جارہی تھیں تو انہیں خالی ہاتھ تو نہیں جانا تھا۔ گو کہ وہ جانتی تھیں اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی پھر شہرینہ بھی بار بار ٹوک رہی تھی یہاں تک کہہ دیا کہ ان کی چیزوں کی خزینہ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوگی اس کے باوجود وہ دو بڑے شاپر بھر کے لے گئیں۔ ساتھ مٹھائی کا بڑا ڈبا بھی تھا اور گھر پر تو انہوں نے بعد میں نظر ڈالی کتنی دیر خزینہ کو سینے سے لگائے رکھا تھا۔

”اف امی آپ تو ایسے کررہی ہیں جیسے برسوں کی بچھڑی بیٹی سے مل رہی ہوں۔ ابھی پرسوں ہی تو آئی تھی خزینہ۔“ شہرینہ کا بولنا انہیں سخت ناگوار گزرا۔

”تم چپ رہو بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری، گھر میں بھی بک بک کیے جارہی تھی۔“

”جانے دیں امی ابھی نادان ہے۔ آیئے آپ یہیں بیٹھیں۔“ خزینہ نے آنکھوں سے شہرینہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے حمیدہ بیگم کو بٹھایا اور ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے شاپرز پر نظر پڑی تو اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”اس میں کیا ہے امی......؟“ شہرینہ نے بمشکل اپنی ہنسی روکی لیکن پھر حیران رہ گئی جب دیکھا خزینہ بہت شوق سے ایک ایک چیز نکال کر یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کے لیے اس سے اچھا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بنارسی ساڑھی۔ دو فینسی سوٹ ساتھ میچنگ جیولری کے اور ایک سونے کا سیٹ۔

”یہ آپ نے بنوایا ہے امی۔“ خزینہ سونے کا سیٹ دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

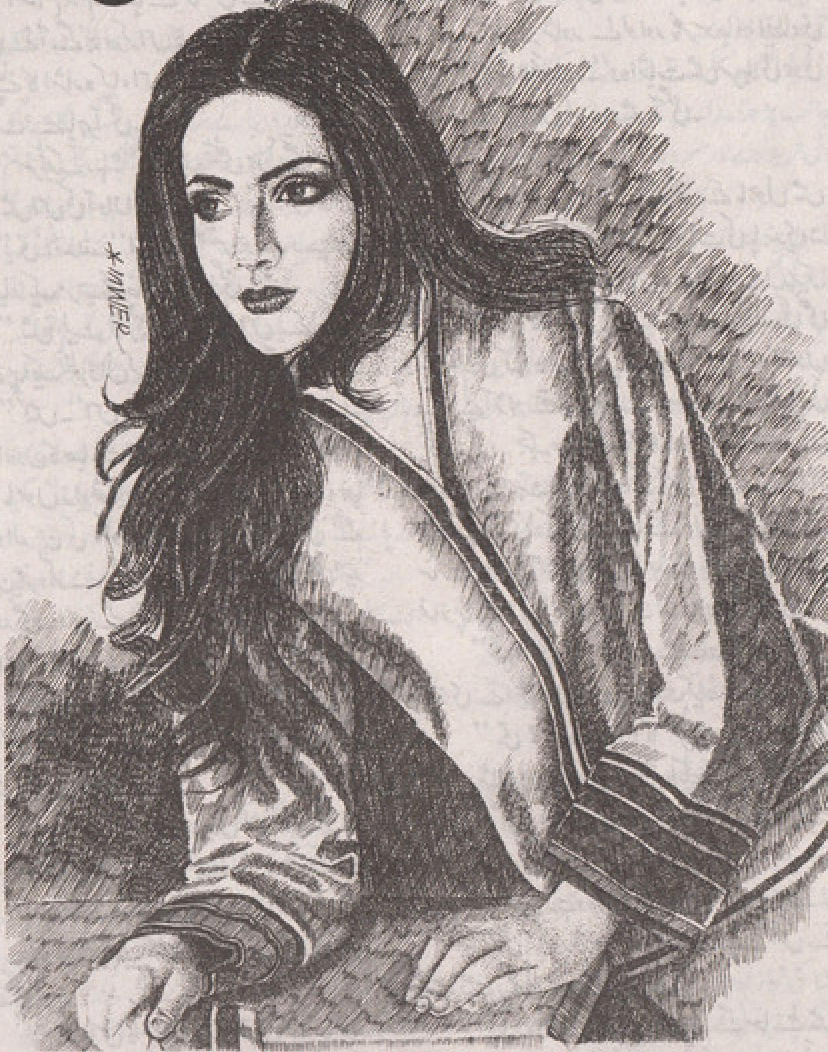
”یہ تمہارے ابو بنوا گئے تھے۔ بیٹا تمہارے لیے۔“ حمیدہ بیگم نے بتایا تو بے اختیار سیٹ چومتے ہوئے خزینہ کی آنکھیں چھلک گئی تھیں۔

☆☆

(باقی ان شاءاللہ آئندہ شمارے میں)

بشریٰ سیال

تُو مری عید کا چاند



ایئرپورٹ پر کھڑے ہوئے اسے دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اس کی نظر سامنے سے آتے شارون پر پڑی۔ ایک ہاتھ اپنے قریب رکھے ہینڈ کیری پر جمائے، دوسرا ہاتھ شانے پر لٹکائے بیگ پر وہ متلاشی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو!'' شارون اس کے قریب آ کر دوستانہ انداز سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''السلام علیکم!'' صبا نے شائستگی سے سلام کیا۔ شارون نے آگے بڑھ کر اس کا ہینڈ کیری لے لیا، اور اسے چلنے کا اشارہ کیا، اس کے ہمراہ چلتی ہوئی وہ ایئرپورٹ سے باہر آ گئی۔

''سفر ٹھیک رہا؟'' وہ سنجیدہ بیٹھی ہوئی تھی جب گاڑی میں اس کی آواز ابھری۔

''جی الحمدللہ۔'' اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا، ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی۔

''میں لیٹ تو نہیں ہوا؟'' اس کے دلکش سراپے پر ایک نظر ڈال کر وہ ایک مرتبہ پھر گویا ہوا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ دو ماہ پہلے شارون کا صبا سے اس کی پسند پر نکاح ہوا تھا۔ وہ اس کا ماموں زاد تھا اور اسے بے حد چاہتا تھا، صبا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی آج کل اس کے والدین عمرہ کرنے گئے ہوئے تھے ان کی واپسی عید کے بعد تھی۔ اسی لیے انہوں نے صبا کو ماموں کے پاس لاہور سے کراچی بھیج دیا تھا۔

''تم نے سفر کی وجہ سے روزہ تو نہیں رکھا ہوگا؟'' اچانک اس نے سوال کیا صبا نے ناسمجھی کے عالم میں اس کی جانب دیکھا۔

''میں نے سفر کون سا پیدل کرنا تھا۔ بڑے آرام اور سکون کے ساتھ جہاز میں بیٹھ کر آئی ہوں۔'' اسے صبا سے ایسے ہی جواب کی امید تھی اس کی بات پر وہ زیرِ لب مسکرا دیا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

گھر میں اس کا پرتپاک استقبال کیا گیا تھا۔ ممانی نے پیار سے اسے ساتھ لگایا، شارون کی دونوں بہنیں دیبا اور ریبا مارے خوشی کے اس سے لپٹ گئی تھیں۔ سب بہت خوش تھے کہ اس مرتبہ صبا ان کے ساتھ عید منائے گی۔

''صبا بیٹا روزہ رکھا ہے؟'' ممانی نے استفسار کیا۔

''جی ممانی۔'' اس نے بتایا۔

''رہنے دیتیں سفر کرنا تھا۔'' انہوں نے بھی شارون کی طرح کہا اس نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ ''چلو خیر شاور لے لو اور پھر سو جاؤ، افطاری میں ابھی کافی ٹائم ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی دیبا کی رہنمائی میں کمرے میں آ گئی۔

☆☆☆

اجمل ماموں اور اس کے گھر کے ماحول میں کافی فرق تھا، ان کے گھر میں کسی بات کی پابندی نہ تھی۔ شروع سے ہی ماموں نے بیوی اور بچوں پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی تھی۔ نہ ہی روک ٹوک کی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ سب اپنے اپنے فیصلوں اور کاموں کے لیے آزاد تھے۔ مذہب کے معاملے میں بھی کوئی سختی نہ تھی۔ جبکہ صبا کے گھر کا ماحول ایسا نہ تھا۔ وہ والدین کی بہت لاڈلی تھی، مگر بچپن میں جب وہ نماز کے لیے سستی دکھاتی تو ماما اسے ڈانٹتی تھیں۔ اسے سات سال کی عمر میں ہی صبح جلدی جگا دیتیں تاکہ وہ نماز پڑھے اس کی عادت اب تک پختہ ہو گئی تھی۔



''صبا آ گئی؟'' میٹنگ سے فارغ ہو کر اجمل نیازی نے اشاروں سے دریافت کیا۔

''جی!'' وہ دونوں کانفرنس روم سے باہر نکلے۔ شارون کے چہرے پر ایک عجیب سی روشنی پھیل گئی تھی۔ صبا کے ذکر پر ہی دل میں پھول کھلنے لگے تھے۔

''ٹھیک ہے وہ؟'' انہوں نے مزید پوچھا۔

''جی! مگر روزہ رکھے ہوئے ہے۔'' اس نے بتایا جیسے یہ کوئی بہت بڑی خبر ہو۔

''مائرہ اور اس کا شوہر مذہب کے معاملے میں بہت انتہا پسند ہیں۔'' انہوں نے بہن اور بہنوئی پر تنقید کی۔ ''اور یہی انتہا پسندی صبا میں بھی ہے۔ مشکل ہوگا اسے ہمارے گھر ایڈجسٹ کرنا۔'' انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

''میں کروا لوں گا اسے ایڈجسٹ۔'' اس نے باپ کی بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔

''ڈیڈ! میں اب گھر جاؤں گا۔'' اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تمہارا جانا بنتا بھی ہے۔'' وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولے۔

''ڈیڈ!'' وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر کی جانب بڑھا۔ راستے میں سے اس نے صبا کے لیے پھول خریدے اور مسرور سا گھر کی جانب بڑھا۔

☆☆☆

ماموں سے اس کی ملاقات افطاری سے کچھ دیر پہلے ہوئی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت سے ملے تھے۔ صبا نے ایک نظر میز پر ڈالی تھی۔ جو انواع واقسام کے کھانوں اور مشروبات سے سجی ہوئی تھی۔ مگر اسے یہ جان کر ازحد حیرت ہوئی تھی کہ ان میں سے ممانی کے علاوہ کسی کا روزہ نہ تھا۔

''شارون نے آفس جانا ہوتا ہے نہ، تو اس لیے میں اسے روزہ نہیں رکھنے دیتی۔'' شارون نے کھجور اٹھا کر منہ میں رکھی تو ممانی نے صبا کی حیران نظریں پڑھتے ہوئے کہا۔

''ریبا! چند منٹ صبر نہیں ہوتا تم سے۔'' اگلے ہی پل ریبا نے پکوڑا اٹھا کر منہ میں رکھا تو ممانی نے اسے گھرکا۔

''ان پکوڑوں کی خوشبو مجھے کمرے سے یہاں کھینچ کر لائی ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔ اگلے دو منٹ میں صبا پر انکشاف ہوا کہ دیبا نے بھی روزہ نہیں رکھا۔ دور سے سائرن کی آواز آ رہی تھی۔

☆☆☆

عشا کی نماز اور تراویح سے فارغ ہو کر وہ ریبا اور دیبا کے پاس آئی تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔ ریبا کانوں میں ہینڈ فری لگائے انگلش گانے سن رہی تھی۔ جبکہ دیبا ٹی وی پر کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔

''آؤ صبا!'' اسے دیکھ کر ریبا دوستانہ انداز میں مسکرائی تھی۔

''میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ باہر نکل گئی۔ وہ لاؤنج میں آ بیٹھی تھی اسی پل ماما کی کال آ گئی تھی۔

''السلام علیکم ماما!'' اس نے سلام کیا تھا۔

''کیسا ہے میرا بیٹا؟'' وہ محبت سے گویا ہوئیں۔

''آپ کو بہت مس کر رہی ہوں ماما!'' وہ اداسی سے بھرپور لہجے میں بولی تھی۔

''ریبا اور دیبا کے ساتھ گپ شپ لگاؤ، اگر شارون کے ساتھ کہیں جانا ہو تو، بلاجھجک چلی جانا، تم دونوں کا نکاح ہو چکا ہے۔ شوہر ہے وہ تمہارا۔'' انہوں نے رسانیت سے سمجھاتے ہوئے۔ اسے گویا اجازت دی۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے موبائل آف کر دیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، ابھی وہ اس کشمکش و پیچ میں مبتلا کہ شارون وہاں چلا آیا۔

''ہیلو مسز!'' شوخ انداز سے کہتے ہوئے وہ بے تکلفی سے اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟'' وہ بشاش لہجے میں بولا۔

''میں آپ کی مسز نہیں ہوں۔'' وہ برا مانتے ہوئے بولی۔

''ہاہا!'' اس نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ ''اچھا!'' وہ دلچسپ نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ ''مگر میری نالج کے مطابق آپ میرے نکاح میں ہیں۔'' اس نے گویا باور کروایا۔

''میں آپ کی منکوحہ ہوں۔ مسز نہیں۔'' وہ نامحسوس انداز میں تھوڑا سا دور کھسک گئی، شارون ہنس دیا۔

''اطلاعاً عرض ہے کہ منکوحہ کو بیوی ہی کہتے ہیں۔'' وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر اندر کی جانب بڑھی۔

"رکو!" شارون نے اس کا راستہ روکا۔ "مجھے چائے پینی ہے۔ ملازمہ سوگئی ہے۔ تم پلیز مجھے چائے بنا دو۔" وہ صرف اس سے بات کرنے کے لیے اسے نظروں کے سامنے رکھنے کے لیے چائے کا بہانہ بنا رہا تھا اور وہ کوئی نادان بچی نہ تھی۔ سب سمجھ رہی تھی لیکن انکار کرنا اسے مناسب نہیں لگا، سو خاموشی سے کچن میں آگئی۔

"تمہاری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟" وہ اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔

"بہت اچھی" صبا نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا۔

"یہ کلر تم پر بہت سوٹ کرتا ہے۔" شارون نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس نے اسکائی بلیو کلر کا لان کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ جس میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی۔

"تھینک یو!" اس نے دھیرے سے کہا۔ وہ اس کے پاس کھڑا مسلسل باتیں بنا رہا تھا کبھی اسے اپنے آفس کے قصے سناتا اور کبھی دوستوں کے اور وہ غیر دلچسپی سے سنتی رہی۔

"یہ لیں چائے۔" اس نے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے کپ اس کی جانب بڑھایا۔

"تم نہیں پیو گی؟" وہ سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اب سونا ہے۔" وہ باہر کی جانب بڑھی، شارون بھی اس کے ساتھ کچن سے باہر نکلا تھا۔

"کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ" وہ اصرار کرنے لگا۔

"شارون اگر میں اب دیر سے سوئی تو صبح آنکھ کھلنی مشکل ہو جائے گی۔ اس لیے پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔" اس نے سہولت سے انکار کیا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اپنی معمول کی تسبیحات سے فارغ ہو کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆☆☆

ریبا اور ردیبا نے جمعہ کے دن روزہ رکھا اور پورا دن اے سی آن کر کے سوتی رہیں۔ نہ ہی کوئی نماز پڑھی نہ قرآن پاک کو ہاتھ لگایا۔ شام کو دونوں اٹھیں اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئیں۔

"بھئی صبا تمہاری ہمت ہے جو سارے روزے رکھ رہی ہو۔ میری تو ایک سے ہی بس ہوگئی ہے۔" وہ ان دونوں کے پاس آئی تو ریبا بال سمیٹتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

"ہمت تو کرنی پڑتی ہے۔ جب ہمیں پتا ہے کہ روزہ فرض ہے تو" اس نے خوب صورتی سے اپنا موقف بیان کیا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک پاکیزگی اور وقار جھلکتا تھا۔ اسی نے تو شارون کو اس کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ روزہ رکھنے اور عبادت کی وجہ سے اس کے چہرے پر ایک انوکھا سا نور پیدا ہو گیا تھا۔

"میں تو اب کوئی روزہ نہیں رکھنے والی۔ اتنی سخت گرمی ہے۔ پیاس سے برا حال ہو رہا ہے۔" وہ دونوں اے سی میں بیٹھی نا جانے کون سی گرمی محسوس کر رہی تھیں۔ صبا کی سمجھ سے باہر تھی یہ بات۔

"صبا تم نے عید کے لیے ڈریس بنا لیا؟" ریبا نے بات کو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ماما ہمیشہ رمضان شریف شروع ہونے سے پہلے عید کی ساری شاپنگ کر لیتی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"ہم لوگوں نے تو ابھی شاپنگ کرنی ہے۔ کچھ بھی نہیں خریدا۔"

دونوں شاپنگ کے حوالے سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ افطار کے وقت شارون ان دونوں کو خوب چھیڑ رہا تھا۔

"اتنے اتنے منہ نکلے ہوئے ہیں دونوں کے" وہ مذاق اڑانے کے انداز میں بولا۔ "کتنے روزے رکھے دونوں نے؟" وہ ہنسا۔

"چلو ہم نے تو ایک روزہ رکھ لیا۔ آپ نے تو ایک بھی نہیں رکھا۔" ریبا نے فوراً بدلہ لیا۔

"مجھے تو معاف ہی رکھو، آفس جانا ہوتا ہے

بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔" شارون نے ایک نظر خاموش بیٹھی صبا کے سنجیدہ چہرے پر ڈالی۔

"صبا! افطاری کے بعد تیار رہنا تم کو شاپنگ کے لیے لے کر جاؤں گا۔" اس کی جانب جھکا وہ آہستگی سے بولا۔

"مگر مجھے تو کچھ نہیں چاہیے۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔" اس نے سہولت سے انکار کیا۔

"کیا تم مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟" اس نے الجھن آمیز نگاہوں سے صبا کی جانب دیکھا۔

"میں کیوں ناراض ہونے لگی آپ سے؟" اس نے الٹا سوال کر ڈالا۔

"پھر اتنی سنجیدہ کیوں ہو، بات کیوں نہیں کرتی مجھ سے؟" اس نے دل کی بات کہہ دی۔

"میں ماما اور پاپا کی وجہ سے اداس ہوں۔" اس کی بات پر وہ ہنس دیا۔

"اور جب تم ہمیشہ کے لیے یہاں آجاؤ گی پھر کیا بنے گا تمہارا۔" وہ اس کی بات ان سنی کر کے باہر نکل گئی تھی۔ سر جھٹک کر شارون اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

ریبا اور ردیبا شاپنگ پر گئی ہوئی تھیں۔ صبا کو بھی ساتھ جانے کے لیے کہا تھا۔ مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ وہ دونوں افطاری سے کچھ دیر قبل گھر پہنچی تھیں۔ شاپنگ بیگز سے لدی پھندی، صبا نے متاسف نظروں سے انہیں دیکھا۔

وہ نماز اور قرآن پاک سے فارغ ہو کر لیٹی تھی کہ شارون بنا دستک دیے اس کے کمرے میں چلا آیا۔

"ہیلو صبا!" وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات واضح تھے۔

"یار! تم دو کپ چائے بنا کر میرے کمرے میں لا سکتی ہو۔" اس نے لائٹ آن کی۔

"اوکے! میں لاتی ہوں" وہ باہر کی جانب بڑھی، شارون اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس نے ایک کپ چائے بنائی اور وہ دینے اس کے کمرے کی جانب بڑھی۔

"یس! کم آن" اس کی دستک کے جواب میں شارون کی آواز ابھری وہ اندر داخل ہوگئی سامنے وہ بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹی وی کا ریموٹ تھا۔ وہ شاید کوئی مووی دیکھ رہا تھا۔

کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ پلٹنے لگی جب شارون نے اسے پکارا۔

"صبا! تم اپنے لیے چائے نہیں لائی۔" اس نے کپ اٹھا لیا۔

"میں اس ٹائم چائے نہیں پیتی۔" اس نے جواب دیا۔

"آج میرے کہنے پر پی لیتیں۔" اس نے خاموشی کو ہی بہتر سمجھا۔

"کچھ دیر بیٹھ جاؤ میرے ساتھ" اس نے اپنے پہلو میں اس کے لیے جگہ بنائی۔

"نہیں مجھے سونا ہے۔" وہ جانے لگی۔ شارون نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"صبا بہت اچھی مووی لگی ہوئی ہے۔" وہ اسے روکنے لگا۔ "بیٹھ جاؤ مل کر مووی دیکھتے ہیں۔" اس نے مزید کہا۔

"مجھے نہیں دیکھنی۔" وہ اس کی جانب دیکھے بنا پلٹ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ماما! آپ لوگ کب واپس آئیں گے۔ میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔" وہ روتے ہوئے ان سے فون پر بات کر رہی تھی۔

"کیا ہوا بچے؟" وہ گھبرا اٹھیں۔

"آپ نے اور پاپا نے میری زندگی کا فیصلہ جلد بازی میں کر دیا۔ ایک ایسے شخص کو میرا لائف پارٹنر بنا دیا۔ جسے مذہب کی الف ب بھی نہیں پتا۔ جو روزہ رکھتا ہے نہ نماز پڑھتا ہے۔ قرآن پاک کو بھی شاید کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ رمضان شریف کی مبارک راتوں میں موویز دیکھتا ہے اور مجھے بھی دیکھنے کی

PakiBooks.Site

www.PakiBooks.site

دعوت دیتا ہے۔" دروازے کے باہر کھڑے شارون کے قدم منجمد ہوگئے تھے۔ اس کا وجود شرم سے پانی پانی ہورہا تھا۔ وہ اب صبا کی خاموشی اور ناراضی کی وجہ سمجھا تھا۔ وہ وہاں سے واپس پلٹ گیا تھا۔

"ماما میں کیسے ایک شخص کے ساتھ زندگی گزاروں گی۔ آپ نے میری تربیت ایسی نہیں کی۔ مجھے اچھائی اور برائی میں فرق کرنا سکھایا ہے۔ میرا دل اس ماحول میں یہاں کے مکینوں کے اطوار دیکھ کر سخت اچاٹ ہوچکا ہے۔ میں کیسے یہاں ان کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزاروں گی؟" شارون کے قدم لحظ بھر کو رکے تھے۔ دوسری جانب اس کی ماما کیا کہہ رہی تھیں۔ اسے معلوم نہ تھا۔ مگر صبا کی باتوں سے اس کے دل کی حالت عجیب ہونے لگی تھی۔

"ممانی اپنے بچوں کو روزہ نہیں رکھنے دیتی ہیں کہ گرمی بہت ہے۔ کیسی ماں ہیں۔ اپنے بچوں کو خود نیکی سے روکتی ہیں اور کیا انہیں اپنے بچوں سے اللہ سے زیادہ پیار ہے۔ ان کی اللہ سے زیادہ فکر ہے۔" وہ واپس پلٹا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ ٹی وی پر اس وقت گانا چل رہا تھا اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کردیا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز جب صبا سحری کھا رہی تھی تو شارون بھی وہاں آگیا۔ صبا نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرے لیے بھی سحری بنادیں۔" اس نے ملازمہ کو مخاطب کیا۔ صبا کو اچنبھا ہو، یہ اچانک اسے کیا ہوگیا۔

صبا کو خوش گوار حیرت نے گھیر لیا تھا۔ ابھی کل تک تو وہ ریا اور دیا کا مذاق اڑا رہا تھا۔ پھر اچانک اس کایا پلٹ کی وجہ سے اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس نے صبا سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سحری کھا کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وضو کرکے وہ نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوتو دل بھرانے لگا۔ نماز پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو دل بھرانے لگا۔

"یااللہ! میں جو ایک لڑکی کے معیار پر پورا نہ اتر سکا میں روز حشر تیرا سامنا کیسے کروں گا۔" اس کی حالت ایسے بچے جیسی تھی جو اچانک میلے میں اپنی ماں سے بچھڑ جاتا ہے اور بے حد خوف زدہ ہوتا ہے کہ دفعتاً اسے ماں دکھائی دے جاتی ہے۔

صبح جب ماما کو پتا چلا کہ اس نے روزہ رکھا ہے، تو وہ ازحد پریشان ہوئیں۔

"شارون! آفس میں اتنا تھک جاتے ہو۔ کیا ضرورت تھی روزہ رکھنے کی۔ پھر گرمی بھی بہت ہے۔" وہ فکرمندی سے گویا ہوئیں لاؤنج میں بیٹھی صبا ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"آپ مجھے اللہ سے زیادہ پیار نہیں کرتیں۔" اس کی بات پر صبا نے چونکتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا۔ "کچھ بھی نہیں ہوگا مجھے آپ بے فکر رہیں۔" وہ چلا گیا تھا۔

"اسے کیا ہوا؟ وہ متعجب تھیں۔

"صبا بیٹی کی کمپنی کا اثر تو نہیں۔" ماموں نے لطیف سا طنز کیا۔

"صبا تو اس سے زیادہ بات ہی نہیں کرتی۔ پھر کل شام تو یہ خود ریا اور دیا کا مذاق اڑا رہا تھا۔ پھر ایک ہی رات میں کیا ہوگیا اسے" وہ پریشان تھیں مگر صبا دل ہی دل میں خوش تھی۔

☆☆☆

اس نے صبا کو مخاطب کرنا، اسے چائے بنانے کا کہنا، شاپنگ پر لے جانے کی بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر صبا اس بات پر بہت خوش تھی کہ ممانی کے منع کرنے کے باوجود وہ تمام روزے رکھ رہا تھا اور نمازیں بھی باقاعدگی سے پڑھ رہا تھا۔ آج انتیسواں روزہ تھا۔ تمام لوگ انتظار میں تھے کہ پتا چلے عید کا چاند نظر آیا یا نہیں۔ صبا دو کپ چائے بنا کر شارون کے کمرے میں لے آئی تھی۔ وہ شاید ابھی نماز سے فارغ ہوا تھا۔ سر پر ٹوپی پہن رکھی تھی۔

"یہ میں آپ کے لیے چائے لائی ہوں۔" اس نے شارون کے سنجیدہ چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ اس نے خاموشی سے کپ اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" اس کی مسلسل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے وہ استفسار کرنے لگی۔

"نہیں!" اس نے ناسمجھی کے عالم میں صبا کی جانب دیکھا۔

"میں کیوں خفا ہوں گا۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"تو پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے۔ چائے کا کیوں نہیں کہتے؟" اس کی بات پر وہ مبہم سا مسکرایا تھا۔

"میں تم سے نظریں نہیں ملا پا رہا صبا" وہ کپ کے کناروں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہوں صبا۔" اور صبا کو یقین ہوگیا کہ اس روز اس نے اسے ماما سے فون پر بات کرتے سن لیا تھا۔

"شارون آئے ایم سوری، میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہ تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ......"

"نہیں صبا۔" وہ اسے ٹوک گیا۔ "تم نے تو کچھ بھی غلط نہیں کہا۔ تم نے مجھے آئینہ دکھادیا۔ جس میں مجھے اپنا انتہائی بدصورت چہرہ دکھائی دیا۔ صبا! ماما اور پاپا نے ہمیں کبھی وہ ماحول دیا ہی نہیں جو ایک مسلمان بچے کو ملنا چاہیے۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے ہم مسلمان تو بن گئے۔ مگر اسلام سے اتنے ہی دور رہے جتنے کہ ہمارے والدین...... کسی بھی بچے کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوگی جب کہ اس کے والدین اسے نماز کی عادت نہ ڈالیں۔ روزہ نہ رکھنے دیں، میں بہت ہرٹ ہوا ہوں صبا، ہمارے والدین نے ہمیں دنیا کی آسائشوں اور سہولتوں کا اتنا عادی بنادیا ہے اور آخرت کی کوئی فکر نہیں۔" صبا لب سیے خاموش بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

اس میں زیادہ قصور میری ماں کا ہے۔ ایک اچھی اور نیک بیوی اپنے شوہر اور بچوں کو ایسے ہی بدل لیتی ہے جیسے تمہاری چند دنوں کی رفاقت بلکہ یہاں موجودگی نے مجھے بدلا ہے۔ تمہارے یہاں آنے کے بعد میں نے اللہ کو پہچانا ہے۔ میں نے اسے سوچا ہے اور مجھے یقین ہے صبا جب تم ماں بنوگی تو تم اپنے بچوں کی مثالی تربیت کروگی۔" اس کی بات پر جھینپتے وہاں سے اٹھی تھی۔

"تم سے ریکویسٹ ہے صبا، میں بہت بگڑا ہوا ہوں مجھے سنوارنے کی کوشش کرنا۔" وہ جاتے جاتے پلٹی تھی۔

"آپ بہت اچھے ہیں۔" وہ کہہ کر رکی نہیں۔ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کا رخ چھت کی جانب تھا۔ وہ نظریں آسمان پر لگائے ہاتھ دعا کے انداز میں پھیلائے کھڑی تھی۔

"مبارک ہو صبا! عید کا چاند نظر آگیا" اس کے عقب میں شارون کی آواز بلند ہوئی تھی۔

"کہاں؟" اس نے متلاشی نگاہوں سے آسمان کی جانب دیکھا۔

"یہ میرے سامنے" وہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"شارون!" وہ اس کی شرارت کو بھانپتے ہوئے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"میری زندگی کی عید کا چاند تو تم ہی ہو۔" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا تو صبا کو ڈھیروں طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ اس کی باتیں اب اسے اچھی لگنے لگی تھیں۔ وہ یہاں آکر جتنی مایوس تھی اب آنے والے وقت کے لیے اتنی ہی پرامید تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے شارون کی جانب دیکھا اور قدم نیچے کی جانب بڑھادیے۔ کیونکہ اسے اس کے ساتھ چوڑیاں اور مہندی لینے بازار جانا تھا۔

☆☆

PakiBooks.Site

سدرہ حیات

ہم بھی وہی تم بھی وہی

خوش گوار موڈ میں گنگناتی ہوئی وہ صحن میں لگے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ روز ناشتے کے بعد اس کا یہ ہی معمول تھا۔

''آپی، آپی'' آنیہ کو بھاگ کر قریب آتے دیکھ کر وہ مڑی، منتظر نظریں سانس بحال کرتی آنیہ پر تھیں۔

''بھابھی کا مزاج سخت برہم ہے۔ ان کے کمرے سے زور زور سے الماری کھولنے بند کرنے کی آوازیں آرہی ہیں۔''

''اچھا، ہوسکتا ہے بھائی سے کوئی ناراضی ہوگئی ہو۔'' امل نے خیال آرائی کی۔

''اور ہم نے جو بازار جانے کا پلان بنایا تھا وہ کہیں کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔'' آنیہ کو فکر ستائی، اس نے اپنی کچھ چیزیں لینی تھیں۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ آج بازار جانا ویسے بھی ضروری ہے کل سے رمضان شروع ہے اور ہم نے کوئی خریداری نہیں کی۔ امی تو یوں بھی گھر پر نہیں ہیں اور جب تک خالہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوجاتی ان کی واپسی نہیں ہونے والی۔'' امل کے پریقین لہجے پر آنیہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر گھنٹے بعد زونیرا نے خود ہی ان سے بازار چلنے کو کہا تو وہ جھٹ پٹ تیار ہوگئیں۔

ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ٹرالی دھکیلتے دونوں نے افطاری میں بنائی جانے والی کھانوں میں استعمال ہونے والے اشیاء کا اچھا خاصا ڈھیر جمع کرلیا تھا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر جب لڑکے نے سامان رکھنا شروع کیا تو زونیرا بول پڑی۔

''یہ کس کا سامان رکھ رہے ہیں بھائی۔''

''باجی آپ کا ہی ہے۔'' لڑکے نے مڑ کر امل کو دیکھا۔

''جی بھابھی! ہم نے افطار کے لیے چیزیں لی ہیں۔'' امل نے وضاحت کی۔

''اس کی کیا ضرورت ہے۔'' زونیرا نے پکوڑا مکس کا ڈبا اٹھا کر الٹ پلٹ کیا۔

''بھابھی صبا بتارہی تھی پکوڑا مکس سے بڑے مزے دار پکوڑے بنتے ہیں۔ اسی لیے لے لیا ہے۔ ہم بھی ٹرائی کرلیں گے۔'' آنیہ اپنی دوست کا حوالہ دیتی مزے سے بولی۔

''چیز تو رہ ہی گئی۔ بھائی چیز بھی لادیں۔'' امل کو یاد آیا تو لڑکے کو ہدایت دی پھر زونیرا کی طرف مڑی ''چیز کے کتنے پیکٹ لیں؟ میں سوچ رہی تھی چکن چیز بالز بنا کر فریز کردیں گے۔'' مگر زونیرا نے ٹوک دیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اس بار میں نے طے کیا ہے کہ ہم سحری اور افطار میں ہلکا پھلکا سا کچھ کھائیں گے۔ پچھلے ایک مہینے میں تمہارے بھائی کا پانچ کلو وزن بڑھ گیا ہے۔ اب اگر یہ پکوڑے، سموسے کھائیں گے تو جانے کیا حال کریں گے اپنا۔'' ہاتھ سے چیزیں پیچھے کرتی وہ فکر مندی سے بولتی جارہی تھی۔

''پر بھابھی، یہ تو روٹین کی چیزیں ہیں۔ بھلا اس کے بغیر افطاری کیسی لگے گی۔'' امل منمنائی۔

''تو کیا ہوا۔ روزے کی طرح فرض تھوڑی ہیں۔''

''اسی وجہ سے بھابھی کا پارہ ہائی تھا۔'' آنیہ اس کے کان میں گھسی، پھر جو زونیرا نے چیزیں رکھنا شروع کیں تو دونوں بہنوں کی آنکھوں میں گویا آنسو ہی آگئے۔ اس بار تو گھر میں افطار کے بعد بھی روزہ ہی رکھا جانے والا تھا۔

☆☆☆

آج پہلی سحری تھی اور وہ خوشی خوشی آکر کرسی کھینچ کر بیٹھا تھا۔

''آہا، رمضان میں سحری کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔'' فیروز نے بولتے ہوئے تائید طلب نظروں سے سامنے کرسیوں پر بیٹھیں اپنی بہنوں کو دیکھا جن کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔

''اچھا تو تم دونوں کو ابھی سے روزہ لگنا شروع ہوگیا ہے۔'' وہ شرارت سے بولا۔



"بھائی آپ بھی کچھ لمحوں بعد اسی کیفیت سے دوچار ہونے والے ہیں۔" امل جل کر بولی۔ فیروز نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ اسی وقت زونیرا ہاٹ پاٹ لے آئی۔

"شروع کریں۔" بھنڈی کا ڈونگا اس کے سامنے رکھا۔ پلیٹ میں سالن نکال کر اس نے مزے سے ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھایا۔ مگر یہ کیا دسترخوان سے برآمد ہونے والی سوکھی روٹی کو اس نے حیرت سے دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟" سامنے بیٹھی بہنوں سے پوچھا۔

"یہ آپ کا پانچ کلو وزن بڑھنے کی سزا ہے جو ہم معصوموں کو بھی بھگتنی پڑ رہی ہے۔" امل جھٹ سے بولی۔

"جی اور بھابھی نے کہہ دیا ہے کہ گھر میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں آئے گی جس سے وزن بڑھنے کا خدشہ ہو۔" آنیہ نے بھی اسے صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

"وہ تو پچھلے مہینے میں نے ملک شیک زیادہ پیا تھا۔ ورنہ خود بتاؤ کہیں سے موٹا لگ رہا ہوں تم لوگوں کو۔" فیروز نے تلملا کر کہا۔

"ہمیں تو آپ زاہد خان سے کم نہیں لگتے۔ پر بھابھی کو کیسے سمجھائیں۔" امل نے منہ بنایا۔

"کیوں بھئی زاہد خان سے کم لگتا ہوں میں۔" زونیرا کے آکر بیٹھتے ہی اس نے پوچھ لیا۔

"سحری کا وقت نکل رہا ہے اور آپ کو زاہد خان یاد آرہا ہے۔" پانی کی بوتل میز پر رکھتے وہ حیرانگی سے بولی۔ امل اور آنیہ نے مسکراہٹ چھپائی۔

"پراٹھا کہاں ہے میرا۔ یار یہ بھی کوئی سحری ہے۔" فیروز کے کہنے کی دیر تھی۔ زونیرا فوراً سمجھ گئی۔

"پراٹھے بھول جائیں۔ اس بار یہی ملے گا۔"

"فرائی انڈہ ہی بنادو۔" فرمائش کی۔

"قطعاً نہیں، فرائی انڈے میں بہت کیلوریز ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمارے ہیلتھ کنٹرول پلان میں اس کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔" زونیرا نے ہمارے پر زور دیتے ہوئے ہری جھنڈی دکھائی۔ اب چونکہ وقت کم رہ گیا تھا اس لیے بحث کا ارادہ ترک کر کے اس نے سوکھی روٹی کا نوالہ توڑ لیا ورنہ اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑ سکتے تھے۔

☆☆☆

"یہ کیا ہے؟" افطاری کے لیے بیٹھتے ہی اس نے میز پر رکھیں اشیاء کو دیکھا۔ اس وقت تک وہ اپنی بیگم کے صبح کے فرمودات کو بالکل ہی فراموش کر چکا تھا۔

"یہ سلاد، براؤن بریڈ کے سینڈوچز، ابلے انڈے اور اسٹیم چکن ہے۔" آنیہ نے ساری چیزوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

"وہ تو مجھے نظر آرہا ہے مگر افطاری کہاں ہے۔" سکنجبین کا جگ لے کر آتی امل کو فیروز کی بات پر زوروں کی ہنسی آئی تھی۔

"بھائی بھول گئے یہ ہمارے ہیلتھ کنٹرول پلان کا حصہ ہے۔ جو آپ کی بیگم نے بڑے پیار سے آپ کے لیے ترتیب دیا ہے۔" فیروز نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے ہنستی ہوئی امل کو گھورا۔

"اور جس کی زد میں ہم دونوں بھی آچکی ہیں۔" آنیہ بے چارگی سے بولی۔

"اور ہاں فریج میں فروٹ چاٹ بھی پڑی ہے۔" فیروز کے بجھے چہرے کی رونق کچھ بحال ہوئی۔

"مگر مایونیز اور کریم کی تمام تر کیلوریز سے پاک فروٹ چاٹ۔" امل کی اطلاع پر فیروز کا چہرہ پھر سے تاریک ہو گیا۔

"اذان ہو رہی ہے شروع کریں۔" زونیرا آکر بیٹھی اور دعا کر کے کھجوروں کی پلیٹ آگے کی جس میں گن کر چار کھجوریں رکھی گئی تھیں۔ گہرا سانس لیتے ہوئے فیروز نے کھجور منہ میں رکھی۔ پیاس سے حلق اس قدر خشک تھا کہ وہ جلدی جلدی پانی کے دو گلاس پی گیا۔ پھر گلاس امل کی جانب بڑھایا۔ سکنجبین ڈال دو۔

"جی بھائی۔ آرام سے پئیں۔ یوں بھی سب کو ایک ایک گلاس ہی ملے گا۔" طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ امل نے بتایا۔ اور یہ سن کر فیروز کا سر چکرا گیا۔

جب سے زونیرا کے خاندان میں وزن بڑھ جانے کی وجہ سے دل کے امراض تشخیص ہونا شروع ہوئے تھے وہ یوں ہی اس کے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ مگر اس بار تو لگتا تھا نوبت فاقوں تک آنے والی تھی۔

☆☆☆

افطار کے بعد دونوں نے کمرے میں آتے ہی اسکائپ لگا لیا تھا۔ ان کے والد عرصہ دراز سے سعودیہ میں نوکری کی غرض سے مقیم تھے۔ اور اکثر وہ لوگ اسکائپ پر ہی بات چیت کر لیا کرتے تھے۔

"کیسی ہیں میری پریاں۔" وہ لاڈ سے انہیں پریاں کہا کرتے تھے۔

"ابو جی روزے سے ہیں اور یقین مانیں سخت روزہ لگ رہا ہے۔" آنیہ نے بڑے دردناک انداز میں جواب دیا۔

"افطاری تو کب کی گزر گئی۔ یہ کون سے روزے سے ہو بیٹا جی۔" انہوں نے اپنے مخصوص مسکراتے لہجے میں پوچھا۔

"یہ ہر وقت کا روزہ ہے ابو جی۔" امل بولی۔

پھر اس نے بھابھی کے ہیلتھ کنٹرول پلان کے بارے میں انہیں تفصیل سے آگاہ کیا، جسے سنتے ہی وہ بے اختیار ہنسنے لگے۔

"ہنس لیں ابو جی۔ آپ خود تو اپنے باورچی کے ہاتھ کے مزے دار پراٹھے کھا رہے ہوں گے اور ادھر آپ کی اولاد فاقے کاٹ رہی ہے۔" امل نے جذباتیت کی حد کر دی۔

"کچھ ہی دنوں میں جب اپنی دبلی پتلی بیٹیوں کو سوکھ کر کانٹا ہوتے دیکھیں گے تب احساس ہوگا آپ کو ہمارے ساتھ ہونے والی زیادتی کا۔" آنیہ نے بھی اپنی مظلومیت کی تصویر کھینچی۔

"ہوں۔ پاکستان آؤں گا تب ہی معلوم ہوگا۔ عید تک تم تینوں نظر بھی آؤ گے یا نہیں۔ اس بہانے میری نظر کا معائنہ بھی ہو جائے گا۔" وہ غیر سنجیدگی سے بولے۔ کچھ دیر کے بعد وہ اسکائپ بند کر کے نماز کی تیاری کرنے لگیں۔ امل آئینے میں دیکھ کر نماز کے لیے دوپٹا لپیٹ رہی تھی جب فیروز نے ہلکا سا دروازہ بجا کر اندر جھانکا۔

"تراویح پڑھنے جا رہا ہوں۔ واپسی پر دروازہ کھول دینا۔" امل نے سر ہلایا۔ "جی بھائی۔"

آنیہ تولیے سے منہ پونچھ رہی تھی جب گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

"بھائی گاڑی پر مسجد جائیں گے۔" جائے نماز بچھاتی امل کو دیکھا۔

"کر لینے دو یہ من مانی بھائی کو انہیں کیا معلوم تراویح کے بعد بھابھی نے واک کا بھی پروگرام بنا رکھا ہے۔" مسکرا کر کہتی نماز پڑھنے لگی۔

واپسی پر آنیہ نے فیروز کے لیے گیٹ کھولا تو وہ چہکتا ہوا گاڑی سے اترا۔

"ماشاءاللہ بھائی تراویح پڑھنے سے کیسی رونق آگئی ہے آپ کے چہرے پر۔" اس کے چہرے کی چمک دیکھ کر آنیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"بیٹا آپ کے چہرے پر بھی آجائے گی۔" پیار سے اس کے سر پر چپت لگاتے وہ پراسرار انداز میں مسکرایا۔ پھر گاڑی سے تھیلا نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

"اپنی بھابھی سے چھپا کر کھانا۔" سیٹی بجاتے ہوئے وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ جبکہ آنیہ، پکوڑوں اور سموسوں کی مخصوص مہک کو اندر اتارتی اپنے کمرے کی جانب سرپٹ بھاگی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کہیں بھابھی نے دوڑنے کا آرڈر تو نہیں دے دیا کہ گھر میں چلنے پھرنے کے بجائے بھاگتے دوڑتے نظر آؤ۔" آنیہ کو پھولے سانسوں کے ساتھ اندر آتے دیکھ کر امل نے خیال آرائی کی۔ دوپٹا کھول کر اب وہ کندھوں پر پھیلا رہی تھی۔

"آپی بھائی ہمارے لیے پکوڑے اور سموسے

PakiBooks.Site

لائے ہیں۔" کمرے کا دروازہ بند کرتی وہ تیزی سے اس کے قریب آگئی۔ ہاتھ میں پکڑا تھیلا کھول کر دکھایا۔ چہرے پر ایسی خوشی تھی گویا من وسلوئی ہاتھ لگ گیا ہو۔

"جیو بھائی جیو" امل بھی خوش ہوگئی۔ پھر دونوں بیٹھ کر مزے سے رمضان کی خصوصی سوغات کھانے لگیں۔ آدھے گھنٹے بعد انہیں بھائی بھابھی کے ساتھ واک پر بھی تو جانا تھا۔

☆☆☆

جیسے جیسے پہلا عشرہ گزرتا جا رہا تھا۔ ان کی بھی ایک روٹین بنتی جا رہی تھی۔ افطاری پر وہ تینوں بلاچوں چراں تھوڑا بہت کھا کر گزارا کر لیتے۔ تراویح کے بعد فیروز خود تو باہر سے کھا آتا اور ان دونوں کے لیے واپسی پر ساتھ لیتا آتا۔ یوں وہ تینوں مزے سے اپنی زبان کے چسکے پورے کر لیتے۔ اس کے بعد واک کرنے وہ چاروں گھر سے نکل پڑتے اور اس دوران وہ دونوں آئس کریم والے کو دھر لیتیں۔ چند بار تو انہوں نے بھابھی کو باتوں میں لگا کر اپنے معصوم بھائی کو بھی آئس کریم کھانے کا موقع دیا۔ آخر ان گرمیوں کے موسم میں کبھی کبھار بندہ بشر کا دل ایسی ٹھنڈی میٹھی چیزوں پر آ ہی جاتا ہے۔

باقی سب تو ٹھیک تھا بس سحری ہی تھی جو وہ حسب منشا نہ کر پاتے اور مجبوراً وہ سوکھی روٹی ہی حلق سے اتارنی پڑتی۔ بس ایک فیور تھا جو امل فیروز کو سحری میں دے دیا کرتی اور وہ تھی چینی والی چائے۔ چونکہ زونیرا نے فیروز کو پھیکی چائے دینے کی ہدایت کی ہوئی تھی تو امل چپکے سے اس کی چائے میں چینی ڈال دیتی۔ دوسری جانب زونیرا خوش تھی کہ وہ تینوں بہن بھائی اس کے ہیلتھ کنٹرول پلان پر پابندی سے عمل کر رہے ہیں۔

پہلا عشرہ ختم ہونے کو تھا جب زونیرا نے انگلینڈ سے اپنے کزن کی آمد کی خبر سنائی۔ اس کی خالہ جو شادی کے بعد انگلینڈ سدھار گئی تھیں وہ اب مستقل طور پر پاکستان آنے والی تھیں اور چونکہ ان کے بڑے بیٹے کو پاکستان میں نوکری مل گئی تھی تو اسے پہلے آنا پڑ رہا تھا۔ اور اس خبر کو سنتے ہی تینوں کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے اور یہ خوشی یقیناً مہمان کی آمد سے نہیں بلکہ اس کے لیے کی جانے والی خاطر مدارات سے مشروط تھی۔

"الحمدللہ۔" امل نے مطمئن ہوتے ہوئے شکر ادا کیا۔ آخر یہ چھپن چھپائی تو ختم ہو۔

"شکر ہے اب رمضان کی روٹین تو سیٹ ہوگی گھر میں۔" آنیہ نے بھی دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ اور فیروز نے تو ڈھکے چھپے الفاظ میں کہہ ہی دیا۔

"واہ، رمضان میں مہمان کی آمد تو خاصی خوش آئند بات ہے۔ تم فہرست بنا دینا چیزوں کی میں لے آؤں گا۔"

"میں تو کب سے نئی چیزیں ٹرائی کرنے کا سوچ رہی تھی اور ہاں چنا چاٹ تو اس دفعہ بنائی ہی نہیں۔" امل کو بروقت یاد آیا۔

"آپی امی تو ہیں نہیں گھر پر۔ املی کی چٹنی کون بنائے گا وہ بھی بازار سے منگوا لیتے ہیں۔" آنیہ نے لقمہ دیا۔

"چنا چاٹ اور ساتھ میں سموسے۔" فیروز کے منہ میں پانی آگیا۔ سامنے میز پر وہی روکھی پھیکی سی افطاری سجی تھی جس سے وہ اکتایا ہوا تھا۔

"بس اسی لیے میں نے سودے میں چنے نہیں منگوائے ورنہ آپ کو ساتھ میں سموسوں کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔" زونیرا فوراً بولی۔

"پر بھابھی اب تو مہمان آرہا ہے۔ اب یہ اہتمام تو کرنا ہی پڑے گا۔" امل نے اہم بات کی طرف توجہ دلائی۔

"کچھ نہیں، خاصا اہتمام کرنا پڑے گا۔ آخر وہ اپنی بہن کے سسرال آرہا ہے۔ کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے اس کی خاطر مدارت میں۔" فیروز نے بظاہر عام سے انداز میں کہا، دل میں تو لڈو پھوٹ رہے تھے کہ یوں سحری میں بھی ان کی جان بخشی ہو جائے گی۔

"آپ بھول رہے ہیں وہ میرا کزن ہے اور جس طرح مجھے آپ سب کی صحت کا خیال ہے اس کا بھی اتنا ہی خیال ہے اور یوں بھی وہ ہلکا پھلکا کھانے میں ہی خوش رہے گا۔ اب ہمارے خاندان میں سب ہی کو اپنی صحت کا بہت خیال رہتا ہے۔ اور خالو کو تو خود آخری عمر میں دل کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اس لیے کوئی ضرورت نہیں ہے روٹین خراب کرنے کی۔" زونیرا کے حتمی انداز پر ان کے ارمانوں پر اوس گری۔

"یا اللہ امی کب آئیں گی۔" آنیہ فریادی انداز میں بڑبڑائی۔ امل اور فیروز نے بے چارگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر خاموش رہے۔

☆☆☆

ابراہیم دو سال کے بعد پاکستان آیا تھا۔ شدید گرمی کے باوجود اسے اپنے وطن لوٹنے کی خوشی اس قدر تھی کہ موسم کی سختی بھی اسے پریشان نہ کر سکی۔ افطار کا وقت قریب تھا جب وہ فیروز کے ساتھ ایئرپورٹ سے گھر پہنچا۔ وہ روزے سے تھا۔ بیگ کمرے میں پہنچا کر وہ ہاتھ دھوتا، افطار کے لیے آگیا۔ اذان کی آواز کا انتظار کرتے اس نے کسی قدر حیرت سے میز پر رکھیں کھانے کی چیزوں کا جائزہ لیا۔ اتنی عجیب وغریب افطاری اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔

"پاکستان میں افطاری کا ٹرینڈ خاصا تبدیل ہوگیا ہے۔" اس نے کھنکارتے ہوئے کہا۔ اشارہ ان اشیاء کی جانب کیا گیا تھا۔

"جی نہیں یہ ٹرینڈ صرف ہمارے گھر میں بدلا ہے۔ اور وہ بھی آپ کی بہن کی بدولت۔" سب سے پہلا جواب فیروز کی جانب سے آیا تھا۔

"ہاں تو ضرورت بھی کیا ہے کہ آئلی اور کیلوریز سے بھرپور چیزیں کھانے کی، صحت بخش چیزیں کھائیں گے تب ہی تو اپنا خیال رکھ سکیں گے۔" زونیرا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ابراہیم نے بمشکل لبوں پر مسکراہٹ پھیلائی ورنہ اس قسم کی روکھی پھیکی افطاری کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ تو پردیس کا ترسا ہوا جانے کیا کیا کھانے کا سوچ کر آیا تھا اور یہاں عام روٹین کی غذا بھی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ مغرب کی اذان کے ہوتے ہی سب نے کھجور کھا کر روزہ کھولا۔ دو گلاس پانی پی کر اس نے شربت سے گلاس بھر کر لبوں سے لگایا۔ ایک گھونٹ لیتے ہی اس نے گلاس واپس میز پر رکھا۔

"آپ لوگ چینی ڈالنا بھول گئے ہیں شاید" ابراہیم نے زونیرا کی طرف دیکھا۔ حلق میں لیموں کی کھٹاس کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہم میٹھا کم ہی ڈالتے ہیں کیونکہ زیادہ میٹھا مضر صحت ہے۔" آنیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زونیرا بتا رہی تھی۔ تم سب بھی خاصے ڈائٹ کانشس ہو۔" فیروز بولا۔

"جی ٹھیک کہہ رہی تھیں بلکہ ہم تو کھانا بھی کم ہی پسند کرتے ہیں۔" جلے دل کے ساتھ اس نے اپنی طرف سے طنز کیا تھا۔ اور دل تو یہی تھا کہ کچھ ڈھنگ کا کھانے کو مانگ لے کہ بھئی مجھے کیوں فاقے کروانے پر تلے ہو کر مگر زونیرا نے جب اتراتے ہوئے کہا کہ دیکھا ابراہیم بھی میرا ہی بھائی ہے جسے صحت کا اس قدر خیال ہے اور اس کے بعد وہ اس کے باپ کا ذکر لے بیٹھی جو اپنے آخری دنوں میں دل کی بیماری کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ بے چارہ چپکا ہو کر براؤن بریڈ کے سینڈوچز حلق سے اتارنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

افطاری کے بعد اس نے اپنی خیریت کی اطلاع دینے کے لیے انگلینڈ کال کی تو ماما نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"زونیرا کی نند سے ملے۔ کیسی لگی؟"

"ماما ابھی یہاں آئے مجھے اتنی دیر نہیں گزری جتنا بڑا آپ نے سوال کر لیا ہے۔" پیشانی ملتا وہ اکتا کر بولا۔

"بس ابراہیم اس بار میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی۔ اس عید پر میں نے تمہاری منگنی کرنی ہے اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ بہتر ہے کہ تم خود ہی لڑکی

پسند کرلو بلکہ زونیرا کی نند کو بغور دیکھو، وہ بہت تعریف کررہی تھی امل کی۔"

ماما کی سوئی پچھلے ایک سال سے اس کی شادی پر ہی اٹکی ہوئی تھی اور اب کی بار ان کے ارادے خاصے خطرناک تھے۔ یعنی وہ اس کی شادی کرا کر ہی دم لیں گی۔

"جی بھائی بغور لڑکی کا جائزہ لیجیے گا۔ باقاعدہ مائکرو اسکوپ لگا کر۔" مومن نے ماما کے ہاتھ سے ریسیور لے کر شوخی سے کہا جس پر وہ مزید تلملا اٹھا۔

"یار پیٹ میں کچھ جائے گا تو لڑکی کی طرف دھیان جائے گا نا۔ یہاں تو کھانے پینے کے نام پر براؤن بریڈ، ابلے انڈے وغیرہ مل رہے ہیں۔" مومن کے بے ساختہ قہقہے پر اس نے فون کان سے تھوڑا دور کیا۔

"لے لو مزے بیٹا۔ جب آخری روزے یہاں آکر گزارو گے تب پوچھوں گا۔" اس نے ڈرانا چاہا۔

"بہرحال آپ لڑکی پر سنجیدگی سے غور کریں کیونکہ ماما بقرعید تک آپ کی شادی کا پلان بنائے بیٹھی ہیں۔"

"فی الحال تو میں سحری کے مینو پر غور وفکر کررہا ہوں۔" اس کی بے چارگی پر مومن کے حلق سے ہنسی کا فوارہ پھوٹا۔

"بیسٹ آف لک بھائی۔" فون بند کرکے وہ اپنا بیگ کھولنے لگا۔

☆☆☆

چار دن تو ابراہیم کی روٹین سیٹ ہونے میں اور تھکن اترنے میں لگ گئے۔ مسئلہ تب شروع ہوا جب پانچویں دن وہ تراویح پر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ سفید شلوار قمیص میں اسے چلنے کے لیے تیار کھڑا دیکھ کر فیروز کے چہرے پر گھبراہٹ نمودار ہوئی۔

"آں۔ وہ میں تو دور والی مسجد میں تراویح پڑھنے جاتا ہوں۔ میرے سارے کولیگز وہیں آتے ہیں تو ہم واپسی پر آدھا گھنٹا گپ شپ لگا لیتے ہیں۔ اگر تم محلے کی مسجد میں ہی پڑھنا چاہتے ہو تو مرضی ہے تمہاری۔" اس نے بات بنانی چاہی۔ جس میں آدھا سچ یہ تھا کہ وہ بازار کے قریب والی مسجد میں تراویح پڑھنے جاتا تھا۔

زونیرا نے اعتراض کرنا چاہا اسے یوں فیروز کا منع کرنا اچھا نہ لگا مگر ابراہیم نے خود ہی قریبی مسجد جانے کی حامی بھرلی۔

اسے بھلا ان کے کولیگز کی محفل میں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ صبح اس کا دفتر شروع ہونے والا تھا اسی لیے وہ رات کو جلدی سونا چاہتا تھا۔ دوسری طرف ان تینوں کی جان میں جان آئی تھی۔ ورنہ اگر وہ مہمان ساتھ چل پڑتا تو ان کا پول کھلنا یقینی تھا۔

☆☆☆

شروع کے کچھ دنوں میں وہ اتنا مصروف رہا تھا کہ ماما کی بات ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔ وہ تو جب انہوں نے پھر سے یاد دہانی کروائی تو اسے خیال آیا۔

"اف ایک تو یہ پاکستانی مائیں بھی نا۔ لڑکی دکھانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔" دفتر کے لیے تیار ہوتا وہ ماما کی باتیں یاد کرکے محظوظ ہوتا رہا۔

باہر نکلتے ہی وہ اسے برآمدے میں بیٹھی نظر آگئی۔ نماز کے سے انداز میں دوپٹا لیے وہ قرآن پاک کی تلاوت کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

☆☆☆

"آنیہ آئس کریم والا کب آئے گا۔ میرا بڑا دل چاہ رہا ہے آج آئس کریم کھانے کا۔"

"روز تو آجاتا ہے آپی، آج پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے۔" آنیہ دور تک دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ دونوں یہاں کیوں رک گئیں۔ کوئی مسئلہ ہے کیا۔" اچانک ابراہیم کی آواز سن کر وہ دونوں بری طرح چونکیں۔ "ابراہیم بھائی آپ"

آنیہ ہڑبڑائی۔

"کوئی مسئلہ ہے تو بتائیے" دونوں کے گھبرائے ہوئے چہرے دیکھ کر پوچھا۔

"جی وہ۔ آ۔ آپی کے پیر میں چوٹ لگ گئی ہے اسی لیے ہم یہاں رک گئے کچھ دیر کے لیے۔" آنیہ کے کہنے پر امل نے اسے گھورا۔

"اوہ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔" وہ امل کی جانب مڑا جو مزید گھبرا گئی تھی۔

"دکھایے۔" وہ پنجوں کے بل نیچے بیٹھا۔

"نہیں نہیں۔ اتنی کوئی خاص چھوٹ نہیں آئی۔" امل بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

"ارے آپ تو بچوں کی طرح گھبرا رہی ہیں مجھے دیکھنے دیجیے اگر ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہے تو میں گاڑی یہیں لے آتا ہوں۔" شائستگی سے کہتے ہوئے اس نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"میں نے کہا نا اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ڈاکٹر کے نام پر وہ بدک کر یوں پیچھے ہوئی جیسے وہ اسے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا اور یوں تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے کوئی نوکیلی چیز بڑی زور سے اس کے پاؤں کے پچھلے حصے میں چبھی تھی کہ اس کے منہ سے سسکاری نکلی۔ پاؤں پکڑتی وہ فوراً نیچے بیٹھ گئی۔ تکلیف سے آنکھوں میں نمی تک آگئی تھی۔

"میں تو پہلے ہی منع کررہا تھا۔ اب ہاتھ ہٹایے دیکھنے دیں مجھے۔" پھر سے اس کے قریب پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے وہ بولا۔

"یہ تو خون نکل رہا ہے۔" ابراہیم کے کہنے کی دیر تھی۔ امل کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس کے پاؤں کا جائزہ لیتے یک دم ابراہیم کی نظر اس کے چہرے پڑی تو وہ کچھ دیر کے لیے تھم سا گیا۔ سیاہ بھیگی پلکیں اس پر اس کا پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو روکنا۔

"امل آپ ٹھیک تو ہیں۔" بے اختیاری میں اس کے لبوں سے پھسلا۔ اس ایک لمحے میں جانے کیا جادو ہوا تھا اس پر کہ بھیگی پلکوں والی اس لڑکی پر نظریں ٹھہری گئیں۔ دفتر میں وہ سارا وقت اس کے خیال کو جھٹکتا رہا مگر اس کا چہرہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو پا رہا تھا۔ افطاری کے وقت اس کی غیر موجودگی پر وہ مزید بے چین ہوا۔ پتا چلا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ "کیا خبر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو۔" دل کی بات پر لبیک کہتا تراویح پر جانے سے پہلے اس کے کمرے کے قریب آرکا۔ ہلکی سی دستک کے جواب میں آنیہ نے دروازہ کھولا۔

"کوئی کام تھا ابراہیم بھائی۔"

"نہیں میں آپ کی آپی کا حال چال پوچھنے آیا تھا۔" اس کے فکرمندانہ انداز پر آنیہ سرہلاتے ہوئے اندر غائب ہوئی پھر دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ دوسری طرف بستر پر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھی امل جزبز ہوئی۔ بھلا اسے اندر بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ آنیہ پر اچھا خاصا تاؤ آیا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس کے نرمی اور تشویش سے پوچھنے پر امل نے جواب دیا۔

"اب کافی بہتر ہوں۔"

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتایے گا۔"

"یہ تو ہمیں کہنا چاہیے تھا ابراہیم بھائی۔" آنیہ اس کی آفر پر چہکی۔

"ایک ہی بات ہے۔" مسکرا کر کہتا وہ باہر نکل گیا۔

"آپی ابراہیم بھائی کتنے اچھے ہیں نا، اب دیکھیں آپ کی طبیعت پوچھنے آگئے۔" دروازہ بند کرتی وہ کن انکھیوں سے امل کو دیکھ کر بولی۔

"تم کیوں اتنی طرف داری کررہی ہو۔" امل نے مشکوک نظروں سے آنیہ کو دیکھا جو پراسرار انداز میں مسکرائی تھی۔

"بڑی زبردست خبر ہے میرے پاس" اس نے تجسس پھیلایا۔

"وہ کیا" نیم دراز ہوتی امل یک دم سیدھی

PakiBooks.Site

ہوئی۔

"ابراہیم بھائی کی امی نے آپ کا رشتہ مانگا ہے۔ صبح میں نے بھائی اور بھابھی کی باتیں سنی تھیں۔ آپ کو کیسے لگے۔ اچھے ہیں نا۔" آنیہ نے اس سے رائے مانگی جو اس غیر متوقع بات پر حیران ہوئی تھی۔

"دیکھنے اور بول چال میں تو اچھا ہے۔ پر ہے تو بھابھی کا رشتہ دار۔ نا بھئی نا، مجھے فاقہ زدہ زندگی نہیں گزارنی" امل نے جھرجھری لی۔ جبکہ آنیہ ہنستی ہوئی وضو کرنے غسل خانے میں گھس گئی۔

☆☆☆

جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ ابراہیم اور اس کے رشتے پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے تب سے وہ بولائی بولائی پھر رہی تھی۔ زونیرا بھابھی نے اسے فیروز بھائی کی ابراہیم کے رشتے کے لیے کی جانے والی بھرپور حمایت کے متعلق بتایا تھا اور اسے بھی سوچنے کا کہہ دیا تھا۔ جس پر وہ خاصی تپی ہوئی تھی۔ خود تو بھائی ایک دن ڈھنگ سے کھائے پیے بغیر نہیں رہ سکتے اور میرے لیے ایسا عجیب وغریب سسرال منتخب کر رہے ہیں جہاں مجھے سالہا سال روزے کی حالت میں رہنا پڑے گا۔"

ابھی ابھی وہ باورچی خانے میں کھڑی اس بات پر کڑھ رہی تھی۔ چائے پیالی میں انڈیل کر بے خیالی میں وہیں کھڑی گھونٹ بھرنے لگی یک دم ابراہیم کو دروازے سے اندر آتے دیکھ کر وہ گھبرا کر سوچوں سے نکلی۔

"چائے کا کپ ملے گا۔" مسکراتے ہوئے فرمائش کی گئی۔ بے دھیانی میں امل نے اپنی پیالی اس کی جانب بڑھا دی جس پر ابراہیم کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے سٹپٹا کر پیالی والا ہاتھ پیچھے کھینچا۔

"اتنی میٹھاس والی چائے مجھے، ہضم نہیں ہوگی۔ کھنکارتے ہوئے ذومعنی انداز میں بولا۔ امل کان کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی۔

"اف او۔ یہ بھی کیا کہتی ہوگی۔ اس کی پھیکی چائے پینے کے لیے میں اتنا تڑپ رہا ہوں۔" دماغ نے دل کو ڈپٹا تو اسے کچھ شرمندگی ہوئی۔ اس کے خیالات سے بے خبر امل نے رخ موڑتے ہوئے اسے ٹالا۔

"آپ جائیے میں بنا کر بھیجتی ہوں۔" خود کو سرزنش کرتا وہ مڑ گیا۔ اور اس کے جاتے ہی امل نے سکون کا سانس لیا۔

"توبہ ان کو تو کالی چائے ملنی چاہیے بغیر دودھ والی" پتی کا ڈبا اٹھاتی وہ چیخی۔

☆☆☆

انعم نے سب دوستوں کو افطار پارٹی دی تھی۔ وہ آدھے گھنٹے سے تیار ہو کر گھڑی دیکھ رہی تھی کہ کب فیروز بھائی آئیں تو وہ گھر سے نکلے۔ اس دوران انعم دوبار فون کر چکی تھی۔ وہ پیچ وتاب کھاتی بھائی کا نمبر ملائے جا رہی تھی مگر نمبر ہنوز دوسری کال پر مصروف تھا۔ ایسے میں ابراہیم کو آتے دیکھ کر زونیرا کو بروقت خیال آیا۔



"ابراہیم یہ امل کو ذرا اس کی دوست کے چھوڑ آؤ۔"

"نہیں نہیں بھابھی انہیں زحمت ہوگی۔ بھائی بس پہنچنے والے ہوں گے۔" امل نے فوراً منع کیا اسے یہ مشورہ قطعاً پسند نہیں آیا۔

"مجھے کسی قسم کی زحمت نہیں ہوگی۔ میں چھوڑ دیتا ہوں۔" وہ تو جیسے تیار بیٹھا تھا۔ امل کو دل ہی دل میں خوب تاؤ آیا جبکہ ابراہیم بخوشی یہ ذمہ داری اٹھانے کو تیار تھا۔ زونیرا کے اصرار پر امل بادل ناخواستہ ہی سہی اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ابراہیم نے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی جو لیمن کلر کے کھلے ہوئے جوڑے میں خود بھی کسی کلی کی مانند کھلی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ موبائل کان سے لگائے وہ اپنی دوست کو تسلی دے رہی تھی کہ وہ جلد پہنچنے والی ہے۔ پھر دوسری جانب سے کی جانے والی کسی بات پر ہنستے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔

اسی وقت سگنل پر گاڑی رکی تو بچہ بھاگتا ہوا قریب آیا۔ "صاحب، بیگم کے لیے لے لو۔ رب جوڑی سلامت رکھے" بچے نے سفید اور سرخ رنگ کے پھولوں سے بنے خوب صورت گجرے کھڑکی سے اندر کر کے دکھائے۔ ابراہیم نے اپنی ہنسی دبائی اور ایک نظر امل پر ڈالی جو بچے کو گرم نظروں سے گھور رہی تھی۔

"دے دو یار" بچے کو پیسے دے کر اس نے دو گجرے خرید لیے۔ پھر امل کی جانب بڑھاتا ہوا بولا۔

"بیگم تو فی الحال کوئی ہے نہیں۔ اگر آپ رکھ لیں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"میں یہ نہیں رکھ سکتی" اس نے انکار کرنا چاہا۔

"اپنے مہمان کی اتنی سی خوشی تو آپ پوری کر ہی سکتی ہیں۔" مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا جس نے ہاتھ بڑھا کر گجرے تھام لیے تھے۔ سگنل کھل گیا تھا ابراہیم نے گاڑی آگے بڑھائی۔ امل نے کن انکھیوں سے اس شاندار سے بندے کو دیکھا جو باہر دیکھتے ہوئے محتاط انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔ گاڑی میں چلتے اے سی کی ٹھنڈک میں اس کے وجود سے اٹھتی کلون کی خوشبو نے اسے چند لمحوں کے لیے جیسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"اتنا برا بھی نہیں ہے۔" اس نے دل میں اعتراف کیا۔

"جتنی یہ ڈائٹ کانشس ہے۔ پتا نہیں پارٹی میں بے چاری کچھ کھا پی بھی سکے گی یا نہیں۔" اس کی سوچوں سے بے خبر ابراہیم کو نئی فکر لاحق ہوئی۔

یک دم گاڑی کے جھٹکا کھا کر رک جانے سے دونوں اپنے خیالات سے چونکے۔

"کیا ہوا۔" امل کا سوال بے ساختہ تھا۔

"معلوم نہیں کوئی خرابی ہوگئی ہے شاید" لاعلمی کا اظہار کرتا وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ چند سیکنڈ بے چینی سے اس کا انتظار کرتے رہنے کے بعد وہ گاڑی سے نکل کر اس کے قریب آئی جو گاڑی کا بونٹ کھولے معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر جھکا سر اٹھایا۔ "سمجھ میں نہیں آ رہا کیا مسئلہ ہے۔ میں اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" اس کی ایک دوبار کی کوشش کے باوجود گاڑی اسٹارٹ ہونے میں ناکام رہی۔

"اب کیا کریں۔" پریشان سی امل اس کی جانب آئی۔ وقت تیزی سے نکلا جا رہا تھا اور وہ سڑک کے بیچ ایک خراب گاڑی کے ساتھ کھڑے تھے۔ آس پاس اکا دکا گاڑیاں گزرتی نظر آ رہی تھیں۔

"ارے آپ میرے ہوتے ہوئے کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری گاڑی دغا دے گئی ہے مگر میں آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ بے فکر رہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں تسلی دی۔

"آپ یوں سڑک پر کھڑی ہیں مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ بیٹھیں میں ٹیکسی روکتا ہوں۔" اسے اشارہ کرتا وہ خود ٹیکسی کی تلاش میں کھڑا ہو گیا۔ گرمی شدید تھی وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دو منٹ میں وہ ایک ٹیکسی روکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"چلیں میں آپ کو چھوڑ کر آتا ہوں۔" گاڑی بند کرتا وہ اس کے ساتھ ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

"میرا خیال ہے اب گھر چلتے ہیں۔" امل نے اس کے خیال سے کہا گرمی کی شدت کے باعث اس بے چارے کا برا حال تھا بھلا ایسی گرمی کی عادت کہاں تھی اسے۔

"آپ کی دوست کا گھر زیادہ قریب پڑے گا۔"

"بھائی صاحب آپ دوسری ٹیکسی روک لیں۔" ٹیکسی ڈرائیور قریب آتی ٹیکسی کو دیکھ کر بولا۔ امل نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

"نہیں آپ اس وقت میری ذمہ داری ہیں اور میں آپ کو یوں اکیلا نہیں بھیج سکتا۔" ذمہ داری سے کہتا وہ خود بھی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ بڑبڑاتے ہوئے ٹیکسی اسٹارٹ کی اس کو شاید ان

www.PakiBooks.site

انگلینڈ پلٹ صاحب کی بے اعتباری کچھ خاص پسند نہ آئی تھی۔ امل کی نگاہیں بھٹک کر اس کے تھکن زدہ چہرے پر جا رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ پورا پسینے میں بھیگ گیا تھا مگر مجال ہے جو ایک بل بھی اس کے ماتھے پر آیا ہو۔ چہرے پر وہی مخصوص نرمی تھی جو اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ انعم کا گھر آنے پر وہ ساتھ ہی اترا تھا۔

”آپ بھی آ جائیں اذان ہونے والی ہے۔“ اسے گھنٹی بجاتے دیکھ کر وہ بولی۔

”بہت شکریہ مگر یہ آپ کی دعوت ہے آپ انجوائے کریں۔ میں ٹیکسی والے سے پانی یا کھجور لے لوں گا۔“

”فیروز بھائی کو فون کر لیں وہ آ جائیں گے۔“ امل کو خیال آیا۔

”آپ میری فکر نہ کریں۔ وہ افطاری کر لیں تو میں انہیں بلا لوں گا اگر اس کی ضرورت پڑی تو۔“

اپنے سوا اسے سب کے آرام کی فکر تھی۔

”آپ میری وجہ سے خوار ہوئے مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔“ ہونٹ کاٹتی وہ شرمندہ سی بولی۔

”پر مجھے آپ کے لیے خوار ہو کر برا نہیں لگا۔ یہ خواری ہمیشہ یاد رہے گی۔“ اس کے ذومعنی انداز پر امل کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔

اسی وقت انعم نے گیٹ کھولا تو وہ اسے خدا حافظ کہتا مڑ گیا۔ اور اندر داخل ہونے سے انعم کے گیٹ بند کرنے تک امل کی نظریں ٹیکسی کی جانب بڑھتے ابراہیم پر ہی لگی رہیں۔

☆☆☆

”اوئی اللہ او۔“ بستر پر لیٹا فیروز پیٹ پکڑے دہرا ہوا جا رہا تھا۔ پیٹ میں درد کی شکایت تو افطار سے پہلے کی تھی مگر اب تو پیٹ میں ایسے مروڑ پڑ رہے تھے کہ اس کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔

”بھائی بہت درد ہو رہا ہے۔“ آنیہ کے بچگانہ سوال پر فیروز نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”نہیں شوقیہ تڑپ رہا ہوں۔“ آنیہ نے شرمندہ ہو کر نظریں چرائیں۔ امل چھوٹی سی بوتل پکڑے اندر آئی۔

”پیٹ کے درد کی گولی نہیں مل رہی بھابھی۔“ کرسی پر بیٹھا ابراہیم جلدی سے اٹھا۔

”میں گاڑی نکال رہا ہوں۔ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ یہی کہہ رہا تھا مگر زونیرا اپنے ٹوٹکے آزمائے جا رہی تھی۔

”رکو، دو گھر چھوڑ کر ڈاکٹر صفدر کا گھر ہے انہیں بلا لاؤ، ورنہ وہ تراویح کے لیے مسجد چلے جائیں گے۔“ زونیرا کے کہنے پر وہ ڈاکٹر صفدر کو لینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صفدر اپنا بیگ تھامے اس کے ساتھ اندر آئے۔ کچھ دیر معائنہ کر کے تسلی آمیز انداز میں بولے۔

فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل اوپر تلے مرغن غذائیں کھانے سے درد کی شکایت ہو جاتی ہے۔ میں گولیاں دے دیتا ہوں یہ کھا لیں ان شاء اللہ آرام آ جائے گا۔“

”انہوں نے تو کوئی مرغن غذا نہیں کھائی۔ بلکہ ہم تو افطار میں تلی ہوئی چیزیں بھی نہیں کھاتے۔ سحری اور افطاری دونوں ہی ہلکی پھلکی سی ہوتی ہے۔“ زونیرا نے حیرانگی سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھا۔ کچھ ایسا ہی حیرت زدہ ابراہیم بھی تھا۔ جبکہ بستر پر لیٹا فیروز پانی سے گولیاں نگلتا نظریں چرا رہا تھا۔ امل اور آنیہ کی نگاہیں ملیں، ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

”اونہوں۔ میں نہیں مان سکتا۔ کچھ تو ایسا کھایا ہے انہوں نے کیوں فیروز؟ پانی پیتے فیروز کو اچھو لگ گیا۔

”آپ کو تراویح کے لیے دیر ہو رہی ہو گی۔“ چند منٹ بعد سینہ ملتا وہ ان کا سوال ٹالنے کو بولا۔ زونیرا کی مشکوک نظریں وہ خود پر اچھی طرح محسوس کر چکا تھا۔ اور ڈاکٹر صفدر کے جاتے ہی ابراہیم کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر وہ تفتیشی انداز اس کی طرف مڑی۔

PakiBooks.Site

”بتائیں ذرا کب کب اور کیا کچھ کھاتے رہے ہیں مجھ سے چھپ چھپاتے۔“

”تمہارے سامنے ہی تو سحری، افطاری کرتا ہوں۔“ وہ گڑبڑایا۔

”آپ کی خاطر ہم نے گھر کا پورا انتظام بدل کر رکھ دیا اور آپ چوری چھپے دعوتیں اڑاتے رہے۔“

زونیرا شدید صدمے کی کیفیت سے دوچار تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے فیروز کی دوسری شادی کی خبر سن لی ہو۔

”اچھا یہ جو آپ روز تراویح پڑھنے دوسری مسجد جاتے ہیں کولیگز کے ساتھ گپیں لگانے کے بہانے تب ہی دل کی خواہش پوری کرتے ہوں گے۔“ زونیرا کو ایک دم سارا دھندلا منظر جیسے صاف نظر آنے لگا۔ امل اور آنیہ نے سکھ کا سانس لیا کم از کم بھابھی کو ان پر تو شک نہیں گزرا تھا۔

”دیکھ رہی ہو تم دونوں کیسے دھوکا دیتے رہے ہیں یہ ہمیں۔“ زونیرا نے ان سے بھی ہمدردی بٹورنی چاہی۔

”بہت بری بات ہے بھائی۔“ آنیہ نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ جس پر فیروز دل ہی دل میں تلملایا۔

”پتا نہیں یہ کیا سوچ رہے ہوں گے ہمارے بارے میں۔“ خاموش بیٹھے ابراہیم کو دیکھ کر امل کے دل میں خیال گزرا۔ دوسری طرف ابراہیم دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

”کیا ہی اچھا ہوتا جو فیروز بھائی مجھے اپنے ساتھ ہی لے جاتے۔ یا یہ انوکھا مشورہ دے دیتے۔ آخر مہمان کا اتنا حق تو بنتا ہی ہے۔“ شکایتی نظروں سے فیروز کو دیکھا جو ابراہیم کے سامنے اپنی درگت بننے پر اپنے آپ میں شرمندہ ہوئے جا رہا تھا۔

☆☆☆

قصہ کچھ یوں تھا کہ فیروز بیوی کو مطمئن کرنے کے لیے افطاری بھی کر لیتا اور باہر سے بھی اپنی پسند کے کھانے کھا آتا اور جس دن وہ افطار کم کھاتا اسی دن زونیرا تراویح کے بعد دودھ کا بڑا سا مگ لے کر آ جاتی بقول اس کے اسے اپنے شوہر کو کمزور تھوڑا ہی کرنا تھا۔ اب چاہے بے چارے شوہر کا کباڑا ہی نکل جاتا۔ وہ اپنی طرف سے اس کا بھرپور خیال رکھ رہی تھی اور اسی خیال نے رنگ دکھایا تھا کہ اس کا پول یوں کھلا تھا۔ اب سزا کے طور پر زونیرا نے کڑی نگاہ رکھنا شروع کر دی تھی جس کے تحت وہ ابراہیم کے ساتھ قریبی مسجد میں تراویح پڑھتے اور اپنے وقت پر ان کی واپسی ہوتی اور اس سزا کی لپیٹ میں وہ دونوں بھی آ چکی تھیں۔ انہیں بھی اب اسی روکھی سوکھی افطاری پر گزارا کرنا پڑ رہا تھا۔

آنیہ کو سخت شکایت تھی کہ محلے میں سے کسی نے اس بار افطاری بھیجنے کی روایت کو قائم رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

”آپی اب تو میں روزہ کھولتے وقت یہی دعا کرتی ہوں کہ کہیں سے پکوڑے، سموسے آ جائیں۔“ آنیہ آہ بھرتے ہوئے حسرت آمیز لہجے میں کہتی۔

☆☆☆

رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوتے ہی موسم کی شدت میں خاصی کمی واقع ہوئی تھی پچھلے چند دنوں سے بادل اپنا گھیراؤ لیے ہوئے تھے جس سے موسم تو خوش گوار ہو گیا تھا مگر بارش ابھی تک اپنی چھب دکھلانے پر راضی نہ تھی۔ موسم کے برخلاف آنیہ کا موڈ سخت خراب تھا۔ صبح سحری کا وقت ختم ہونے سے محض دس منٹ پہلے ان کی آنکھ کھلی تھی۔ اس لیے انہیں پانی پر ہی گزارا کرنا پڑا تھا۔ اب اس کا بھوک اور پیاس سے برا حال تھا۔ افطاری بنانے میں کسی قسم کی مدد کرنے سے بھی اس نے انکار کر دیا تھا اور اب وہ مغرب کی اذان کے انتظار میں گلی میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ محلے کے بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وقت گزاری کے لیے وہ وہیں بیٹھ کر میچ دیکھنے لگی۔ محض آدھے گھنٹے میں وہ اکتا کر گھر کی جانب چل دی۔ اپنے گھر کے گیٹ سے ایک اجنبی لڑکے کو اند جاتا دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا احساس

www.PakiBooks.Site

ہوا۔ گیٹ کھلا چھوڑ کر وہ کتنی دیر سے باہر پھر رہی تھی۔ اور اس کی غفلت کا فائدہ کوئی بھی اٹھا سکتا تھا۔ وہ بھاگ کر اندر گھسی اور یک دم اس کے سامنے جا کر راستہ روکا جو اپنی دھن میں آگے بڑھ رہا تھا۔

"جناب منہ اٹھا کر آپ کدھر گھسے چلے جا رہے ہیں۔" لہجہ اچھا خاصا ترش تھا۔

"آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں۔" اس نے انگلی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔ آنیہ کو مزید تاؤ آیا۔

"آپ سے نہیں آپ کے فرشتوں سے بات کر رہی ہوں۔"

"اچھا تو فرشتوں تک پہنچ ہے آپ کی! خاصی پہنچی ہوئی ہیں آپ تو۔" شوخی سے بولتے ہوئے اس نے دلچسپی سے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا جو ناک پر سے پھسلتے چشمے کو دائیں ہاتھ کی انگلی سے ٹھیک کر رہی تھی جبکہ بایاں ہاتھ کمر پر رکھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں غصہ، پیشانی پر تیوریاں چڑھائے وہ اسے اسے دیکھ رہی تھی جیسے کچا چبا جائے گی اور سب سے دلچسپ اس کی پونی ٹیل تھی جو بات کرتے ہوئے جھولتی نظر آتی۔

"یہاں سے نکلتے ہو یا بلاؤں اپنے دس بھائیوں کو" خاصا اترایا ہوا انداز تھا۔

"دس کچھ زیادہ نہیں ہو گئے۔" اس کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

"آپ سے مطلب دس ہوں یا بیس۔" آنیہ کو جی بھر کر غصہ آیا اس ڈھیٹ ابن ڈھیٹ پر جو ٹلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"اندر آ جاؤ مومن یار اذان ہونے والی ہے۔" اندرونی دروازے سے آتی ابراہیم کی آواز پر وہ بری طرح چونکی مڑ کر دروازے پر کھڑے ابراہیم کو دیکھا پھر سامنے کھڑے مومن کو جو شرارتی مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آں...... آپ ابراہیم بھائی کے بھائی ہیں۔" وہ گڑبڑائی۔

"جی اب اجازت ہے یا کوٹ مارشل کریں گی۔"

"آپ ہی بحث کرنے کھڑے ہو گئے تھے۔ پہلے بتا دیتے۔" اپنی غلطی اس پر ڈال کر کندھے اچکاتی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ مومن زیر لب مسکراتا اس کے پیچھے چل دیا۔

ماما اور مومن کے یوں اچانک آنے سے ابراہیم بہت خوش تھا۔ نظر بار بار بھٹک کر اس پری وش پر بھی جا رہی تھی جو اس سے نظر ملنے پر گھبرا کر نظر جھکا لیتی۔ ماما کے التفات پر وہ پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی اوپر سے ابراہیم کی پڑنے والی نرم گرم نظریں اسے سب کے ساتھ بیٹھنا مشکل لگ رہا تھا۔

"خالہ آپ مجھے تو اپنے آنے کا بتا دیتیں۔" زونیرا نے تیسری مرتبہ کہا تو ابراہیم مسکراہٹ چھپاتا مومن کی جانب جھکا۔

"بیٹا ملنا پھر بھی یہی تھا۔" اس کا اشارہ افطار کے لیے بنائی گئی اشیاء کی جانب تھا۔

آنیہ کو بھوک تو یوں بھی شدت سے لگی ہوئی تھی تھے اور خوش قسمتی سے اذان ہونے سے پانچ منٹ پہلے پڑوس سے افطاری بھیج دی گئی جس پر خوش ہوتی وہ اب میز پر پلیٹیں رکھ رہی تھی۔ پکوڑوں کی پلیٹ اس نے عین اپنے سامنے رکھی تھی۔ پھر وہ مزے سے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ سامنے بیٹھے مومن کی نظریں اسی کے چہرے پر تھیں۔ اذان ہوتے ہی سب نے دعا پڑھ کر روزہ کھولا۔ کھجور کھا کر جیسے ہی اس نے پکوڑوں کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا، مومن نے پلیٹ اٹھا کر دو پکوڑے اپنی پلیٹ میں رکھے پھر کینہ توز نظروں سے خود کو گھورتی آنیہ کو دیکھا۔

"اتنی کیلوریز والی چیزیں کھا کر آپ اپنا ڈائٹ پلان تو خراب نہیں کریں گی۔ آخر دبلا رہنے کے لیے قربانی تو دینی پڑتی ہے۔" مسکراتے لہجے میں بولتا وہ اسے اچھا خاصا غصہ دلا گیا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ گلاس اٹھا کر اس کے سر پر دے مارتی مگر بمشکل ضبط کر گئی۔ اسی وقت زونیرا بول پڑی۔

"ہم تو سارا رمضان ہلکا پھلکا کھاتے رہے ہیں یہ تلی ہوئی چیزیں صحت کے لیے بالکل اچھی نہیں ہوتیں۔"

"خیر پڑوسیوں نے محبت سے اتنا کچھ بھیجا ہے تو تھوڑا بہت کھا لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" فیروز جھکتے ہوئے بولا۔ اہل مسکراہٹ چھپاتی پلیٹ پر جھک گئی جبکہ ساتھ بیٹھی آنیہ نے للچائی نظروں سے پکوڑوں کی پلیٹ کو دیکھا جو اب خالی ہو چکی تھی۔ سموسہ بھی ایک ہی باقی بچا تھا جو فیروز بھائی نے اپنی پلیٹ میں سجا لیا۔ تپ کر سامنے بیٹھے مومن کو دیکھا جو محظوظ کن مسکراہٹ کے ساتھ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

افطار کے بعد وہ برتن اٹھا رہی تھی جب گھوم کر میز کے دوسری طرف آئی۔ زونیرا سے کوئی بات کرتے مومن کے پاؤں پر بڑی زور کی کرسی لگی تھی بلکہ ماری گئی تھی۔

"آؤچ۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اوہ سوری، غلطی سے کرسی کھسک گئی شاید۔" سب کے متوجہ ہونے پر وہ بولی۔ سب باتوں میں مصروف ہو گئے تو آہستگی سے بولی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ باہر والے اتنے نازک ہوتے ہیں کہ ذرا سا جھٹکا نہیں سہہ سکتے۔" طنز کرتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ تکلیف کے باوجود مومن کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

"آپی یہ جو آپ کا ہونے والا دیور ہے نا یہ کسی دن پٹے گا مجھ سے۔" اسے آئے ابھی دو دن ہی گزرے تھے اور آنیہ زچ ہو کر رہ گئی تھی۔ "ابراہیم بھائی سے کہہ دیں سمجھا دیں اسے۔"

"میری تو بڑی گپ شپ ہے جو تمہارا پیغام پہنچا دوں اور بے چارہ ذرا سا چلبلا ہی تو ہے۔ تم خواہ مخواہ اس کی باتوں کو دل پر لے لیتی ہو۔" اہل کی طرف داری پر آنیہ تلملائی۔

"آپ کا ہونے والا سسرال جو ہے آپ تو حمایت کریں گی۔"

"خیر ابھی کچھ طے تو نہیں ہوا۔" اہل موبائل اٹھا کر امی کو فون کرنے لگی۔ آنیہ نے چائے بنانے کے لیے باورچی خانے کا رخ کیا۔ ابراہیم کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے کھانے کی خوشبو آئی تو وہ وہیں رک گئی۔

"نان چھولوں کی خوشبو وہ بھی ابراہیم بھائی کے کمرے سے۔"

اس کی ناک اس معاملے میں خاصی تیز تھی اسی لیے وہ فوراً پہچان گئی تھی تو غیر اخلاقی حرکت مگر تجسس کے مارے اس نے دروازے کی جھری سے اندر جھانکا تو منظر واضح تھا۔ ابراہیم اور مومن کارپٹ پر بیٹھے پلیٹ میں رکھے نان چھولے کھا رہے تھے۔

"جب سے پاکستان آیا ہوں پہلی بار کچھ ڈھنگ کا کھا رہا ہوں ورنہ زونیرا باجی نے تو فاقے کرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" یہ آواز ابراہیم کی تھی۔ آنیہ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"میں تو حیران ہوں آپ نے اتنے روزے اس روکھی پھیکی افطاری پر گزار کیسے دیے۔ میری تو دو دن میں بس ہو گئی ہے۔" مومن بولا تھا۔

آنیہ پرجوش انداز میں الٹے قدموں کمرے کی طرف بھاگی تھی کمرے میں گھستے ہی اہل کو اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔

"خوش ہو جاؤ آپی اب تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا ابراہیم بھائی سے شادی پر۔" اس بات پر اہل کے لب کھل اٹھے۔ سارے اعتراض تو تب ہی دم توڑ گئے تھے جب وہ دل کو اچھا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

"پھر کیا سوچا آپ نے لڑکی کے متعلق؟" مومن کے سوال پر اس کی صورت آنکھوں کے سامنے آتے ہی لب مسکرا دیے۔ وہ دونوں تراویح پڑھنے کے بعد اب صحن میں ٹہل رہے تھے۔ ابراہیم کو مسکراتے دیکھ کر مومن رک گیا۔ دونوں بازو سینے پر لپیٹ کر اسے دیکھا۔

"مسکراتے رہیں گے یا کوئی جواب بھی دیں گے۔"

www.PakiBooks.site

"میری مسکراہٹ میں تمہیں جواب نہیں نظر آرہا۔"

ابراہیم بھی رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"جواب تو کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔ پر آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ بعد میں نہ کہیے گا کدھر پھنسا دیا۔" ابراہیم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کیونکہ جہاں سے میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ کو ساری زندگی براؤن بریڈ اور ابلے انڈوں پر گزارا کرنا پڑے گا۔ اس لیے بھائی جلد بازی میں فیصلہ نہ کریں۔ اپنی طرف سے اس نے خوف ناک منظر کھینچتے ہوئے کہا۔

"یار تم مجھے کیوں کنفیوز کر رہے ہو۔" نیچے گرے پتھر کو جوتے سے ٹھوکر مارتے ہوئے وہ جھنجلایا۔ سارے حسین تصورات کا بیڑا غرق کر دیا تھا اس نے۔

"فیصلہ تو آپ ہی کریں گے میں صرف آپ کو حقیقی صورت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔ اب اتنی تو ذمہ داری بنتی ہے بھائی ہوں آپ کا۔" وہ فوراً اس کا ہمدرد بن گیا۔

"اب تمہیں کیسے سمجھاؤں، اچھی لگتی ہے وہ مجھے۔" اس نے گویا مجرمانہ انداز میں اعتراف کیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کن الفاظ میں اپنے جذبات عیاں کرے۔

"مطلب ابلے انڈے ڈن سمجھوں۔" مومن نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ابلے انڈے کہاں سے آگئے بیچ میں۔" ابراہیم تپ کر بولا۔ مومن نے گویا اس کی شہ رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ابلے انڈے اسے سخت ناپسند تھے اور جب سے یہاں آیا تھا انڈہ کھائے بغیر گزارا کر رہا تھا۔

"آپ ایسی لڑکی کے لیے ہاں کر رہے ہیں جس کی خوراک ہی ابلے انڈے سے شروع ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ آپ کو اپنے سارے چسکوں اور چٹورے پن سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ آخر پیٹ کی قربانی تو بنتی ہے۔" مومن آج اسے صحیح معنوں میں زچ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"میں کسی چیز کی قربانی نہیں دے رہا۔" وہ چیخا۔

"پھر میں جا کر ماما سے کہہ دیتا ہوں کہ بھائی کو زونیرا باجی کی نند کسی حال میں قبول نہیں ہے۔"

مومن نے ہاتھ اٹھا کر جوش سے کہا۔ ابراہیم نے جھنجلا کر سر اٹھایا تو اندرونی دروازے کے پاس ساکت کھڑی امل پر نظر پڑی۔ اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ امل تیزی سے اندر کی جانب مڑی۔ مومن بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

"بھاڑ میں گیا پیٹ اور بھاڑ میں گئے سارے چسکے۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" اس پر برستا ابراہیم تیزی سے اندر کی جانب چل دیا۔

"کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔" مومن نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کلامی کی۔

☆☆☆

وہ ساری رات پریشانی سے ٹہلتا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی غلط فہمی کیسے دور ہوگی۔ سحری کے وقت اس کی سرخی مائل آنکھیں دیکھ کر وہ کچھ اور بے چین ہوا۔ سامنے پلیٹ میں پڑا پراٹھا تک کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جو ماما نے بنایا تھا۔

دو دنوں سے وہ زونیرا کی روٹین دیکھ رہی تھیں اور اسے منع کر کے وہ خود سحری بنانے کھڑی ہو گئیں۔

گو کہ زونیرا نے پراٹھے بنانے سے روکنے کی بہت کوشش کی مگر ماما نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ ان کے مطابق اس گھر میں ایسا کوئی بیمار شخص موجود نہیں تھا جو ان کے پراٹھے کھانے سے مزید بیمار پڑ جاتا۔

فیروز اور آنیہ تو دل ہی دل میں ان کے واری صدقے جا رہے تھے۔ جنہوں نے آخر ان کی دلی مراد پوری کر دی تھی۔ آنیہ تو پرجوش سی ان کے آگے پیچھے پھر کر ان کا ہاتھ بٹانے کی پوری کوشش کرتی رہی تھی اور اب مزے سے ان کے ہاتھ کا لذیذ بل دار پراٹھا کھانے میں مصروف تھی۔ امل تھوڑا سا کھا کر اٹھ گئی تو بے دلی سے لقمے لیتے ابراہیم نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ ساتھ ہی مومن کو گھورا جو رغبت سے سحری کرتا اسے زہر لگا تھا۔

"امل...... بیٹا طبیعت ٹھیک ہے تم نے تو ڈھنگ سے کھایا بھی نہیں۔" ماما نے چائے لاتی امل سے پوچھا۔ اس کی بے اختیار نگاہیں بھی امل کی جانب اٹھیں۔

"آنٹی رات سے سر میں درد ہے اسی لیے کھایا نہیں جا رہا۔" اس نے جواز پیش کیا۔

"اور تم کیوں نہیں کھا رہے۔" اب بیٹے کو دیکھا۔

"جی میں لے رہا ہوں۔" ابراہیم نے گڑبڑا کر نوالہ توڑا۔

"ماما آج سحری کچھ ہیوی ہو گئی ہے اب یہ پچھلا نیچے کر کے ہی کھائیں گے ورنہ بدہضمی ہو جائے گی۔" مومن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آنکھوں میں شرارت واضح تھی۔

"ویسے اگر نہیں کھایا جا رہا تو مجھے دے دیں بھائی میں بالکل بھی ڈائٹ کانشئس نہیں ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے مزید کھانے کی۔"

ماما نے ٹوکا آخر کو زونیرا کے کچھ جراثیم تو ماما میں بھی موجود تھے۔ رشتہ دار جو ٹھہریں۔ مومن نے گہرا سانس لیتے ہوئے سامنے بیٹھی آنیہ کو دیکھا جو بائیں ہاتھ کی انگلی سے اپنا ناک پر سے پھسلتا چشمہ درست کرتی، دائیں ہاتھ سے پراٹھے کے نوالے چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

سارا دن وہ دفتر میں امل سے بات کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دیتا رہا تھا۔ پر جب گھر پہنچا تو امل کے امی ابو کی آمد ہو چکی تھی اور گھر میں سب ایک ہی جگہ پر میلا لگائے بیٹھے تھے۔ وہ بھی درمیان میں بیٹھی تھی ابراہیم پر نظر پڑتے ہی منہ پھیر گئی تو وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

رویت ہلال کمیٹی کو ابھی تک عید کا چاند نظر نہیں آسکا تھا۔ اور وہ چاند نظر آجانے کی متمنی کب سے ٹی وی اسکرین پر نظریں لگائے بیٹھی تھی۔ افطار کے وقت سے وہ زور و شور سے یہی دعا مانگ رہی تھی کہ عید کا چاند نظر آجائے۔

"ویسے تمہیں پورے تیس روزے رکھنے پر مسئلہ کیا ہے۔ ایک ہی تو باقی رہ گیا ہے۔" مومن نے اسے مخاطب کرنا ضروری سمجھا۔ آنیہ نے پہلے اسے گھور کر دیکھا پھر پر یقین انداز میں بولی۔

"آپ رکھیں آخری روزہ ہم تو ان شاء اللہ عید منائیں گے۔" مزید کچھ دیر کے انتظار کے بعد وہ اکتا کر اٹھ گئی۔ چھت پر جا کر چاند تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد وہ باورچی خانے میں گھس گئی فریج میں جھانک کر دیکھا اور فروٹ سیلڈ کا پیالا باہر نکال لیا۔ وہ جیسے ہی مڑی سامنے مومن شرارتی مسکراہٹ لبوں پر پھیلائے کھڑا تھا۔ اس نے پیالا آنیہ کے ہاتھ سے اچکنا چاہا مگر وہ اس کا ارادہ بھانپ کر ہاتھ پہلے ہی پیچھے کر چکی تھی۔

"عید سے پہلے اتنی بد پرہیزی چچ چچ۔"

"میں جو مرضی کروں آپ کو کیا تکلیف ہے۔"

وہ تیکھے تیوروں سے بولی۔

"تکلیف یہ ہے کہ تمہیں تنگ کرنے میں مجھے بہت مزا آتا ہے۔"

"جی......" آنیہ نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا جو پینترا بدلے اب بڑی میٹھی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جی! اتنا ہلکا مت لو مجھے۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں میں یہاں آتے ہی سب کے چہرے دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ ہیلتھ کنٹرول پلان سراسر زونیرا باجی کے دماغ کی اختراع ہے اور باقی سب مجبوراً اس پر عمل کر رہے ہیں۔"

"میں نے آپ دونوں بھائیوں کو نان چھولے کھاتے دیکھ لیا تھا۔" آنیہ کو بروقت یاد آیا۔ ایک دم لاؤنج سے شور اٹھا۔

"شاید چاند نظر آگیا ہے۔" وہ بے تابی سے بولی ساتھ ہی اسے دیکھا جو راستہ روکے کھڑا تھا۔

PakiBooks.Site

”یہ تو بتاتی جاؤ آئندہ بھی تمہیں تنگ کرنے کی اجازت ملے گی۔“

آپ نے اجازت لی کب تھی۔“ اس کی بولتی نظروں سے وہ خائف ہوئی۔

”ٹھیک ہے پھر ماما کو کہہ دیتا ہوں لڑکی راضی ہے۔ میری بھی منگنی کر دیں۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”مرضی ہے آپ کی۔“ مسکراتے لہجے میں کہتی وہ تیزی سے اس کے پہلو سے نکلتی، چھپاک سے غائب ہوئی تھی۔ مومن بھی سیٹی پر دھن بجاتا مسکراتے لبوں کے ساتھ باہر نکلا تھا۔

☆☆☆

چاند رات کو وہ اس سے بات کرنے کے مواقع ڈھونڈتا رہا تھا مگر وہ تھی کہ ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ بازار میں گھومتے ہوئے بھی وہ سارا وقت اپنی امی اور زونیرا کے ساتھ چپکی رہی تھی۔

اگلے روز عید کی نماز پڑھ کر وہ گھر آئے تو ساری خواتین لاؤنج میں موجود تھیں۔ بس ایک وہی تھی جو نظروں سے اوجھل تھی۔ آنیہ میز پر عید کے لوازمات سجا رہی تھی، ناشتے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

”ارے، میری بڑی پری کدھر ہے۔“ ابو جی کو اس کا خیال آیا۔

”آپی چائے لا رہی ہیں۔“ آنیہ کے کہنے پر وہ ہمت کر کے سب سے نظر بچا کر بڑی ترنگ میں باورچی خانے میں گھسا، سامنے ہی وہ چائے کی پیالیاں ٹرے میں رکھتی، ہلکے گلابی رنگ کے جوڑے میں ملبوس، نکھری نکھری سی نظر آئی۔ پشت پر بکھرے بالوں سے پانی کی ننھی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ ابراہیم قریب جا کر کھنکارا۔

”کچھ لوگ ہم سے اس قدر ناراض ہیں کہ انہیں ہماری صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ آپ بتا سکتی ہیں ایسا کیوں ہے۔“ شوخی سے کہتا وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر بغور اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھنے لگا۔

”ہم غیروں سے ناراض نہیں ہوتے۔“ اندر سے جز بز ہوتے وہ خفگی سے بولی۔

”اب ہم اتنے بھی غیر نہیں ہیں۔ ابھی ماما آپ کو منگنی انگوٹھی پہنا دیں گی۔ تو جناب آپ ہماری منگیتر کے رتبے پر فائز ہو جائیں گی۔“ انداز اتراتا ہوا تھا۔

”آپ کس خوش فہمی میں ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی منگنی ونگنی نہیں کرنی۔ میں خود انکار کر دوں گی۔“ سرخ چہرے کے ساتھ کہتی وہ ٹرے اٹھا کر تیزی سے مڑی۔ اور اس کا ارادہ بھانپتے ابراہیم کی ساری ترنگ ہوا ہو گئی۔ جلدی سے اس کے سامنے آکر راستہ روکا۔

”رک جاؤ یار، کیوں میری خوشیوں کی دشمن بن رہی ہو۔“ زبردستی اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر سلیب پر رکھی۔ ”میری بات کا یقین کرو اس دن تم نے جو کچھ سنا وہ اس فسادی مومن کے اپنے الفاظ تھے جو وہ مجھ معصوم پر تھوپ رہا تھا محض مجھے تپانے کے لیے اور تم وہ آدھی بات سن کر اس قدر ناراض ہو گئیں۔ ویسے یہ لڑکیاں وہی بات کیوں سنتی ہیں جو سننے والی نہیں ہوتی۔“ آخر میں دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”جی نہیں ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے آپ لوگوں کی باتیں سننے کی۔ اور نہ مجھے آپ سے ناراض ہونے کا شوق ہے۔“ اہل کے لہجے میں واضح خفگی تھی جس پر ابراہیم بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”ناراض نہیں تھیں تو وہ روئی روئی سی اداس آنکھیں۔ کیوں اتنے دنوں سے مجھے بے چین کیے ہوئے تھیں۔“

”ایسا کچھ نہیں تھا۔“ خفیف سی ہو کر وہ اپنے رخسار پر آئی لٹ کو انگلی سے پیچھے کرنے لگی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”پھر کیسا تھا۔“ اس کی حالت سے محظوظ ہوتا وہ اسے تنگ کرنے سے باز نہ آیا۔

”آپ راستہ دے رہے ہیں یا ابو جی کو بلاؤں۔“ اہل یک دم نظریں اٹھا کر دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔ دل کی دھڑکن اس کے بدلتے انداز پر تیز ہو گئی تھی۔ مگر ظاہر نہ ہونے دیا۔ جواباً وہ ٹپٹا کر سیدھا ہوا۔

”خدا کے لیے انہیں زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ تم مان کیوں نہیں لیتیں کہ مجھ جیسا

ٹائن ٹو فائف والی جاب کرنے والا بندہ اتنی دیر سے تم سے اظہار محبت کرنے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ اس بے چارے کو معلوم ہے کہ تم جیسی لڑکی کے ساتھ ساری زندگی ایک ڈائٹ پلان کی طرح گزارنی پڑے گی۔“

”ایک منٹ یہ ڈائٹ والا شوشا آپ کے خاندان والوں کا چھوڑا ہوا ہے ورنہ میں، بھائی اور آنیہ تو سخت بے زار تھے اس ہیلتھ کنٹرول پلان سے جو کہ سراسر بھابھی کا بنایا ہوا تھا۔“ اہل نے اس کی غلط فہمی دور کی۔

”یعنی تم ڈائٹ کانشس نہیں ہو۔“ بے ساختگی سے پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔“ جواب صاف تھا۔ ابراہیم نے حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھا۔

”یار تم تو اپنی برادری کی نکلی اور میں شرما شرمی میں خواہ مخواہ زونیرا باجی کے ہیلتھ کنٹرول پلان سے پریشان ہوتا رہا۔“ اہل کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیلی۔ ”اب یقین آیا میری محبت پر۔“

”سوچوں گی اس بارے میں۔“ وہ ناز سے بولی۔

”ابھی سوچنے کی گنجائش باقی ہے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ گی کسی کی ایسی محبت جو اپنے دیسی کھانے کے شوق کو چھوڑ کر روکھی پھیکی براؤن بریڈ پر گزارا کرنے کو تیار ہو جائے۔“ اپنی محبت پر اتراتا وہ شوخ ہوا۔

”دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤں یا پیٹ پر۔“ اہل کے شرارتی انداز پر اس کی ہنسی ـــ بے ساختہ تھی۔ اسی وقت مومن نے اندر جھانکا۔

”بھائی بات بن رہی ہے یا میں مدد کروں۔“

”فسادی جذبات تو بن چکی ہے پر تم یقیناً سب برباد کر دو گے۔“ ابراہیم نے اسے لتاڑا۔

”آپی آپ چائے لا رہی ہیں یا ہم سب منگنی کی انگوٹھی لے کر یہیں آجائیں۔“ شوخی سے بولتی آنیہ اندر آئی۔

”میں لا رہی تھی۔“ اہل خفت زدہ ہوئی مگر اس کے ٹرے اٹھانے سے پہلے آنیہ نے ٹرے پکڑ لی۔

”بھائی آپ دونوں کا منگنی کا پروگرام نہیں ہے تو آج میں منگنی کر لیتا ہوں۔“ مومن نے مسکراتی نظروں سے آنیہ کو دیکھا جو اس بات پر تیزی سے باہر بھاگی مگر چہرے کی مسکراہٹ واضح تھی۔

”یہ چھوٹے تو بڑے تیز نکلے۔“ ابراہیم نے سر پر ہاتھ پھیرا مومن نے مزے سے اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔ اہل کو بھی قدم اٹھاتے دیکھ کر وہ بے ساختہ بولا۔ ”عید مبارک“ ساتھ ہی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چوڑیوں کا سیٹ نکالا جس میں رنگ برنگی چوڑیاں تھیں۔

”اتنے بہت سارے رنگ۔“ اہل کو ہنسی آئی۔

”ہماری عید جو اتنی رنگین ہو گئی ہے۔“ اہل کے حسین روپ کو آنکھوں میں سموتے وہ جذب سے بولا۔

”خیر مبارک۔“ اپنے اتھل پتھل ہوتے دل کو سنبھالتے اس نے ابراہیم کے ہاتھ سے چوڑیاں لے لیں۔ ان چوڑیوں کے رنگوں کی مانند اس کی عید بھی ست رنگی ہو گئی تھی۔

==

گُلِ کہسار
فرح بخاری
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

شعاع عزیر



القرآن

وہ (خدا) جس کے ہاتھوں میں بادشاہی ہے، بڑی برکت والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے اس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے (اے دیکھنے والے) کیا تو (خدا) رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ تجھ کو (آسمان) میں کوئی شگاف نظر آتا ہے پھر دوبارہ (سہ بارہ) نظر کر تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

(سورۃ الملک آیت ا سے ۴)

حدیث مبارک

حضرت سعد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جب عید الفطر کا دن آتا ہے تو فرشتے راستے کے کناروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آواز دیتے رہتے ہیں، اے مسلمانو! ایک ایسے پروردگار کی طرف چلو جو بھلائی کی توفیق دے کر احسان کرتا ہے، پھر اس پر بہت سا ثواب بھی دیتا ہے تمہیں رات کو (تراویح) میں کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا تھا، تم کھڑے رہے، تمہیں دن کو روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا تم نے روزہ رکھا اور اپنے پروردگار کی اطاعت کی اب انعامات وصول کرلو، چنانچہ جب لوگ نماز پڑھ چکے ہیں تو ایک منادی آواز لگاتا ہے کہ سنو! تمہارے پروردگار نے تمہاری مغفرت کردی ہے، اب اپنے گھروں کو ہدایت یاب ہو کر جاؤ، تو درحقیقت یہ عید کا دن انعام کا دن ہے اور آسمان میں اس کا نام بھی "یوم الجائزہ (روز انعام) ہے۔" (طبرانی، ترغیب ص 101 ج ۲)

آپس کا لڑائی جھگڑا

حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے عادت کے خلاف بہت لمبی نماز پڑھی، لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"یہ نماز خوف تھی میں نے اس میں اللہ تعالیٰ سے تین دعائیں کی تھیں۔ دو ان میں سے قبول ہوئیں اور ایک دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں نے پہلی دعا مانگی کہ میری ساری امت قحط سے ہلاک نہ ہو جائے یہ قبول ہوگئی۔ دوسری دعا یہ کی کہ ان پر کوئی ایسا دشمن نہ چھا جائے۔ جو انہیں بالکل مٹادے، یہ بھی قبول ہوتی تیسری یہ دعا کہ ان میں آپس میں لڑائی جھگڑے نہ ہوں۔" یہ دعا منظور نہیں ہوئی۔

سعدیہ وحید سعدی ...... اسلام آباد

PakiBooks.Site

نظر رکھے

★ اپنے خیالات پر کیونکہ الفاظ کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔

☆ اپنے الفاظ پر کیونکہ یہ عمل کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔

☆ اپنے اعمال پر کیونکہ یہ عادت میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

☆ اپنی عادتوں پر کیونکہ یہ شخصیت کا روپ دھار لیتی ہیں۔

☆ اپنی شخصیت پر کیونکہ یہ آپ کا مقدر بن جاتی ہے۔

شبنم حنیف ...... لاہور

ضرورت سے زیادہ

مولانا رومیؒ سے کسی نے پوچھا: "زہر کیا ہے؟"

فرمایا: "ہر وہ چیز جو ہماری ضرورت سے زیادہ ہو زہر ہے، جیسے قوت، اقتدار دولت، بھوک، لالچ، محبت اور نفرت ......"

ثناء شہزاد ...... کراچی

سلطان باہو

راتیں رتی نیند نہ آوے ڈینہاں رہے حیرانی ہو

عارف دی گل عارف جانے کیا جانے نفسانی ہو

اندر بھاہیں اندر بالن اندر وچ دھوہاں ہو

شاہ رگ تھیں رب نیڑے باہو عشق کیتو سے سونہا ہو

فوزیہ ثمر بٹ گجرات

کامیاب زندگی

ایک بیٹے نے باپ سے پوچھا، "پاپا یہ "کامیاب زندگی" کیا ہوتی ہے؟" والد بیٹے کو پتنگ اڑانے لے گئے۔ بیٹا باپ کو غور سے پتنگ اڑاتے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بیٹا بولا۔

"پاپا! یہ دھاگے کی وجہ سے پتنگ اور اوپر نہیں جا پا رہی ہے۔ کیا ہم اسے توڑ دیں؟ یہ اور اوپر چلی جائے گی ...... والد نے دھاگا توڑ دیا پتنگ تھوڑا سا اور اوپر گئی اور اس کے بعد لہرا کر نیچے آئی اور دور انجان جگہ پر جا کر گرگئی ...... تب باپ نے بیٹے کو زندگی کا فلسفہ سمجھایا۔

"بیٹا! زندگی میں ہم جس اونچائی پر ہیں ہمیں اکثر لگتا ہے کہ کچھ چیزیں جن سے ہم بندھے ہوئے ہیں وہ ہمیں اور اوپر جانے سے روک رہی ہیں۔ جیسے گھر، خاندان، نظم وضبط اور والدین وغیرہ اور ان سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ اصل میں یہ ہی وہ دھاگے ہوتے ہیں جو ہمیں اس اونچائی پر بنا کے رکھتے ہیں۔ ان دھاگوں کے بغیر ہم ایک بار تو اوپر جائیں گے لیکن بعد میں ہمارا وہی حشر ہوگا جو بن دھاگے کی پتنگ کا ہوا۔ لہٰذا زندگی میں اگر تم بلندیوں پر بنے رہنا چاہتے ہو تو کبھی بھی ان دھاگوں سے رشتہ مت توڑنا۔ دھاگے اور پتنگ جیسے تعلق کے کامیاب توازن سے ملی ہوئی اونچائی کو ہی کامیاب زندگی کہتے ہیں بیٹا!"

مقدس آصف ...... رائیونڈ لاہور

دارو

ایک سفر میں فراق کے ساتھ ایک پارسی نوجوان مسٹر دارو والا بھی اتفاق سے اسی کمپارٹمنٹ میں تھے۔ راستے بھر دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ الہ آباد کا اسٹیشن آیا تو فراق صاحب اترنے کی تیاری کرنے لگے۔ مسٹر دارو والا نے کہا کہ وہ ان کے گھر آکر ان سے تفصیلی باتیں کرنا چاہتے ہیں اور فراق صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنے گھر کا پتا بتادیں۔

فراق صاحب نے کہا "میں بینک روڈ پر رہتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر میرا گھر پوچھنے کے بجائے آپ کسی کو بھی اپنا نام دارو بتادیجیے گا۔"

"لیکن ......"

"لیکن کچھ نہیں۔ لوگ اس نام کی رعایت سے آپ کو خود ہی میرے یہاں پہنچادیں گے۔" فراق صاحب نے بڑے اطمینان سے انہیں سمجھایا۔

تبسم بشیر ...... ڈنگہ

دوست

☆ ایک اچھا دوست ریاضی کے زیرو جیسا ہوتا ہے، جس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی پر وہ جس کے ساتھ جڑ جائے اس کی قیمت دس گنا بڑھا جاتی

ہے۔

☆ دوستوں کو کھو دینا غریب الوطنی سے بدتر ہے۔

☆ آزمائش دوست کی ہو، محبت کی ہو یا کسی دلبر لمحے کی، کبھی بھی سود مند نہیں ہوتی، کون جانے اس لمحے وہ کتنا مجبور ہو۔

☆ لوگ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں، بحث کو مگر نہیں چھوڑتے۔

☆ دوستی اور چائے کی حدت اور تیزی ہی ان کی خوبی ہے نہ کہ حد درجہ مٹھاس۔

کنول شاہین قیصر...... تلہ گنگ

سیاستدان

کچھ سیاست دانوں سے بھری ہوئی ایک بس بے قابو ہو کر ایک کھیت میں جا گھسی اور بری طرح تباہ ہو گئی، شور کی آواز سن کر ایک کسان فارم ہاؤس سے باہر نکلا اور بڑا گڑھا کھود کر سارے سیاست دانوں کو دفنا دیا۔

دو دن بعد پولیس کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے کسان سے بس کا معاملہ دریافت کیا۔ کسان نے تفصیل بتائی تو انسپکٹر نے پوچھا۔

''کیا تمام سیاست دان مر چکے تھے؟''

کسان نے جواب دیا۔'' کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ زندہ ہیں مگر آپ کو تو پتا ہے نا جناب سیاست دان کتنا جھوٹ بولتے ہیں؟''

فصہ نور...... روہڑی

حضرت علیؓ کی ذہانت

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا۔

''یا امیر المومنین! آسمان اور زمین کے درمیان کیا کچھ ہے؟''

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:''قبول ہونے والی دعا۔''

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا۔

''مشرق اور مغرب کے درمیان کی مسافت ہے؟''

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:''سورج کے ایک دن رات چلنے کی مسافت۔''

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا۔''پانی کا ذائقہ کیا ہے؟''

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔''جو زندگی کا ذائقہ ہے۔''

اقراء عزیز...... دریا خان جلبانی

اشفاق احمد کہتے ہیں

میں نے اپنی زندگی میں چند باتیں سیکھی ہیں

1۔ ماں باپ کے علاوہ کوئی وفادار نہیں۔

2۔ عزت صرف پیسے کی ہے انسان کی نہیں۔

3۔ غریب کا کوئی دوست نہیں بنتا۔

4۔ انسان جس شخص کے لیے دل سے مخلص ہو وہ اس کو دھوکا دیتا ہے۔

5۔ لوگ اچھی سیرت کے بجائے اچھی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

صدف سمیع...... کراچی

عید کارڈ

رشتہ توڑ کے جانے والے
مجھ کو چھوڑ کے جانے والے
اب کی عید پر
مجھ کو جتنے کارڈ ملے
ان کارڈوں میں
سب سے پیارا
سب سے اچھا
پہلا کارڈ تمہارا ہے
مجھ کو چھوڑ کے جانے والے
ذرا کہو
یہ کس طرف اشارہ ہے......؟

(وصی شاہ)



عید کی روایتی مٹھائیاں

خالدہ جیلانی



موتی چور کے لڈو

اشیاء:۔

چنے کی دال	آدھا کلو
چینی	تین پاؤ
گھی	آدھی چھٹانک
بیکنگ پاؤڈر	چھ ماشے
دہی	ایک چھٹانک
دودھ	آدھا پاؤ
پانی	ایک پاؤ
گھی تلنے کے لیے	حسب ضرورت
چھوٹی الائچی	ایک تولہ
چاندی کے ورق	حسب پسند

ترکیب:۔

دال دھو کر صاف کریں اور رات کو بھگو دیں پھر اسے سل پر باریک پیس لیں اور باریک ململ کے کپڑے سے چھان لیں۔ اس میں آدھی چھٹانک گھی ڈال کر خوب حل کریں پھر اس میں دہی، دودھ اور بیکنگ پاؤڈر بھی ملا کر اتنا پھینٹیں کہ اس میں جھاگ اٹھ آئے اور یہ خمیر کی طرح پھولا ہوا نظر آ جائے۔ چینی میں ایک کپ پانی ڈال کر پکا لیں تاکہ چاشنی تیار ہو جائے۔ کڑاہی میں بہت سا گھی ڈالیں جب کڑکڑا جائے تو چھلنی لوہے کی موٹے چھید والی اوپر رکھیں اور اس میں تیار شدہ پسی ہوئی دال ڈال دیں اور اسے ہلا ہلا کر بوندیاں گرائیں۔ خیال رہے کہ یہ بوندیاں بڑی تیزی سے ادھر گرائیں اور ادھر نکال کر شیرے میں ڈالتے جائیں۔ زیادہ تلی جانے پر نہ رنگت ٹھیک رہے گی اور نہ لڈو ہی ٹھیک بنیں گے۔ بوندیاں شیرے میں خوب بھیگ جائیں تو نکال کر ٹھنڈا ہونے کی لیے رکھ دیں اور ٹھنڈا ہونے پر اس میں الائچی چھیل کر دانے ملا لیں اور لڈو بنا لیں۔ خشک ہونے پر اوپر سے چاندی کے ورق لگا دیں۔

رس گلے

اشیاء:۔



چاول کا آٹا	سو گرام
دودھ	ایک لیٹر
ٹاٹری	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
چینی	آدھا کلو
پستہ	چار عدد



ترکیب:۔

ایک برتن میں دودھ ڈال کر چولہے پر رکھیں جب دودھ ابلنے لگے تو اس میں ٹاٹری ڈال دیں۔ جب دودھ پھٹ جائے تو اسے آگ سے الگ کرلیں اور کسی باریک کپڑے میں ڈال کر پوٹلی باندھ کر پانی نچوڑیں جب پانی نکل جائے تو پنیر کو پلیٹ میں ڈال کر اس میں چاول کا باریک پسا ہوا آٹا ملا کر مکس کردیں۔ تقریباً نصف گھنٹے تک دونوں اشیاء کو مسلسل مکس کرکے یکجان کردیں۔ اس کے بعد اس آمیزے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر رکھ دیں۔ اب پستے کی گریاں باریک کتر کر رکھیں پھر ایک برتن میں چینی اور تین کپ پانی ڈال کر چولہے پر رکھیں جب ایک تار کی چاشنی بن جائے تو اس میں رس گلے ڈال کر ہلکی ہلکی آنچ پر پکائیں جب رس گلے پک کر پھول جائیں تو انہیں برتن سے باہر نکال لیں۔ اس کے بعد چینی کا شربت تیار کریں جو کہ پتلا ہو، زیادہ گاڑھا نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں پستے کی کتری ہوئی گریاں اور رس گلے ڈال دیں۔ ڈش میں ڈال کر فریج میں رکھیں اور ٹھنڈے ہونے پر کھانے کے لیے پیش کریں۔

کھوپرے کی برفی

اشیاء:۔

دودھ	ایک کپ
کھویا	ایک کلوگرام
پسا ہوا کھوپرا	125 گرام
چاندی کے ورق	حسب ضرورت
پستہ	چھ عدد
کیوڑہ	چند قطرے
گھی	125 گرام

ترکیب:۔

پستہ کی گریاں باریک باریک کترا کر رکھ لیں۔ چینی کی چاشنی بنالیں۔ گھی میں کھویا، دودھ اور کھوپرا ڈال کر کڑاہی چولہے پر رکھ دیں۔ تیز آنچ پر کفگیر مسلسل چلاتے ہوئے آمیزے کو مکس کرتے جائیں، جب جمنے لگے تو روح کیوڑہ ڈال دیں ملاتے ہوئے چولہے سے نیچے اتاریں اور تھوڑا سا گھی کسی ٹرے میں لگائیں۔ برفی کا آمیزہ پھیلا کر ڈالیں اور اس پر پستے چھڑک دیں۔ جم جائے تو اوپر چاندی کے ورق لگا کر کاٹیں اور کھانے کے لیے پیش کریں۔

==:

یادوں کے دریچے سے

بشریٰ محمود

گوہر قاسم، کی ڈائری میں تحریر

ایک خوبصورت غزل

کہہ دیں وہ محبت سے اگر عید مبارک
مل جائے مرادوں کا ثمر عید مبارک

ممکن ہی نہیں غم سے مفر عید مبارک
حالات مخالف ہیں مگر عید مبارک

اے کاش ہمیں عید ہو ایسی کوئی حاصل
کہتے رہیں ہم شام و سحر عید مبارک

ہو جائیں سبھی شکوے گلے دور دلوں سے
وہ کہہ دیں گلے مل کے اگر عید مبارک

جب آپ ہمیں اپنا سمجھتے ہیں تو کیسے
ہنستے ہوئے بے خوف و خطر عید مبارک

انوش ابصار، کی ڈائری میں تحریر

قتیل شفائی کی غزل

جب تصور مرا چپکے سے تجھے چھو آئے
اپنی ہر سانس سے مجھ کو تری خوشبو آئے

مشغلہ اب ہے مرا چاند کو تکتے رہنا
رات بھر چین نہ مجھ کو کسی پہلو آئے

جب کبھی گردش دوراں نے ستایا مجھ کو
مری جانب ترے پھیلے ہوئے بازو آئے

جب بھی سوچا کہ شب ہجر نہ ہو گی روشن
مجھ کو سمجھانے تری یاد کے جگنو آئے

کتنا حساس مری آس کا سناٹا ہے
کہ خوشی بھی جہاں باندھ کے گھنگھرو آئے

مجھ سے ملنے کو سر شام کوئی سایہ سا
تیرے آنگن سے چلے اور لب جو آئے

اس کے لہجے کا اثر تو ہے بڑی بات قتیل
وہ آنکھوں سے بھی کرتا ہوا جادو آئے

فرزانہ سرور، کی ڈائری میں تحریر

وصی شاہ کی غزل

دکھ درد میں ہمیشہ نکالے تمہارے خط
اور مل گئی خوشی تو اچھالے تمہارے خط

سب چوڑیاں تمہاری سمندر کو سونپ دیں
اور کر دیے ہوا کے حوالے تمہارے خط

میرے لہو میں گونج رہا ہے ہر ایک لفظ
میں نے رگوں کے دشت میں پالے تمہارے خط

یوں تو ہیں بے شمار وفا کی نشانیاں
لیکن ہر ایک شے سے نرالے تمہارے خط

جیسے ہو عمر بھر کا اثاثہ غریب کا
کچھ اس طرح سے میں نے سنبھالے تمہارے خط

اہل ہنر کو مجھ پہ وہی اعتراض ہے
میں نے جو اپنے شعر میں ڈھالے تمہارے خط

پروا مجھے نہیں ہے کسی چاند کی وہی
ظلمت کے دشت میں ہیں اجالے تمہارے خط

حرا کنول، کی ڈائری میں تحریر

احمد فراز کی غزل

کیا رخصت یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

ہم خود ہی ہوئے تباہ ورنہ
دنیا کو ہماری کیا پڑی تھی

یہ زخم ہیں ان دنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

جاتے تو کدھر کو تیرے وحشی
زنجیر جنون کڑی پڑی تھی

دریوزہ گر حیات بن کر
دنیا تیری راہ میں کھڑی تھی

غم ہیں تھے کہ فراز آندھیاں تھیں
دل تھا کہ فراز پنکھڑی تھی

ثناء شہزاد، کی ڈائری میں تحریر

منیزہ شاہ کی غزل

جو کبھی دل میں بسا لو تو بتا دینا مجھے
گر کبھی اپنا بنا لو تو بتا دینا مجھے

لوگ مجھ کو ہی سناتے ہیں کہانی میری
تم بھی الزام لگا لو تو بتا دینا

ویسے تو سب ہی بتا دیتے ہو سچ سچ اگر
جب کوئی بات چھپا لو تو بتا دینا مجھے

ترک الفت کا ارادہ تو نہیں ہے میرا
ہاں اگر ہاتھ چھڑا لو تو بتا دینا مجھے

بھول جاتی ہوں میں رکھ کر کہیں خود کو اکثر
تم مجھے ڈھونڈ نکالو تو بتا دینا مجھے

کوئی کہرام مچے، جشن بہاراں تو منے
در و دیوار سجا لو تو بتا دینا مجھے

دور جانے سے بس پیار بڑھا کرتا ہے
فاصلے اور بڑھا لو تو بتا دینا مجھے

بھری محفل میں تو ایسے نہیں دیکھا کرتے
اپنی نظروں کو ہٹا لو تو بتا دینا مجھے

میں کے دل ہار دوں اور جان بھی لٹا دوں لیکن
تم زمانے کو منا لو تو بتا دینا مجھے

اچھے وقتوں میں سبھی ساتھ دیا کرتے ہیں
درد کی شمعیں جلا لو تو بتا دینا مجھے

ایک ایک کر کے ہر ایک بات بھلاتے جانا
اور منیزہ کو بھلا لو تو بتا دینا مجھے

شگفتہ سلیمان



کنول شاہین ــــــــ تلہ گنگ

بند ہاتھوں کا مقدر یقیں سبھی کریں مگر
سارے جگنو اڑ گئے، دیکھا جو مٹھی کھول کر
شہر والے جھوٹ پر رکھتے ہیں بنیاد خلوص
مجھ کو پچھتانا پڑا محسن یہاں سچ بول کر

بنی خاور ــــــــ فیصل آباد

گھنی زلفوں کے سائے میں چمکتا چاند سا چہرہ
تجھے دیکھوں تو پھر راتیں سہانی یاد آتی ہیں

گڑیا شاہ ــــــــ کہروڑ پکا

سن کر تمام رات میری داستان غم
وہ مسکرا کے بولے بہت بولتے ہو تم

فضہ، ایمان فہمید ــــــــ مدینہ کالونی

وہ سوئے اتفاق آ ملے تھے ہم سے
ہم ناداں سمجھے ہماری دعا میں اثر ہے

ثمینہ خٹک ــــــــ پشاور

سزا یہ ہے کہ آنکھوں سے چھین لی نیندیں!
جرم یہ تھا کہ اس کے ساتھ جینے کے خواب دیکھے تھے

فرح شریف ــــــــ اسلام آباد

جانے اس شخص کو کیسا یہ ہنر آتا ہے
رات ہوتی ہے تو آنکھوں میں اتر آتا ہے
میں اسے اپنی دعاؤں سے نکالوں گا
وہ میری سوچ کے ہر رستے پر نظر آتا ہے

تحریم ــــــــ محراب پور

خاک اڑتی ہے رات بھر مجھ میں
کون پھرتا ہے در بدر مجھ میں
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
وہ ہے موجود اس قدر مجھ میں

رضوانہ شکیل ــــــــ ملتان

آؤ مل کر مانگیں دعائیں ہم عید کے دن
باقی رہے نہ کوئی بھی غم عید کے دن
ہر آنگن میں خوشیوں بھرا سورج اترے
اور چمکتا رہے ہر آنگن عید کے دن

تبسم بشیر ــــــــ ڈنگہ

ذرا سا مسکرا دینا تم اب عید سے پہلے پہلے
ہر اک غم کو بھلا دینا تم اب عید سے پہلے پہلے
نہ سوچو کہ کس کس نے دل دکھایا
ہر اک کو معاف کر دینا اب تم عید سے پہلے پہلے

عائشہ ــــــــ گوجرہ

اسے کہنا کہ چاہت کا بھرم ٹوٹنے نہ دینا
تم پل دو پل ہی آ جانا سنا ہے عید آئی ہے

آسیہ جاوید ــــــــ علی پور چٹھہ

اس سے ملنا تو اسے عید مبارک کہنا
یہ بھی کہنا کہ میری عید مبارک کر دے

نادیہ یاسر ــــــــ پشاور

چاند کو ہی دیکھ کر اگر آتی ہے عید
تو یقین جانو میں ہر روز عید کرتا ہوں

اقصیٰ ناصر ــــــــ کراچی

کچھ مسرت مزید ہو جائے
اس بہانے سے عید ہو جائے
عید ملنے جو آپ آ جائیں
میری بھی عید، عید ہو جائے

عذرا ناصر ــــــــ کراچی

ہم نہ مانیں گے عید آئی ہے
آپ آتے تو عید بھی آتی

رابعہ مریم ________ فاضل پور
زیادہ قرب سے ملتا ہے دوریوں کا عذاب
محبتوں کے لیے فاصلہ ضروری ہے

سدرہ عاصم ________ فیصل آباد
جو اس کے چہرے پر رنگ حیا ٹھہر جائے
تو سانس، وقت، سمندر، ہوا ٹھہر جائے

ثمرہ، اقرا ________ کراچی
ملے تجھے نہ دکھ زندگی میں
پھول کی طرح مہکے خدا کرے

زندہ رہے نام ابد تک تیرا
عید کی خوشیاں تجھے مبارک خدا کرے

عابدہ نثار ________ کراچی
نہ مل سکے ہم اس عید پر تو کوئی بات نہیں
جذبوں میں ہو خلوص تو عیدیں ہزار ہیں

صدف عمران ________ کراچی
شاید تم آؤ میں نے اسی انتظار میں
اب کے برس کی عید بھی تنہا گزار دی

لائبہ، ایمن ________ آزاد کشمیر
تحفہ دعاؤں کا تمہیں پہنچے میرا
سدا رہے تمہارے گرد خوشیوں کا گھیرا
مسرتیں تمہیں عید کی مبارک ہوں
تمہاری زیست میں نہ آئے کبھی غموں کا پھیرا

رباب راجپوت ________ پھول نگر
عید کے خیال نے خوش تو کر دیا ہے لیکن
اب بھی سوچ کر تمہیں دل بہت اداس ہے

حنا کرن ________ پتوکی
اے زندگی مجھے کچھ مسکراہٹیں ادھار دے
عید آنے والی ہے مجھے رسمیں نبھانی ہیں

ثنا سرفراز ________ قصور
اس عید پر بھی ساتھ ہیں میرے
پردیس، تنہائی اور بس تیری یادیں

ندا ادریس ________ کراچی
عید کا چاند نظر آئے گا جس دم مجھ کو
میں ترے وصل کی اے دوست دعا مانگوں گا
میں جو برسوں سے ہوں تنہائی کے صحرا میں مقیم
اب ترے عہد رفاقت کی دعا مانگوں گا

صدف خان ________ کراچی
تنہا بیٹھ کر تم کو پردیس میں یاد کریں گے
تمہاری یادوں کے سنگ ہم بھی عید منائیں گے

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات
اداسیوں کی شام اور یادوں کا یہ سماں
اپنی آنکھوں پہ ستارے ہرگز سجائیں گے
رکھنا سنبھال کے تم چند خوشیاں میرے لیے
میں لوٹ کے آؤں گا پھر عید منائیں گے

کرن رحمن ________ دبئی
تجھے میں یاد رکھوں وقت کو منظور نہیں
تجھے میں دل سے بھلا دوں میری مجال نہیں

نادیہ فیصل ________ گجرات
بچھڑنا ہے تو مت الفاظ ڈھونڈ
ہمارے واسطے لہجہ ہی بہت ہے

فرحین ظفر ________ کراچی
اس کے کوئی زیادہ نہیں رکتا ہے یہاں
لوگ کہتے ہیں مرے دل میں ترا سایہ ہے

عاصمہ ندیم ________ کے ڈی اے
زندگی تیری حقیقت کی حقیقت یہ ہے
تیری گفتار میں چھاؤں، ترے کردار میں دھوپ

اسماء کریم ________ جھنگ
ساقی اک صدا کے افسانے بن گئے
کچھ پھول ٹوٹ کر مرے پیمانے بن گئے
کائی جہاں تصور جاناں میں ایک شب
کہتے ہیں لوگ اس جگہ بت خانے بن گئے

!!!

مسکراتی کرنیں

روبینہ شریف

چاند کا ابا

چاند رات آئے تو سب دیکھیں ہلال عید کو
اک ہمارا نصیب ہڈیاں تڑوا گیا!
چھت پہ ہم تھے چاند کے نظارے میں کھوئے ہوئے
بس اچانک چاند کا ابا وہاں آ گیا

باب راجپوت......قصور

ظالم لوگ

ایک آدمی جھوٹ بولنے کی وجہ سے کافی مشہور تھا، ایک 80 سالہ عورت کو پتا چلا تو ڈرتے ہوئے اس آدمی سے بولی

"تم ہی دنیا میں سب سے بڑے جھوٹے آدمی ہو میں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں......"

"آدمی نے جواب دیا" لوگوں کی باتوں کو دفع کرو، اس عمر میں بھی یہ حسن، یہ جمال، یہ رعنائی، یہ دلکشی......"

بوڑھی عورت شرماتے ہوئے بولی۔ "اے اللہ! لوگ بھی کتنے ظالم ہیں، اچھے بھلے سچے انسان کو جھوٹا کہتے ہیں۔

حنا کرن......پتوکی

جواب طلبی

ایک شخص کا بڑا چرچا تھا کہ وہ روحوں سے بات کروا دیتا ہے۔ ایک بچہ بھی اپنی ذہانت اور ہوشیاری کی وجہ سے بہت مشہور تھا وہ اس شخص کے پاس پہنچا اور اس کو نذرانہ دینے کے بعد بولا میں اپنے دادا کی روح سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ شخص بچے کو ایک اندھیرے کمرے میں لے گیا جہاں اگر بتیاں جل رہی تھیں اتنے میں اسے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"کیوں آئے ہو برخودار! اس شخص نے بچے کی طرف دیکھ کر اسے اشارہ دیا اور کہا۔

"یہ تمہارے دادا کی روح بول رہی ہے۔

پوچھ لو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

بچے نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ دادا جان! مجھے صرف آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ آپ کی روح یہاں کیا کر رہی ہے جبکہ آپ کا تو ابھی انتقال ہی نہیں ہوا؟

انوش ابصار......قائداعظم یونیورسٹی

گارنٹی

ایک صاحب جوتوں کے بڑے اسٹور پر گئے اور چلانے لگے۔

"بڑی گارنٹیاں دیتے ہو جوتی نے دو دن بھی نہیں نکالے۔"

منیجر نے پوچھا "ہوا کیا ہے؟"

وہ صاحب بولے۔ "چوری ہو گئی ہے اور کیا!"

سونیا نظیر......فیصل آباد

غلط نمبر

ایک آدمی سوات گیا تو جاتے ہی اپنی بیگم کو ایس ایم ایس بھیجا، مگر غلط نمبر پر بھیج دیا، جس عورت کو ایس ایم ایس ملا اس کا شوہر دو دن پہلے ہی فوت ہوا تھا ایس ایم ایس پڑھتے ہی عورت بے ہوش ہو گئی۔ لکھا تھا کہ "میں خیریت سے پہنچ گیا، نیٹ

ورک بھی موجود ہے۔ جگہ چھوٹی ہے مگر شاندار ہے ٹھنڈی ہوائیں جنت کا مزا دیتی ہیں، دھول مٹی بالکل بھی نہیں ہے۔ میں نے جو سفید لباس پہنا تھا وہ ویسے کا ویسا ہی ہے۔ دو چار دن تک تم کو بھی بلا لوں گا۔''

نورالعین...... سرگودھا

کاش

بیوی! جانو! کاش آپ SMS ہوتے میں آپ کو Save کرتی، جب دل اداس ہوتا تو پڑھ لیتی۔

شوہر: ''جان! کاش تم Ring tone ہوتیں پہلے خوب بجاتا، جب اکتا جاتا تو دوسری بدل لیتا۔''

لاریب انعم...... لاڑکانہ

بلا معاوضہ

ایک روز باس وقت مقررہ سے پہلے دفتر آ گئے تو انہوں نے ایک کلرک کو ایک کونے میں لیڈی اسٹینو گرافر کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف پایا یہ دیکھ کر انہوں نے کلرک کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں اس کام کی تنخواہ دی جاتی ہے۔''

کلرک نے جواب میں مؤدبانہ عرض کیا۔

''نہیں جناب! یہ کام میں بلا معاوضہ انجام دیتا ہوں۔''

یاسمین نشاء...... جہلم

عادت

''ایک عورت ماہر نفسیات کے پاس گئی اور کہنے لگی۔''

''میں اپنے چھوٹے بیٹے کی وجہ سے بہت پریشان ہوں، وہ مٹی کے لڈو بنا بنا کر کھاتا رہتا ہے۔''

ماہر نفسیات نے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے وہ ذرا بڑا ہوگا تو خود ہی یہ عادت چھوٹ جائے گی۔''

اس عورت نے بے بسی سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! کوئی فوری علاج بتائیں ورنہ میرے بیٹے کی دونوں بیویاں رو رو کر پاگل ہو جائیں گی۔''

سعدیہ اقبال...... حیدرآباد

یاد ماضی

افضل کو ہمیشہ کی طرح خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر اس کے دوست نے پوچھا۔

''یار! یہ ہر وقت تم کن خیالوں میں کھوئے رہتے ہو؟ زندگی عیش و آرام سے گزارنا ہے تو ماضی کی یاد سے پیچھا چھڑا لو۔''

''کیسے چھڑاؤں؟'' اس نے اداس لہجے میں کہا۔

''ماضی کی وہ یاد تو اب گھر میں آ گئی ہے۔''

کنول شاہین قیصر...... تلہ گنگ

شکایت

ایک عورت نے ڈاک خانے فون کیا۔ ''آپ کا نیا ڈاکیا میرے کتے کو تنگ کر رہا ہے۔ اور اسے بھونکنے پر مجبور کر رہا ہے۔''

ڈاک خانے کے سپروائزر نے پوچھا ''محترمہ آپ کا کتا کہاں ہے۔''

''وہ باغ میں درخت کے نیچے کھڑا بھونک رہا ہے۔'' عورت نے جواب دیا

''اور ڈاکیا کہاں ہے۔''

''وہ درخت کے اوپر ہے۔'' ان محترمہ نے جواب دیا۔

فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران...... گجرات

==

PakiBooks.Site

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

دوستی

دوستی میں باتیں سننی پڑتی ہیں، اگر دوستی پر محنت نہ کی جائے تو اس کا گراف نیچے چلا جاتا ہے کوئی آپ کو اسے زبردستی نبھانے پر مجبور نہیں کر سکتا یہ خون کے تعلق سے بے نیاز ہوتی ہے صرف دل سے کی جاتی ہے اور وہی لوگ اپنے دوست کے دل سے نہیں اترتے جن میں دو چیزیں ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائی ہیں۔ بہت سا صبر اور خوش نصیبی ان دو چیزوں کی مدد سے ایک دوست دوسرے دوست کے دل میں آئی عداوت کو اچھی باتوں سے دور کر سکتا ہے یہ صبر انسان خود پیدا کرتا ہے اور بخت اسے اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔ آج کل کے بچے تو اپنے دوستوں کی تنقید تک نہیں سہہ سکتے، ایسے نازک لوگوں کو بخت نہیں لگا کرتے اس کے لیے برداشت سے دوستوں کی بری بھلی باتوں پہ منفی ردعمل دینے سے خود کو روکنا ہوتا ہے جو تحمل سے اپنے دوست کی خطاؤں کو معاف کرتا ہے اسے ہی اللہ بخت لگاتا ہے اور یہ خوش بختی اس کو مزید اچھی روشنیاں عطا کرتی ہے لوگوں کی فطرت سمجھ کر ان کو ڈیل کرو گے تو دل زیادہ نہیں دکھے گا۔

(نمرہ احمد...... حالم)

اقراء عزیز...... گاؤں دریا خان جلبانی

پتنگ بازی

ہم پتنگ بازی کو کھیل مانتے ہیں۔ کیونکہ بقول یوسفی ''جہاں کھیل میں دماغ پر زور پڑا، کھیل کھیل نہیں رہتا، کام بن جاتا ہے۔''

ہم نے ایک پتنگ باز سے پوچھا۔ ''یہ پیچ لڑانے کا کیا فائدہ؟''

کہا ''کلائی مضبوط ہوتی ہے۔''

پوچھا ''مضبوط کلائی کا فائدہ؟''

کہا ''پیچ لڑانے میں آسانی ہوتی ہے۔''

''یہ پیچ بھی سیاست کی طرح پر پیچ ہے۔''

امریکہ اور روس نے خلائی جہازوں کے ذریعے سے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کی، جبکہ ہم نے پتنگ بازی میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہر سال بذریعہ پتنگ کئی لوگ اللہ میاں تک پہنچ جاتے ہیں۔

(ڈاکٹر یونس بٹ)

کنول شاہین قیصر...... تلہ گنگ

توبہ

کوئی کتنا بھی گناہ گار کیوں نہ ہو اللہ اس کے لیے دعا کا راستہ کبھی بند نہیں کرتا وہ اپنے بندے کو نوازنے سے نہیں رکتا جو اللہ اپنے بجائے کسی دوسرے کو خدا بنا کر پوجنے والے پر بھی اپنی رحمتیں بند نہیں کرتا وہ اپنا نام لیوا کے لیے دعا اور توبہ کا راستہ کیسے بند کر سکتا ہے؟ اسی لیے اپنی چھوٹی بڑی غلطیوں پر اپنے رب سے توبہ کرتے رہو دعا کا ہاتھ نہ چھوڑو۔

(آمنہ ریاض...... ستارہ شام)

تبسم بشیر...... ڈنگہ

خود غرض رشتے

انسانوں کو ایک دوسرے سے کسی نہ کسی غرض نے باندھ رکھا ہے۔ غرض نہ ہو تو شاید ہر انسان اپنے محور میں زندگی گزارتا۔ شاید ہم جیسے گناہ گاروں نے خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی غرض اور طلب کا رشتہ باندھ رکھا ہے، یہ نہ ہو تو ہم شاید خدا کو بالکل بھلا ڈالیں۔

(عنیزہ سید...... دل من مسافر من)

افشاں سمیع...... کراچی

صائمہ سحر...... فیصل آباد

تبصرہ کرنے سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ پچھلی بار پہلی بار شرکت کرنے پر ہی آپ نے مجھے اپنی بزم میں جگہ دے دی۔ اب میں کرن میں لکھنے کے لیے آپ کی اجازت چاہوں گی۔ میں مختلف معاشرتی ٹاپک پر لکھنا چاہتی ہوں، اور مختلف ٹاپک میں سے ایک ٹاپک پر آج کل ایک افسانہ بھی لکھنا شروع کر رکھا ہے، مکمل کر کے آپ کو بھیج تو دوں مگر ایک بات سے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ یہ کہ......!

''اگر میں آپ کی امیدوں یا آپ کے معیار پر پورا نہ اتری تو......؟؟؟'' اب آتی ہوں تبصرہ کی طرف......!

حمد و نعت کے بعد ''برگد کا پیڑ'' پڑھا۔ ایمل رضا سے محمود ریاض کے بارے میں جانا تو سوچا اچھے انسان دنیا سے کتنی جلدی چلے جاتے ہیں، ہم جیسوں کو ابھی ان کی کتنی ضرورت تھی......؟ اداسی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فوزیہ فرخ کا ''نرم لہجہ مہربان آنکھیں'' پڑھ کر میری آنکھیں تو بے ساختہ نم ہو گئیں۔ آج کل ایسی ہستیاں کہاں ملتی ہیں......؟ کاش میں بھی ان کے دور میں ہوتی......!

''ماں جیسی چاہت کہاں'' سب کے ماں کے بارے میں احساسات، جذبات ایک جیسے ہی ہوتے ہیں پڑھ کے اچھا لگا۔ سنیتا مارشل سے بھی ملاقات اچھی رہی۔ مگر اپنی موسٹ فیورٹ ایکٹر ''ماہم عامر'' کو پڑھ کر خوشی سے سرشار ہو گئی۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں ثانیہ مشعل اشرف کو پڑھ کر مجھے بے ساختہ اپنا ایم اے انگلش یاد آ گیا۔ اچھے تھے سب جواب اس کے مگر کچھ ادھورے سے لگے......؟ اب بات ہو جائے افسانوں کی......!

سب سے پہلے بات کروں گی اس افسانے کی جس کی تعریف کے لیے میرے پاس لفظ نہیں وہ ہے میمونہ صدف، کا ''اماں چناں کا کلمہ'' واقعی کسی پر ظلم کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ مظلوم کی دعا کبھی رائگاں نہیں جاتی اور بددعا تو عرش تک فوراً پہنچ جاتی ہے۔ بہت اچھا تھا یہ افسانہ ''ابھی ڈور'' میں شمشیلا زاہد نے اچھا میسج دیا کہ ہمارے اندر کا اعتماد ہی ہمیں ایک مضبوط انسان بناتا ہے، مگر افسانے میں کچھ تشنگی سی تھی۔ کچھ کمی سی تھی......!!!

افسانہ آفتاب، کا افسانہ اپنے نام کی طرح ہی خوب صورت تھا۔ ''آتے ہیں جو کام دوسروں کے'' ''کر بھلا ہو بھلا'' کی عملی مثال تھا۔

''اے جذبۂ دل'' میں شمائلہ دلعباد نے حیران کر دیا۔ ایک چھوٹے سے بچے کا جذبہ، اس کی سچی لگن اور محنت نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا......؟ اٹس گریٹ۔ اس افسانے کی آخری بات تو دل میں اتر گئی۔ ''خواب ہوں گے تو تعبیر کی جدوجہد ہو گی'' واقعی......!

اب بات کروں گی ناولٹ کی......!

ناولٹ میں نور احمد کا ''دست شفا'' دل کو چھو گیا۔ مگر نہیں...... سید ھا دل میں اتر گیا۔ بلکہ دل کے تار ہلا گیا۔ کیا زبردست لکھا...... کیا لفظوں کی خوب صورتی تھی...... کیا معاشرے کی بلکہ اپنوں کی سنگ دلی تھی...... کیسا ملاپ تھا...... تعریف کے لیے لفظ کم پڑ گئے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے جہاں لب بار بار مسکرائے وہاں آگے جا کر دل رو دیا۔ محبت جیسے نفیس اور نازک ٹاپک پہ بہت خوب صورتی سے لکھا نور احمد نے۔ نور احمد ہی رہو۔ اور آخر میں ناول [illegible] چاہیے'' ہلکا پھلکا محبت پر مبنی یہ ناول بھی اچھا لگا۔ ارے جناب واقعی محبت ایسے ہی ہوتی ہے پتا ہی نہیں چلتا اور اس کا چھپانا تو ناممکن......! جو صدف عمر نے بہت خوب صورتی سے شروع سے اینڈ تک بیان کیا۔ اور آخر میں آخری افسانہ شمسہ الطاف کا ''یقین محکم'' پر بس اتنا کہوں گی اللہ ہم سب کو پورا سال، رمضان کی طرح گزارنے کی توفیق دے۔

ج: صائمہ سحر جی! کرن کی کہانیوں کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ صائمہ سحر آپ نے ابھی خود شمائلہ کی کہانی کا اقتباس تحریر کیا ہے ''خواب ہوں گے تو تعبیر کی جدوجہد ہو گی'' تو آپ خواب دیکھیں اور تعبیر بھی ان شاء اللہ اچھی ہو گی بشرط جدوجہد شامل ہو۔ کہانیاں لکھیں ان کے مسترد ہونے سے نہیں ڈریں۔ کہانی اگر پسند نہیں بھی کی گئی تو پھر لکھیں ایک دن آپ اچھا لکھنے کے قابل ہو جائیں گی۔ ویسے ابھی ہم نے آپ کی کہانی پڑھی نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ پہلی ہی کوشش آپ کی کامیاب ہو جائے۔

فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران آمنہ رئیس...... گجرات

مئی کا سرورق اے ون لگا۔ لائٹ میک اپ میں کجرارے نیناں اچھے لگ رہے تھے۔ ٹائٹل کا بیک گراؤنڈ بالکل ہی چھپ جاتا ہے۔ کیا صرف ماڈل کا چہرہ ہی دیکھنا مقصد ہوتا ہے۔

''برگد کا پیڑ'' ایمل رضا کی باتیں۔ پراثر تھیں۔ ایسے لوگ دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی دوسروں کے لیے مشعل راہ ہوتے ہیں۔ اللہ عظیم محمود ریاض کی مغفرت فرمائے۔ آمین

''ماں جیسی چاہت'' ماں کی محبت کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا ہے۔ کاش کہ ہم ان پیاری ہستیوں کی ان کی زندگی ہی میں قدر کر سکیں۔ ٹی وی میں اولڈ ہوم کی داستان دیکھ کر دل کرلانے لگتا ہے۔

سنیتا مارشل کی ملاقات بھی اچھی رہی۔ ''مقابل ہے آئینہ'' کھٹی میٹھی ثانیہ مشعل کی باتیں اچھی لگیں۔

[illegible] دیکھیے آپ کو [illegible] ماہ رمضان [illegible] ہو چکا ہے۔ آج چھٹا روزہ ہے اور مئی کا کرن بھی مجھے 17 تاریخ کو ملا تھا۔ بس پھر کیا صورت حال ہے۔ بڑی مشکلوں سے ٹائم نکال کر ایک دو تحریریں پڑھ سکی ہوں۔ سب سے پہلے تو ام طیفور کو پڑھا۔ افف رائٹر جی یہ کیا ظلم ڈھایا ہم بھوکے پیٹوں پر۔ قسم سے جیسے جیسے تحریر پڑھی ہے۔ آنسو۔ جاری اور حور کو کوئی اتنا بھی ظالم ہو سکتا ہے۔ کیا تھا اگر جگنو کی جان نہ جاتی۔ محبت میں تو وہ ویسے ہی فنا ہو چکی تھی۔ امیر حمزہ جیسے لوگ جو محبت میں دغا کرتے ہیں واجب القتل ہیں۔

برہان اور قانتہ کا کپل اچھا فیصلہ لگا۔ ایک لحاظ سے جگنو کی محبت امر ہو گئی۔

''غم ہے یا خوشی ہے تو'' تنزیلہ جی پچھلے ماہ کا ریکارڈ برابر رکھا ہے۔ کیا مزاحیہ شگوفے تھے۔ اے لو کر لو گل دو ماہ سے داستان حمزہ سن رہے ہیں اور رائٹر نے ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ زرمین کی ماما جانی۔ میڈم تہمینہ صاحبہ ہیں۔ ہمیں یہ انکشاف بریکنگ نیوز جیسا لگا۔ شاید التمش اور ماسٹر صاحب کے لیے بھی یہ زبردست نیوز ہو گئی۔ خیر اس ماہ کی داستان بھی دلچسپ رہی اگلی قسط کا شدت سے ویٹ شروع کیونکہ دونوں ریسلر میدان میں اترنے والے ہیں۔ محراب سے التمش کو اتنا زچ کروا دیں کہ بھول جائے یہ فقرہ ''التمش نام ہے میرا غرور بجتا ہے مجھ پر'' اور ہاں عید کے حوالے سے بھی کہانی میں مزاحیہ فقروں کا تڑکا لگاتا۔ چالیس ہزار کی رنگ کو میڈم جی چھلا کہہ رہی تھی۔ حد ہے بھئی۔

''درد آشنا'' وہی ٹیپیکل اسٹوری۔ خاص پسند نہیں آئی۔ ذونائشہ تو بڑی جذباتی لڑکی نکلی۔ اپنی تو جان گنوائی۔ اشعر کو بھی لے ڈوبی ویسے تحریر میں تمام نام یونیک اور منفرد تھے ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے چین کی کسی جدید ریسپی کے نام ہوں۔

''افسانے اے جذبۂ دل ابھی ڈور اور اماں چنا کا کلمہ'' پسند آیا۔ توبہ ہے لوگ کیسے دھڑلے سے جھوٹ بول لیتے ہیں۔ ایسے لوگ وقتی کامیابی تو حاصل کر لیتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں رب ایک کوئی جو

ہر پل کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ اور رتی کے برابر عمل کا بھی حساب کتاب لینے والا ہے پھر بھی پتا نہیں کیوں لوگ ایسا کر جاتے ہے۔

کرن کرن خوشبو۔ کلام بابا بلھے شاہ پسند آیا۔

''یادوں کے دریچے'' میں۔ رباب راجپوت نے دل جیت لیا۔ اور احمد فراز کی فیورٹ غزل پسند آئی۔

اور شاعری دو تین ماہ سے سب اچھی ہو رہی ہیں۔ ''مسکراتی کرنیں'' نشانی ٹاپ پر رہا۔

''نامے میرے نام'' میں سب نے اچھا لکھا۔ ثنا شہزاد اور فائزہ بھٹی اپنے منفرد اسٹائل سے چھائی رہیں قسم سے بہت لیٹ خط لکھ رہی ہوں اور وہ بھی ادھورا پلیز شامل ضرور کر لینا آپ سب کو ماہ رمضان مبارک اور عید سعید کی خوشیاں ایڈوانس میں مبارک۔

خربوزو تربوزو کا سیزن ہے۔ خوب رج کے کھائیں اور جان بنائیں۔ آپ اپنی دعاؤں میں مجھے بھی شامل رکھنا اور میں بھی رکھوں گی۔

ج: فوزیہ جی! آپ کا خط ہم ضرور شامل کرتے ہیں ''نامے میرے نام'' میں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خوشیوں کو آپ کا نصیب بنائے آمین۔ لگتا ہے آپ کو تربوز بہت پسند ہیں۔

تبسم بشیر حسین......ڈنگہ

اس دفعہ کرن کافی لیٹ ملا 20 کو شاید رمضان کی وجہ سے ٹائٹل گرل بہت کیوٹ لگ رہی تھی۔

''اداریہ'' سب کو رمضان اور عید مبارک ہو حمد و نعت سبحان اللہ انٹرویوز سارے اچھے تھے خاص کر مدر ڈے کے حوالے سے میری زندگی میں بھی ایک ہستی ہے جسے میں ماں کہتی ہوں وہ ہیں میری ٹیچر مس ثمینہ۔ اس کے بعد ''نامے میرے نام'' بہت بہت شکریہ مجھے تمام سلسلوں میں جگہ دینے کا

سلسلہ وار ناولز دونوں اچھے جا رہے ہیں اور اگلی اقساط کا انتظار بڑھتا جا رہا ہے مکمل ناولز میں ام طیفور کی دونوں اقساط ساتھ پڑھی لاجواب لو اسٹوری۔ ''اک نظر'' اور ''درد آشنا'' دونوں تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ ناولٹ میں ''دست شفا'' اسٹوری آف دی منتھ ویسے یہ کیا نئی رائٹر ہیں؟ افسانے سارے ایک سے بڑھ کر ایک تھے بلکہ اس دفعہ سارا کرن ہی شاندار تھا۔

تمام مستقل سلسلوں میں قارئین نے لاجواب انتخاب کیا۔ ایک سوال پوچھنا تھا کیا میں ''مقابل ہے آئینہ'' اور ''کچن اور آپ'' میں شرکت کر سکتی ہوں؟ اللہ حافظ جلدی جلدی لکھا ہے لیٹر پلیز شائع کر دیجیے گا۔

ج: تبسم جی! لگ رہا ہے کہ خط آپ نے بہت جلدی میں لکھا ہے لیکن ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خط لکھا۔ امید ہے آئندہ بھی لکھتی رہیں گی۔ ''کرن'' آپ قارئین کا ہی ہے اس کا جو بھی سلسلہ ہو تمام قاری بہنیں بصد شوق سے اس میں حصہ لے سکتی ہیں اس کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔



انوش ابصار......قائد اعظم یونی

سب سے پہلے رمضان کی مبارک قبول کیجیے رمضان اور پیپرز کی وجہ سے اس بار کرن بے چارا ادھ ادھورہ ہی پڑھا سوچا اس بار اگر تبصرہ پورے کرن پر نہ سہی مگر جو پڑھا اس پر تو کر دوں۔

سب سے پہلے سلسلے وار پڑھ لیے حالانکہ دونوں ہی بے جان سے ہیں۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ نے اب سمٹنا شروع کر دیا ہے رخ چوہدری ''شب نم کی سحر'' یہ ناول ایسا تاثر دے رہا ہے کہ کوئی ڈنڈا ہاتھ میں پکڑ کر کہہ رہا ہے ہنسو اور ہنسو ہم بھی مسکین شکل کے ساتھ ہنس پڑتے ہیں۔ ام طیفور کا ''من عاجزم'' ایک اچھی تحریر مگر ام طیفور نے اس کہانی میں کچھ زیادہ ہی لفظوں کے داؤ پیچ کھیلے ہیں جبکہ میمونہ صدف کا نام پڑھ کر صدف آصف کا خیال آیا وہ تو آسٹریلیا جا کر جیسے ہمیں بھول ہی گئیں بھئی ایک ناول ہی لکھ دو۔ شمائلہ دلعباد کا ''جذبہ دل'' بہت پسند آیا۔ نور دین کی کہانی آرزوؤں میں کچھ کرنے کی لگن ہو تو پھر محنت بھی رائگاں نہیں جاتی۔ مستقل سلسلے تو ہر صورت سب سے پہلے پڑھے جاتے ہیں۔ باقی ابھی پڑھنا ہے۔

ج: پیاری انوش! آپ نے امتحانات کے باوجود کرن پڑھا اور تبصرہ کیا۔ ہماری دعا ہے کہ آپ امتحانات میں شاندار کامیابی حاصل کریں آمین۔

انیلا......وہاڑی

اس ماہ کا کرن بھی میری پیاری سی ایڈیٹر کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ سب سے پہلے نگہت عبداللہ کا ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' پڑھا کہانی پہلے جتنی بے جان تھی اب جان پڑ گئی بلکہ اب تو انتظار کے موڑ پر لے آئی۔ رخ چوہدری کا حقیقت تو یہ ہے کچھ مزا نہیں دے رہا سستا مزاح۔ تنزیلہ آپی کا ناول ویسے سارے کرن کی جان اور شان۔ افسانے اچھے تھے خاص کر ''اماں چنا کا کلمہ'' بہت ٹاپ کا لگا شمائلہ دلعباد ایک بہترین اضافہ۔

ج: انیلا جی! جس طرح اب آپ کو نگہت عبداللہ کی کہانی کا انتظار ہوتا ہے ہمیں امید ہے کہ رخ چوہدری کی کہانی بھی جب آگے بڑھے گی تو آپ کو پسند آئے گی۔ ابھی تو کرداروں کا تعارف کروا رہی ہیں رخ جی۔

صائمہ مشتاق بھاگٹانوالہ......سرگودھا

ٹائٹل گرلز دوپٹے کے ساتھ پیاری لگ رہی تھی۔ اقبال آرزو کی حمد اور محشر بدایونی کی نعت بہت پسند آئی۔ ریاض صاحب کے بارے میں فوزیہ فرح کی محبت کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ ''ماں جیسی چاہت کہاں'' سب کے خیالات پڑھ کر اچھا لگا سنیا مارشل اور ماہم عامر سے ملاقات اچھی لگی۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں ثانیہ مشعل خود کو آئینے میں دکھاتی اچھی لگی۔ اب آئی ہو ناول کی جانب تو موسٹ فیورٹ نگہت عبداللہ کا ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' آخر خزینہ اور تیمور غزنی کی شادی ہو ہی گئی اب آگے دیکھتے ہیں کہ ان کے آگے راستے کیسے دشوار ہوتے ہیں۔ سمسہ الطاف کا افسانہ ''یقین محکم'' سبق آموز افسانہ تھا۔ رخ چوہدری کا مکمل ناول ''شب نم کی سحر'' دوسری قسط بھی زبردست رہی اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ باقی کرن ابھی نہیں پڑھا۔ ابھی صرف اتنا ہی تبصرہ کر رہی ہوں۔ میری طرف سے سب کو ماہ رمضان مبارک ہو اور پیاری اقراء ممتاز کو منگنی مبارک ہو۔

ج: پیاری صائمہ! آپ نے جلدی جلدی تبصرہ کیا ہے جو کہ ادھورا سا ہے امید ہے کہ آئندہ مکمل تبصرے کے ساتھ شریک ہوں گی۔ ''ماہنامہ کرن'' کی طرف سے بھی اقراء ممتاز کو منگنی کی مبارک ہو۔

اقراء ممتاز......سرگودھا

ہمیشہ کی طرح کرن کی ٹائٹل گرل نکھری

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
دستِ کوزہ گر
فوزیہ یاسمین
قیمت -/750 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

www.PakiBooks.Site

لگ رہی تھی۔ ''ماں جیسی چاہت کہاں'' میں سب کے جوابات لاجواب تھے۔ سنیتا مارشل سے ملاقات فنٹاسٹک رہی۔ کیوں کہ ان سے ملاقات پہلی دفعہ ہوئی ہے۔ ''میری بھی سنیئے'' میں ماہم عامر سے ملاقات سو سو رہی۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں ثانیہ مشعل اشرف نے میلا لوٹ لیا۔ ثانیہ نے بہت اچھا مقابلہ کیا سوالات کا۔ اسی طرح کے جواب ہونے چاہئیں کھٹے میٹھے ''کچن اور آپ'' میں نادیہ علی سے کیری کا مربہ اور اچار سیکھنے کو ملا۔ ''آپ کا پیغام اپنوں کے نام'' سب بہنوں نے کیا خوب رونق لگائی ہوئی تھی۔ مکمل ناول ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' اللہ اللہ کر کے تیمور غزنی اور خزینہ کی شادی خیر و عافیت سے ہوگئی اب دیکھیے سارہ کو پتا چلے گا تو سارہ کا ردعمل کیا ہوگا؟ خزینہ تھوڑا سا سنبھل کر رہنا۔ حسن شیرازی ایک نیک کام کر دینا ربیکا کو حمزہ اور شہرینہ کی زندگی سے دور لے جانا۔

''شب نم کی سحر'' دوسری قسط بس سو سو ہی تھی۔ کہانی میں علیم الدین اور حمیدہ خاتون کی نوک جھوک سے لطف آتا ہے ورنہ تو ظہیر احمد منہ میں کریلے لیے ہوتے ہیں منہ میں سے ایسے لفظ نکالتے ہیں

PakiBooks.Site

کہ اگلا بندہ پانچ منٹ چپ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اب دیکھیے ساجد ثمینہ سے شادی کرتا بھی ہے یا نہیں؟

''من عاجزم من کیم'' یہ اسٹوری بہت بہت اچھی تھی ام طیفور ونڈرفل آپ نے ''نمک پارے'' اور گلاب جامن جیسی کہانی سے ہٹ کر لکھی۔ اوزئے کے ساتھ بہت برا ہوا۔ اس کی موت کی خبر نے ہمیں بھی دکھی کر دیا۔ امیر حمزہ تم جیسا گھٹیا انسان کبھی نہیں دیکھا۔ ''غم ہے یا خوشی ہے تو'' تنزیلہ ریاض کی اسٹوری تنزیلہ ریاض جیسی اچھی ہے۔ التمش تمہارا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ افسانے سارے ہی زبردست تھے۔ رسالہ لیٹ ملا ہے اس لیے اس دفعہ بس اتنی ہی کہانیاں پڑھ سکی ہوں باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ سب کو میری طرف سے عید مبارک ہو۔

ج: پیاری اقرا! کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔

شکیلہ سہیل حسن ...... ملکوال

کرن ڈائجسٹ کے تمام ریڈرز اور رائٹرز اور اسٹاف کو سلام! آج تین سال کے بعد دل چاہا کے کرن ڈائجسٹ میں شرکت کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا جائے۔ زندگی کے ان گزرے سالوں میں کرن ہر پل ہر لمحہ میرے ساتھ رہا۔ ان تین سالوں میں کرن کو ایک سے بڑھ کر ایک پایا خاص کر مصباح علی سید کا ''مجبور نشیمن'' اور آسیہ مرزا صاحب کا ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' بہت لاجواب اور کبھی نہ بھولنے والے ناول تھے لفظوں کا اتنا خوب صورت اور جامع استعمال دل عش عش کر اٹھا، سو میری طرف سے دونوں رائٹرز کو اتنا شاندار ناول لکھنے پر ڈھیر ساری مبارک باد! اور اب اس ماہ کا ناول ! تو جناب ہمیشہ کی طرح یہ ناول بھی سپر ڈوپر ہٹ ہے۔ ام طیفور نے تو کمال کر دیا۔ تنزیلہ ریاض صاحبہ کیری آن التمش کی عقل جلد ٹھکانے لگا دیں! باقی سارے افسانے ناول بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھے اور باقی کے سلسلے بھی خوب تھے خاص کر مسکراتی کرنیں مزا دے گیا! باقی ان شاء اللہ اگلی بار، پلیز آپ سے ریکویسٹ ہے مجھے ہر سلسلے میں جگہ چاہیے اتنے عرصے بعد لکھا ہے اتنا تو حق ہے۔ اور فہد مصطفیٰ اقرار بھائی اور فیصل قریشی کے انٹرویوز شائع کریں! پلیز یہ انٹرویوز کی فرمائش میری چھوٹی سسٹر ثناء کی طرف سے ہے۔

ج: پیاری شکیلہ! آپ سے شکوہ ہے کہ آپ نے تین سال سے کرن میں شرکت کیوں نہیں کی۔ مگر خوشی اس بات کی ہے کہ کرن آپ کے مطالعے میں رہا آپ کرن کے ہر سلسلے میں شرکت کر سکتی ہیں۔ آپ کی بہن کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچائی جا رہی ہے۔

☆☆